بھٹو کا عدالتی قتل؟

عدالتی فیصلے کا مکمل متن و تجزیہ

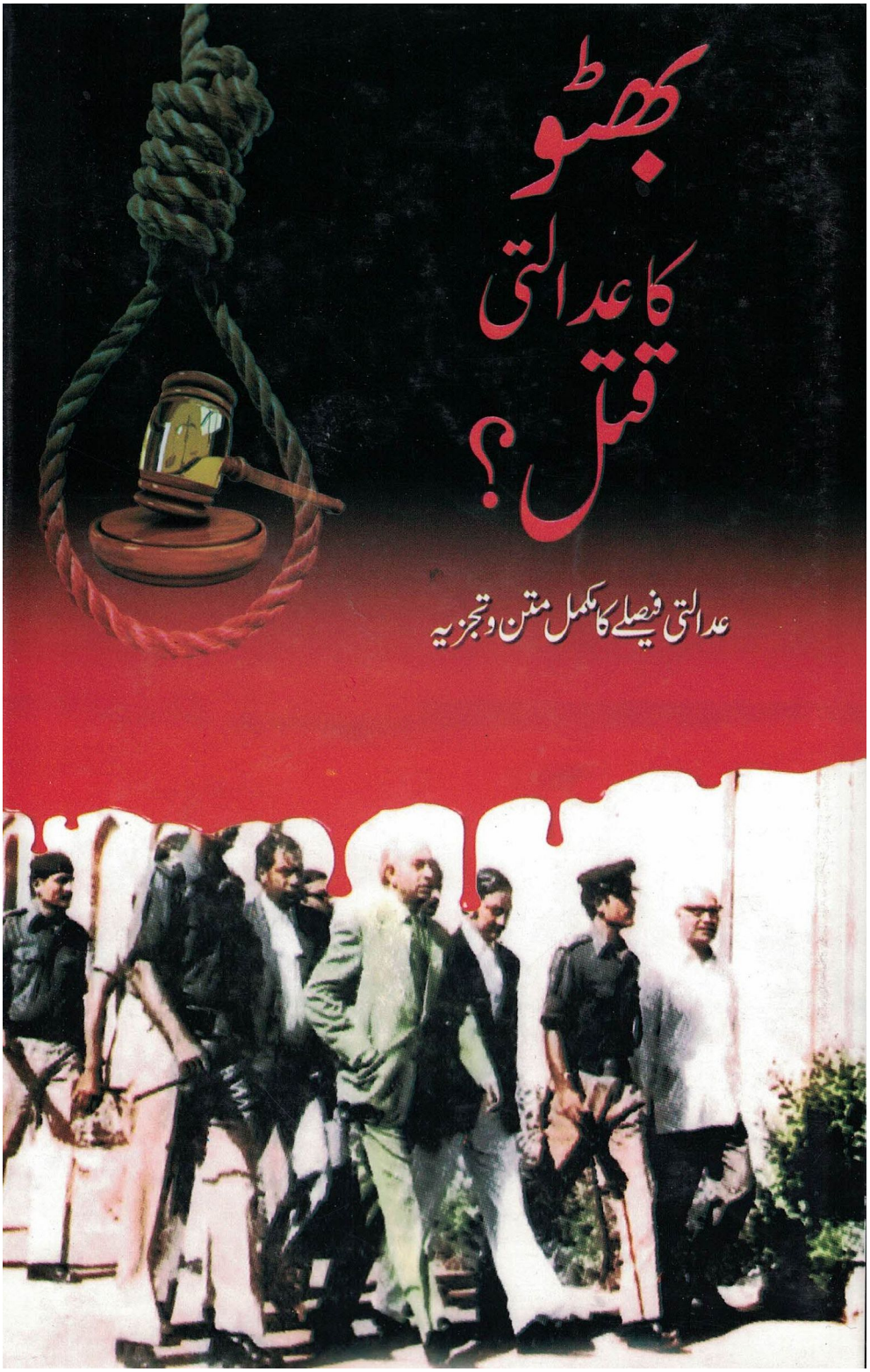

عدالتی فیصلے کا مکمل متن و تجزیہ

بھٹو کا عدالتی قتل؟

مجاہد لاہوری

احمد پبلی کیشنز لاہور
خورشید بلڈنگ 10 ایبٹ روڈ لاہور
فون: 042-36307828 فیکس: 042-36314383
ای میل: ghalibooks@yahoo.com

نظریہ پاکستان اکادمی
15-B کپورتھلہ ہاؤس، لیک روڈ پرانی انارکلی، لاہور
Cell: 0300-4416761, Tel: 042-37243618
e-mail: khizar.reader@gmail.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

اس کتاب سے مواد نقل کرتے ہوئے کتاب، مصنف
اور پبلشر کا حوالہ دینا آپ کا اخلاقی فرض ہے

نام کتاب	:	بھٹو کا عدالتی قتل؟
اشاعت اوّل	:	ستمبر 2008ء
اشاعت دوم	:	جولائی 2012ء
اہتمام اشاعت	:	معاذ حسن ہاشمی
ٹائٹل ڈیزائن	:	نیکس ایج گرافکس، لاہور
پرنٹر	:	محسن پرنٹرز
قیمت	:	-/300 روپے

انتساب!

بنیادی انسانی حقوق کے علمبردار
معزز قانون دان
جناب ایس ایم ظفر کے نام

www.bhutto.org

فہرست مندرجات

پیش گفتار 11

پہلا باب۔ بھٹو کیس کی غیر معمولی اہمیت کا سبب 15

دوسرا باب۔ بھٹو کی ملکی و ملی خدمات پر طائرانہ نظر 21

خاندانی پس منظر 21
بھٹو کا سوانحی خاکہ 22
بھٹو کا دور اقتدار 23
1- شملہ معاہدہ 24
2- 1973ء کا دستور 24
3- اسلامی سربراہی کانفرنس 24
4- مرزائیوں کو اقلیت قرار دینا 25
5- اسلامی اقدامات 25
6- فرانس کے ساتھ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ 25
7- روس کے ساتھ خوشگوار تعلقات 26
8- پاک چین دوستی کا معاہدہ 26
9- عالم اسلام کے اتحاد کے لئے مساعی 26
بعض سنگین غلطیاں 27
یحییٰ خان کی معاونت 27
ضیاء کی بطور کمانڈر انچیف تقرری 27
آخری دور کے بعض قابل ذکر واقعات 30

تیسرا باب۔ مقدمہ کیسے بنایا گیا؟ پس پردہ حقائق 33

مقدمہ کا پس منظر 33
مارشل لاء پینترا بدلتا ہے 36
بھٹو کی گرفتاری اور ضمانت پر رہائی 37
دوبارہ گرفتاری 37
مقدمہ کی مختصر روئداد 38
سازش کی کڑیاں کیسے ملائی گئیں اور گواہ کیسے بنائے گئے؟ 41
تحقیقات میں عبدالخالق کا کردار 42
راؤ عبدالرشید کا بیان حلفی 43
جام صادق علی اور کھر کے بیانات حلفی 44
جنرل چشتی کی گواہی 44
کرنل رفیع الدین کا انکشاف 45
ضیاء اپنے اصلی روپ میں 46
نیویارک ٹائمز کو انٹرویو 46
اردو ڈائجسٹ کو انٹرویو 46
کیہان انٹرنیشنل کو انٹرویو 46
چالان کی تکمیل اور کیس کی سماعت 46

چوتھا باب۔ ہائیکورٹ میں مقدمہ کی سماعت 49

مقدمہ کے بنیادی کوائف 49
ہائیکورٹ میں سماعت کے قابل ذکر واقعات 50
بھٹو کے ساتھ مولوی مشتاق کی مخاصمت کا اصل سبب 51
سماعت کا باقاعدہ آغاز 54
گواہان استغاثہ کی شہادتیں 55
عبدالحئی نیازی اور ماہر اسلحہ کی شہادت 60
میاں عباس کا اپنے بیان سے انحراف 60
بھٹو کی علالت اور عدالت میں حاضر ہونے سے معذوری 61

www.bhutto.org

17/ دسمبر کا ناخوشگوار واقعہ 62
عدالت عالیہ کی تجویز 63
عدالت کا فیصلہ 63
فیصلہ کا اعلان 65

پانچواں باب۔ عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کیوں؟

بائیکاٹ کے داخلی اسباب 68
انتقال مقدمہ کی درخواستیں 69
خصوصی کٹہرا کی تیاری 73
وکلائے صفائی کے ساتھ جج کا رویہ 73
بڑا ملزم 74
بھٹو کے خلاف مقدمہ درج کرنے کی ہدایت 74
برطانوی ماہر قانون کی شہادت 75
ایک اور قانون دان کی گواہی 75
بائیکاٹ کی خارجی وجوہات 76
بھٹو کی کردار کشی 76
بھٹو پر الزام تراشیاں 76
وفاداری اور اصول پرستی کی درخشاں مثال 80
رانا عبدالرشید
بھٹو کو شورش کاشمیری کا خراج عقیدت 82
جولائی 1977ء تا مارچ 1978ء کے
بعض اہم واقعات 83

چھٹا باب۔ کیا سماعت منصفانہ تھی؟ 85

1- شک کا فائدہ ملزم کی بجائے استغاثہ کو دیا گیا 85
2- ملزم اور جج کے درمیان اعتماد کا فقدان 86
3- جج اور وکلائے صفائی کے مابین عدم اعتماد 87
4- بنچ سے ججوں کا اخراج 87
5- بند کمرے میں سماعت 87
6- ملزم کی غیر حاضری میں سماعت 88
7- گواہوں کے بیانات میں
اضافے اور تضاد بیانیاں 88
8- بھٹو کے چال چلن پر بے جا نکتہ چینی 89
9- وعدہ معاف گواہوں کی شہادت پر انحصار 89
10- ہائیکورٹ کے فیصلہ پر بعض تبصرے 90
ا۔ ریمزے کلارک 90
ب۔ جان میتھوز کیوسی 91
ج۔ جان میلویل ولیمز 91
د۔ لندن ٹائمز کا رویہ 91
ہ۔ جرمن اخبار کی رائے 91
کچھ اور ناانصافیاں جو روا رکھی گئیں 92
1- مقدمہ کی براہ راست
ہائیکورٹ میں سماعت 92
2- اپیل کے لئے سات یوم کی مہلت 92
3- انتقال مقدمہ کی اجازت نہیں دی گئی 93
4- جیل میں بھٹو کے ساتھ امتیازی سلوک 93
سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کے نام تار 94
جیل سپرنٹنڈنٹ کے نام خط 94
5- صفائی نے کوئی گواہ پیش نہیں کیا 95
6- وکلائے صفائی کو بیانات کی نقول
فراہم نہیں کی گئیں 95
7- کسی دوسرے ممکنہ محرک کو
زیر غور نہیں لایا گیا 95

ساتواں باب۔ سپریم کورٹ میں اپیل

اپیلوں کے ابتدائی کوائف 97
انوار الحق اور بھٹو کے مابین اختلافات 99
وائٹ پیپرز اور ان کا جواب 102
جواب دعویٰ 102

www.bhutto.org

یحییٰ بختیار کے خلاف مقدمہ 104
ہائیکورٹ کے فیصلہ پر صفائی کی نکتہ چینی 105
بھٹو کی تین درخواستیں خارج کردی گئیں 106
مقدمہ سے سیاسی عوامل کا کوئی تعلق نہیں 107
صفائی کی طرف سے فیصلہ پر کئے گئے اعتراضات 107

آٹھواں باب۔ صفائی کی طرف سے شہادتوں کا تجزیہ و محاکمہ 111

استغاثہ کا کیس 123
صفائی کا حق جواب 127

نواں باب۔ بھٹو کی سپریم کورٹ میں حاضری اور آخری بیان 129

آخری بیان کے اہم اقتباسات
عدالت کا شکریہ 130
پاکستان کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے 130
اپنی حالت زار کا تذکرہ 130
میں نام کا مسلمان نہیں ہوں 132
میں نے اداروں کی تعمیر کی ہے 133
نصرت بھٹو کیس کے فیصلے پر تبصرہ 133
ہائیکورٹ کے فیصلہ پر تنقید 134
مسعود محمود کے بارے میں 135
وائٹ پیپرز 136
کھلے مقدمے کی روایات 137
بند کمرے میں سماعت اور بحران 137
میری غیر حاضری میں سماعت جاری رکھی گئی 138
خفیہ سماعت کے مضمرات 138
ججوں کی باری 139
مقدمہ کا ریکارڈ 139
مسعود جھوٹ بولتا ہے 140
کٹہرے کی تیاری 140
امتیازی سلوک کیوں 141
عدالت مارشل لاء کی محافظ نہ بنے 141
کیا یہ آخری سرپلار اگ تھا؟ 142

دسواں باب۔ اپیل سے متعلق متفرق امور 143

شریک ملزمان کی حاضری اور بیانات 143
اپیل کی سماعت کے دوران پیش آمدہ واقعات 144
1- بنچ سے دو ججوں کی علیحدگی 144
2- ضیاء کا منصب صدارت پر فائز ہونا 146
3- اپیل کے بارے میں اخذ کردہ نتائج 147
اپیل کا فیصلہ 153
سزائیں بحال رکھی گئیں 153
اپیلیں خارج کردی گئیں 153

گیارھواں باب۔ بری کرنے والے ججوں کے فیصلے 155

1- جسٹس دراب پٹیل 155
2- جسٹس محمد حلیم 166
3- جسٹس جی صفدر شاہ 169

بارھواں باب۔ نظر ثانی کی درخواست 185

درخواست پر دلائل 185
غلام علی میمن کی وفات 188
درخواست کا فیصلہ 190

تیرھواں باب۔ سپریم کورٹ کے

www.bhutto.org

فیصلہ پر تنقیدی نظر 193

1- منقسم فیصلہ 193
2- طویل اور بوجھل فیصلہ 193
3- چیف جسٹس پر عدم اعتماد 194
جی صفدر شاہ کی شہادت 196
4- بنچ سے دو ججوں کی علیحدگی 196
5- بھٹو کی جائز شکایات پر بھی توجہ نہ دی گئی 197
6- ہائیکورٹ کے فیصلہ میں موجود
خامیوں سے صرف نظر 197
7- مقدمہ سراسر سیاسی تھا 198

فیصلہ کے بارے میں چند تبصرے 198

(I) موسیو اشینی جاؤل 199
(II) لارڈ ٹریور روپر 199
(III) ریمزے کلارک 199
(Iv) جسٹس فخرالدین جی ابراہیم 199
(v) مفتی اعظم دیوبند 200
(vi) جسٹس دراب پٹیل 200
(vii) جسٹس راجہ رتنم 201
(viii) صبغت اللہ قادری 201

چودھواں باب۔ جاں بخشی کی
درخواستیں اور رحم کی اپیلیں 203

درخواستوں کا تانتا بندھ گیا 203
ایران کی دھمکی 204
صدر فضل الٰہی کا خط 205
پیرزادہ کی ضیاء سے ملاقات 205
رحم کی اپیلوں پر ضیاء کا ردعمل 205
سوتیلی بہن کی طرف سے رحم کی اپیل 206

پندرھواں باب۔ سزا پر عملدرآمد 207

بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کی آخری ملاقات 208
نصرت بھٹو کی ضیاء سے ملاقات کی خواہش 208
دوسرے رشتہ داروں کی ملاقات نہیں کرائی گئی 208
بھٹو کو پھانسی کی اطلاع 209
جیل میں آخری بھوک ہڑتال 209
آخری گفتگو 209
آخری وصیت لکھ کر جلا ڈالی 210
آخری غسل 210
تجہیز و تکفین 211

سولھواں باب۔ پھانسی دینا
ناگزیر کیوں ہو گیا 213

محسن کشی کی بدترین مثال 213
پھانسی کے اسباب 214
سپریم کورٹ میں اپیل کی منظوری
کے باوجود بھٹو کو رہائی نہ ملتی 215
اے کاش! 215
پھندا ایک تھا اور گردنیں دو 215
بھٹو کی فاش غلطیاں 216
قانونی نکات 217
سیاسی محاذ پر 218
پیرزادہ کا تجزیہ 219
راؤ عبدالرشید کی رائے 219
بھٹو کا اصلی جرم 220
بھٹو زندہ رہے گا 221
کتابیات 222

www.bhutto.org

تعارف مصنف

مجاہد لاہوری گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ انہوں نے اردو، اسلامیات اور سیاسیات میں ایم اے کے ساتھ ساتھ ایل ایل بی جیسے اعلیٰ تعلیمی مدارج اس حال میں طے کیے کہ ایک طرف ازدواجی گھریلو زندگی کی گرانباریاں ان کے گلے کا ہار تھیں تو دوسری طرف پرائیویٹ اور سرکاری ملازمت کی ذمہ داریاں کندھوں پر سوار تھیں۔ ان کے شاندار تعلیمی پس منظر میں روشن طبع اور اچھی قوت حافظہ جیسی خداداد صلاحیتوں کے علاوہ ان کی محنت شاقہ کا بھی بڑا دخل ہے۔ اکتساب علم کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور گوناگوں مصروفیات کے جلو میں ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ کی تیاری کا کام بھی جاری ہے۔

مجاہد لاہوری دنیائے صحافت کا ایک معروف نام ہے وہ ایک ماہر و تجربہ کار مترجم ہیں اور گزشتہ 35 برسوں سے ادب و صحافت کی خدمت کر رہے ہیں۔ پہلے صحافی کے طور پر مختلف اخبارات و جرائد میں کام کیا پھر ترجمہ کے کوچہ میں قدم رکھا اور دو درجن سے زائد تاریخ و سیاست کی کتابوں، عدالتی فیصلوں اور آئینی دستاویزات کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔ اپنے فطری شوق، وسیع مطالعہ، تیز حافظہ اور طویل تجربہ کے بل پر انہوں نے اتنی صلاحیت بہم پہنچالی ہے کہ قانون جیسے خشک مضمون کی کتابوں کو بڑی روانی کے ساتھ سلیس و عام فہم مگر بامحاورہ اور شگفتہ اردو کا جامہ پہنا سکیں۔ ان کی ترجمہ کردہ کتابوں اور دستاویزات میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

1 ذوالفقار علی بھٹو کی If I am Assassinated (اگر مجھے قتل کیا گیا۔)

2 سٹینلے والپرٹ کی Jinnah of Pakistan (جناح آف پاکستان)

3 میجر جنرل تجمل حسین ملک کی The story of My struggle (میری جدوجہد کی داستان)

آجکل وہ تحقیق و تصنیف کے میدان میں سرگرم عمل ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی اولین تحقیقی کاوش ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری تصنیف ''عدلیہ کی آزمائش'' ادارہ جنگ پبلشرز سے شائع ہو چکی ہے۔ وہ 1973ء میں وفاقی حکومت کے ماتحت اسلامی نظریاتی کونسل سے وابستہ ہو گئے۔ 27 سال کی ملازمت کے بعد اگست 2000ء میں ریٹائر ہوئے۔ وہ اردو صحافت کی کئی اہم شخصیات مثلاً الطاف حسن قریشی، آغا شورش کاشمیری (مرحوم) مجید نظامی، مجیب الرحمٰن شامی، ضیاء شاہد اور مظفر محمد علی کے ساتھ کام کر چکے ہیں اور ان کے ساتھ اب بھی نیازمندی کا رشتہ رکھتے ہیں۔

پبلشرز

www.bhutto.org

طور پر طویل ہے اس لئے وکلاء برادری کے بھی بہت تھوڑے ارکان نے اسے پڑھا۔ عام لوگوں کیلئے قانون کو سمجھنا ویسے ہی بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے بہت کم لوگ اس سے استفادہ کر سکے۔ البتہ فیصلہ کی اہمیت اور لوگوں کی اس میں دلچسپی حیران کن تھی کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کے ایک سابق وزیراعظم پر مقدمہ چلایا گیا اور اسے انتہائی سزا دی گئی۔ فیصلہ کے بارے میں بہت جلد ایسی باتیں کہی جانے لگیں جو عام طور سے عدالتی فیصلوں کے متعلق نہیں کہی جاتیں۔ اخلاقی لحاظ سے بھی یہ بات بڑی معیوب ہے کہ آپ ایک ایسے معاملہ پر رائے زنی کریں جس کے حقائق و کوائف سے آپ کو پوری واقفیت نہ ہو۔ بہرحال بھٹو کیس کے ساتھ یہی ہوا کہ لوگوں نے مکمل معلومات حاصل اور حقائق معلوم کئے بغیر اس پر بحث شروع کر دی۔

یہ صورت حال دیکھ کر ناچیز نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کا اُردو میں ترجمہ شروع کر دیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ڈیڑھ سال کی محنتِ شاقہ کے بعد متن کے 1495 صفحات کو قومی زبان کا روپ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ لاہور کے ایک پبلشر نے فیصلہ کے ایک حصہ کو "خون کا بدلہ خون" کے عنوان سے شائع کر دیا۔ پورے فیصلہ کو دوبارہ پڑھا خصوصاً اختلافات کرنے والے تین ججوں کے فیصلوں کا پورے انہماک اور توجہ سے مطالعہ کیا تو یہ شک یقین میں بدلنے لگا کہ ہائی کورٹ میں مقدمہ کی سماعت کے دوران واقعی ایسی ناانصافیاں روا رکھی گئیں جو انصاف کے مسلمہ اصولوں کے خلاف تھیں۔ ملزم کا شروع سے بیچ پر عدم اعتماد، ملزم کی غیر حاضری میں اور بند کمرے میں سماعت اور ملزم کی طرف سے ناچار کارروائی کا بائیکاٹ ایسے روشن اور بیّن شواہد تھے جو بتاتے تھے کہ مقدمہ کی سماعت انصاف کے اصولوں کے مطابق نہیں ہوئی۔

اگست 88ء میں جنرل ضیاء الحق بہاولپور کے پُراسرار فضائی حادثہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے تو مارشل لاء کے نفاذ کے پس منظر، اس کے تسلسل کے اسباب اور گیارہ سالہ دور آمریت کے واقعات کے حوالہ سے بہت سی کتابیں منظرعام پر آئیں۔ مولانا کوثر نیازی نے "اور لائن کٹ گئی" میں انکشاف کیا کہ.....

"جسٹس مشتاق حسین بھٹو کے خلاف تعصب رکھتے تھے کیونکہ لاہور ہائی کورٹ کا سینیئر ترین جج ہونے کے باوجود بھٹو دور میں انہیں دو دفعہ نظرانداز کیا گیا۔ ان کے جونیئروں کو ان پر سبقت دے دی گئی۔ نہ انہیں چیف جسٹس بنایا گیا نہ سپریم کورٹ کا جج۔ بھٹو نے یہ سب کچھ اپنے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کے مشورہ پر کیا۔ مارشل لاء گورنمنٹ نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ 5 جولائی 77ء کو مارشل لاء لگا اور 12 جولائی کو جسٹس مشتاق حسین کو ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا۔ اس کے محض تین دن بعد یعنی 15 جولائی سے انہیں چیف الیکشن کمشنر کا منصب بھی سونپ دیا۔

1989ء میں "آپریشن فیئر پلے" کے مرد آہن اور ضیاء کے اولین دست راست لیفٹننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فیض علی چشتی کی کتاب "Betrayals of Another Kind." مارکیٹ میں آئی جس میں بھٹو کیس

www.bhutto.org

کے حوالہ سے بتایا گیا کہ.....

"نواب محمد احمد خان کے مقدمۂ قتل میں ماخوذ چاروں شریک ملزمان کو اعلیٰ ترین اتھارٹی کی طرف سے جان بخشی کی ضمانت دے کر بھٹو کے خلاف گواہی دینے پر تیار کیا گیا تھا۔ ضیاء الحق انہیں پھانسی دینے کے حق میں نہیں تھے لیکن یحییٰ بختیار کے اس بیان نے کہ "اچھا ہے شریک ملزمان زندہ رہیں تاکہ ضیاء کے بعد آنے والی حکومت ان سے حقائق معلوم کر سکے" انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اس مدعا کو باقی نہ رہنے دیں چنانچہ بھٹو کے چار ماہ بعد جب ان چاروں کو بھی تختہ دار پر کھینچ دیا گیا تو ان کے ورثاء نے بڑا شور مچایا کہ اُن کے ساتھ وعدہ خلافی کی گئی ہے تاہم حکومت نے اُن کے شور و غوغا کو پریس میں نمایاں نہیں ہونے دیا"

اس کے بعد دسمبر 91ء میں سنٹرل جیل راولپنڈی کے سپیشل سیکورٹی سپرنٹنڈنٹ کرنل رفیع الدین (جو 16 مئی 78ء سے 4 اپریل 79ء تک بھٹو کی ذاتی نگرانی پر مامور رہ چکے تھے) کی کتاب "بھٹو کے آخری 323 دن" منظر عام پر آئی۔ جس میں منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی لکھا ہے کہ "مارشل لاء حکام نے بھٹو کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اگر سپریم کورٹ انہیں بری بھی کر دیتی تب بھی انہیں آزاد نہ کیا جاتا۔ کسی فوجی ٹریبونل سے کسی اور مقدمہ میں سزائے موت دلا کر انہیں گولی مروا دی جاتی"

(دیکھئے مذکورہ بالا کتاب کا صفحہ 89)

اس سے پہلے جام صادق علی اور غلام مصطفیٰ کھر کے ایسے انٹرویو ریکارڈ پر آ چکے تھے کہ جرنیلوں نے جولائی 77ء میں ہی بھٹو کو ختم کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ نواب محمد احمد خان کے کیس کو تو محض بہانہ بنایا گیا۔ بصورت دیگر بھی انہیں زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔

اتنی ساری دستاویزی شہادتوں اور فیصلہ کی بابت بہت سارے معاصر قانون دانوں کے تبصرے اور آرا کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ دال میں واقعی کچھ کالا ہے۔ فیصلہ کے سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ استغاثہ متعدد معاملات میں شکوک و شبہات سے بالاتر اپنا کیس ثابت نہیں کر سکا۔ اس کے باوجود شک کا فائدہ ملزم کو نہیں دیا گیا۔ غالب گمان، احتمال اور مفروضوں پر یقین کر کے عدالت نے استغاثہ کی کہانی کو درست تسلیم کر لیا۔ ان تمام چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے اور موضوع سے متعلق بہت سی نئی نئی کتابوں کے مطالعہ و استفادہ کے بعد راقم الحروف نے اس کیس پر تنقیدی نظر ڈالنے اور اس کا بے لاگ تجزیہ و محاکمہ کرنے کی ٹھان لی اور ڈیڑھ سال کی مسلسل محنت و تحقیق کے بعد زیر نظر کتاب مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کتاب کا بنیادی مقصد آسان اور عام فہم زبان میں قارئین کو بھٹو کیس کے کوائف و حقائق سے آگاہ کرنا اور فیصلہ میں موجود بعض خامیوں کی نشاندہی کرنا ہے۔ عدلیہ ہمارے ملک کا وقیع ترین ادارہ ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی اہانت کے بارے میں سوچنا بھی سوءِ ادب میں شامل ہے۔ ہمارا مدعا و منشا صرف اور صرف اصلاح ہے۔ ظاہر ہے خامیوں کی نشان دہی کی جائیگی تو اصلاح کی نوبت آئیگی..... ہم اپنے مقصد

www.bhutto.org

میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔ یہ اندازہ لگانا قارئین کا کام ہے کیونکہ کسی کتاب کی کامیابی یا ناکامی کے متعلق فیصلہ کرنے کے وہی بہتر مجاز و مستحق ہیں۔

مجاہد لاہوری
اسلام آباد
۲۲ر اگست ۱۹۹۲ء

www.bhutto.org

پہلا باب

بھٹو کیس کی غیر معمولی اہمیت کا سبب

لاہور ہائی کورٹ نے احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد خان کے قتل کی بابت ذوالفقار علی بھٹو اور دیگر چار ملزمان کے خلاف 18 مارچ 1978ء کو جو فیصلہ صادر کیا اُس پر نہ صرف اندرون ملک بلکہ دنیا بھر میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ کیس کی سماعت قانون و انصاف کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق نہیں کی گئی اور فیصلہ اس اصول پر پورا نہیں اُترتا کہ "جو انصاف کیا جائے وہ نظر بھی آنا چاہئے کہ واقعی انصاف کیا گیا ہے۔"

بھٹو کا مقدمہ اس صدی کا انتہائی قابل ذکر اور مشہور مقدمہ ہے۔ جو انہی کے دور حکومت میں انہی کی پارٹی کے ایک سابق رہنماء نے درج کرایا مگر اُن کے دور اقتدار میں اسے نمٹایا نہیں گیا۔ ایف آئی آر کو سربمہر کر کے رکھ دیا گیا۔ یہاں تک کہ دن بدلے، حکومت بدلی۔ 5 جولائی 1977ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا۔ فوجی حکومت نے اپنا آپ منوایا تو بھٹو صاحب کے خلاف مقدمۂ قتل کے مدعی بھی حرکت میں آئے وہ عدالت کے دروازے تک پہنچے۔ سوال عدالت کے دروازے تک..... اور اسے اِس طرح کھنگھٹایا کہ اس نے پوری دنیا کو چونکا دیا۔

جناب بھٹو کے وکلاء نے ہائی کورٹ میں دلائل کے دریا بہا دیئے، کئی مہینے لگا دیئے۔ کارروائی طویل سے طویل تر ہوئی۔ لاہور ہائی کورٹ نے جناب بھٹو کو مجرم قرار دے کر پھانسی کا سزاوار ٹھہرایا۔ مجرم کی طرف سے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی وہاں ایک بار پھر طُول طویل دلائل کا سلسلہ دراز ہوا۔ سپریم کورٹ کا فُل بنچ جو سات ججوں پر مشتمل تھا۔ فیصلہ کی بابت اختلافِ رائے کا شکار ہو گیا۔ چار ججوں نے

www.bhutto.org

لاہور ہائی کورٹ کے فیصلہ کو برقرار رکھا۔ تین ججوں نے اس سے اختلاف کیا تاہم اکثریت کے فیصلہ نے اُن کی زندگی کے خاتمہ کو انصاف کا تقاضا ٹھہرایا۔

فیصلہ اگرچہ سپریم کورٹ نے صادر کیا مقدمہ عام عدالت میں چلا تھا لیکن ملک پر تو مارشل لاء کے سائے محیط تھے۔ مارشل لاء کے ضابطے کسی دلیل 'اپیل یا وکیل کی بات سننے کے روادار نہیں ہوتے۔ فیصلہ کو عملی جامہ بھی اُس چیف مارشل نے پہنایا جو اسے بدلنے پر قادر تھا۔ موت کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر سکتا تھا۔ جس کی بابت سپریم کورٹ کے بنچ نے رہنمائی کی تھی اور سزائے موت کے فیصلہ سے خود اس کی کابینہ اور سپریم ملٹری کمان کونسل نے اختلاف کیا تھا مگر وہ اپنے فیصلہ پر ڈٹا رہا۔ 4 اپریل 79ء کی رات کو دو بجے راولپنڈی جیل میں بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی گئی۔ ان وجوہات کی بناء پر اُس فیصلہ کے بارے میں وہ کچھ کہا جاتا رہا اور اب بھی کہا جا رہا ہے۔ کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں جن میں ایسی آرا کا اظہار کیا جا رہا ہے جو اعلیٰ عدالتوں کے صادر کردہ فیصلوں کے بارے میں عام طور پر نہ تو ظاہر کی جاتی ہیں نہ ہی سُنی جاتی ہیں۔

نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کی عدالتی تاریخ کے اس انتہائی طویل اور اہم مقدمہ پر گفتگو تو بہت ہوتی ہے لیکن اس کے نکات اور دلائل سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ مقدمہ کے حقائق اور عدالت عالیہ کے اخذ کردہ نتائج کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ جب تک اصل حقائق اور بنیادی نکات کو نہ جان لیا جائے یہ بات انسان کے حق میں نہیں جاتی کہ کوئی تو بھٹو کو مجرم ٹھہرائے اور کوئی بے گناہ قرار دے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہاں تک کہتے ہیں کہ بھٹو خواہ مجرم تھے یا نہیں۔ انہیں پھانسی نہیں دی جانی چاہئے تھی۔ یہ ان کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ اس کتاب کا مقصد زیر نظر مقدمہ کی اہمیت اور اس کے بنیادی نکات و حقائق کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ قارئین کو اس سلسلے میں اعانت فراہم کرنا ہے کہ وہ بے شمار ذہنوں میں کلبلانے والے اس سوال کا جواب دے سکیں آیا بھٹو واقعی مجرم ثابت ہوئے تھے؟ دوسرے یہ کہ کیا مقدمہ کی سماعت منصفانہ ہوئی تھی؟ کیا وہ ہر قسم کے بغض و عناد اور کینہ و تعصب سے پاک تھی؟

زیر بحث مقدمہ کا شکار ایک ایسی شخصیت بنی جس کا شمار تیسری دنیا کے عظیم رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ جو اپنے قد کاٹھ کے لحاظ سے انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو' چین کے رہنماء ماؤزے تنگ' مصر کے جمال عبدالناصر اور بھارت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ بھٹو کی ذات سے کسی کو ہزار اختلافات ہوں یہ سچائی اپنی جگہ ہے کہ ایک وہ تاریخ ساز اور عہد آفریں شخصیت تھے۔ وہ پاکستان کی تاریخ کا ایک بہت بڑا نام اور ناقابل فراموش کردار ہیں۔ پاکستان کی سیاست کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے ان کی شخصیت ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہے گی بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین حقیقت ہو گا کہ وہ پاکستانی تاریخ کے سب سے منفرد' صاحب اسلوب اور مدبر سیاست دان تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ' انتہائی وسیع المطالعہ اور وقت کے نبض شناس۔ انہوں نے اپنی زندگی میں انتہائی عروج پایا۔ 30 سال کی عمر میں وفاقی وزارت

www.bhutto.org

کاقلمدان سنبھالنے والے وہ پہلے پاکستانی تھے۔ پھر وہ وزیر خارجہ بنے۔ دنیا سے اپنی خطابت وذہانت کالوہا منوایا۔ 45 برس کی عمر میں انہوں نے اقتدار کی انتہائی منزل کو پالیا۔ پہلے وہ پاکستان کے صدر بنے اور آخر میں وزیراعظم کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیئے۔ قدرت نے انہیں غیر معمولی صلاحیتوں ' بے مثال اہلیتوں، بینظیر خوبیوں ' پختہ عزم واستقلال اور اعلیٰ درجہ کی ذکاوت وفطانت سے نوازا تھا۔ ان کے سیاسی مخالفین بھی ان کے تدبّر ' غیر معمولی صلاحیت ' مثالی جرات ' عظیم قوت ارادی ' بےپناہ قوت متخیلہ اور استعداد وقابلیت کے معترف تھے۔ وہ ایک متحرک اور فعال سیاست دان ' عوام کے ہردل عزیز رہنما ' محبوب قائد اور بلند پایہ مقرر ودانشور اور " دی گریٹ ٹریجڈی " " متھ آف انڈی پینڈنس " اور " ایف آئی ایم پاسا سینیٹڈ ؟ " جیسی کتابوں کے مصنف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام ترخامیوں اور بشری کمزوریوں کے باوجود عوام کی بھاری اکثریت آج بھی اُن کا بےحد احترام کرتی ہے۔

بھٹو کوئی عام آدمی نہیں تھے کہ اُن کے ساتھ ہونے والی صریح ناانصافی کو نظرانداز کر دیا جاتا نہ صرف وہ ملک کے صدر اور وزیراعظم جیسے بلند مرتبت عہدوں پر کام کر چکے تھے۔ بلکہ عالمی تاریخ کا ایک فعال اور سنسنی خیز کردار بن کر اپنی شناخت کرا چکے تھے۔ اُن کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھنے کے باوجود انہوں نے معاشرہ کے پسے ہوئے غریب عوام میں اپنے حقوق کا شعور اور احساس پیدا کیا۔ اس بے زبان انبوہ کو زبان دی۔ وہ ہاتھ جو پہلے جاگیرداروں ' وڈیروں اور سرمایہ داروں کے جوتے صاف کرتے تھے انہیں اُن کے گریبانوں تک پہنچا دیا۔ بھٹو کی شخصیت کا جادو محروم طبقوں کی مادی اور ٹھوس ضرورتوں کی کوکھ سے ابھرا تھا بھٹو اس واسطے محترم ٹھہرے کہ انہوں نے غریب کو مزدور کو کسان کو روٹی کپڑے اور مکان دینے کا مژدہ سنایا۔ وہ اس لئے محبوب ٹھہرے کہ انہوں نے سرمایہ داروں کی صنعتیں قومی تحویل میں لے لیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور کارکنوں کو تحفظ فراہم کیا۔ ان کو بہتر شرائط ملازمت اور سہولتیں دیں۔ بے زمین کسانوں اور مزارعوں کو پانچ پانچ مرلے زمین دی۔ کچی آبادیوں کے مکینوں کو حقوق ملکیت دیئے۔ 1970ء کے عام انتخابات نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ عوامی اور جمہوری انقلاب...... یہ بات ہماری تاریخ میں سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے کہ اس انقلاب میں بھٹو کی بنائی ہوئی سیاسی جماعت ' پاکستان پیپلز پارٹی نے پہلی بار سیاست کو محلوں سے نکال کر جھونپڑیوں تک پہنچا دیا۔ عوام کو ایک نئی منتخب قیادت ملی جو خود ان کے اندر سے ابھر کر آئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ پاکستان کے آٹھ کروڑ عوام کی اُمیدوں ' امنگوں اور تمناؤں کا مرکز بن گئے۔ وہ عوام کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ خطیبانہ زیر و بم سے خوب آگاہ تھے۔ جب بولتے تو عوام کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور اُن کی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑنے لگتا۔ اُن کی زبان میں جادو تھا۔ اُن کی شخصیت میں سحر تھا وہ عوام سے سچی اور پُرخلوص محبت کرتے تھے۔ اس لئے جب رات کی تاریکی میں ان کے اقتدار پر شب خون مارا گیا انہیں وزارت عظمیٰ کے منصب سے معزول کر کے حراست میں لیا گیا۔ ایک بے جان اور ناجائز مقدمہ کی آڑ لیکر حوالۂ زنداں کیا گیا اور ایک منقسم و متنازعہ فیصلہ کی بنیاد پر تختہ دار پر کھینچا گیا تو

مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں اور مزارعوں کی خاموش اکثریت اپنے محسن، اپنے محبوب اور اپنے محترم قائد کا یہ انجام دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اُن کی آنکھیں پرنم تھیں۔ اُن کے دل زخمی تھے۔ فوجی حکومت کے جبر و استبداد نے ان کیلئے کھل کر صدائے احتجاج بلند کرنا ناممکن بنا دیا تھا۔ ان کے دلوں سے اس کے حق میں پر خلوص دعائیں نکلیں۔ بھٹو بلاشبہ ان عظیم لوگوں میں سے تھے جو مر کر بھی دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ آج بھی بے شمار دلوں میں ان کی یاد زندہ ہے اور انشا اللہ زندہ رہے گی۔

بھٹو کوئی عالم یا مذہبی قائد نہیں تھے وہ ایک جدید اور معتدل مزاج انسان تھے۔ جو پاکستان کو ایک ماڈرن فلاحی مملکت بنانے کے خواہاں تھے۔ وہ اپنے ملک کو مشرقی یا مغربی کسی بلاک کا تابع مہمل نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ اسے آزاد و خود مختار اور ترقی یافتہ ایسا اسلامی جمہوریہ بنانا چاہتے تھے جو وقار اور خود اعتمادی کے ساتھ مشرق و مغرب کے ٹکراؤ کا سامنا کر سکے وہ پاکستان پر مغرب کے طرز حیات اور کلچر کو مسلط کرنے کے حق میں بھی نہیں تھے۔ افسوس ہے کہ انہیں اپنے عزائم کی تکمیل کیلئے مطلوبہ مدت میسر نہیں آئی۔ فوج نے بلاجواز اور بے وقت ان کے اقتدار کی بساط لپیٹ دی اور انہیں پھانسی دے کر ان کی زندگی کا چراغ گُل کر دیا۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا کہ بھٹو پاکستان کے دوسرے وزیر اعظم تھے جو غیر طبعی موت سے دوچار ہوئے۔ ملک کے پہلے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان جنہیں بجا طور پر قائدِ ملت اور بانیٔ پاکستان کا دستِ راست سمجھا جاتا تھا 16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بنے جبکہ ذوالفقار علی بھٹو کو 4 اپریل 1979ء کو راولپنڈی جیل میں رات کے دو بجے تختہ دار پر چڑھایا گیا۔ لیاقت علی خان کو دن دیہاڑے کھلے میدان میں شہید کیا گیا اور مسٹر بھٹو کو رات کی تاریکی میں جیل کی چار دیواری کے اندر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں ان دونوں شخصیتوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ دونوں ملکی سیاست میں انتہائی نمایاں اور فعال و متحرک تھے۔ دونوں کی موت پر پُراسرار پردے پڑے ہوئے ہیں۔ لوگ پہلے 28 برس تک لیاقت علی خان کی شہادت کے اسباب اور قاتلوں کے نام جاننے کیلئے بے چین و مضطرب رہے۔ اب تیرہ سال سے پھانسی کی کوٹھڑی سے تختہ دار تک بھٹو کا سفر عوام کی جبینوں پر شکنیں ڈالے ہوتے ہے اور پھانسی کا المیہ اپنے دامن میں لاتعداد افسانے لئے ہوئے ہے۔

پہلا شخص جو دن کی روشنی میں سید اکبر کی گولیوں کا نشانہ بنا وہ بابائے قوم کا صحیح جانشین اور قوم کی قیادت کا بجا طور پر اہل تھا۔ قوم نے اسے قائدِ ملت اور شہیدِ ملت کے خطابات دیئے۔ دوسرا شخص جسے رات کے گہرے اندھیروں میں ظلم و تشدد کا نشانہ بنا کر ہلاک کیا گیا۔ وہ اس قوم کا قائدِ عوام تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ پاکستان کے یہ دونوں ہر دل عزیز رہنما راولپنڈی میں غیر طبعی موت کا شکار ہوئے۔ دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن پاکستان کی تاریخ پر گہرے نقوش ثبت کر گئے۔

بھٹو جیسے عظیم رہنما کا اچانک زوال اور دردناک انجام صرف پاکستانی عوام کیلئے موجبِ تشویش و اضطراب نہیں بنا بلکہ پوری دنیا میں اس واقعہ پر گہرے رنج و الم کا اظہار کیا گیا۔ انہیں بڑے عجیب اور پُراسرار طریقہ

www.bhutto.org

سے شکار کیا گیا۔ کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان پر جو مقدمہ چلا وہ سیاسی عوامل سے پاک تھا۔ بھٹو کے دشمن اور مخالفین پس پردہ ان امکانات کا جائزہ لینے میں مصروف تھے کہ انہیں کسی طرح ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے۔ وہ انہیں اپنے راستہ کا سب سے بڑا پتھر سمجھتے تھے۔ جسے راستہ سے ہٹانا لازمی تھا۔ عدالتوں میں ختم نہ ہونے والی کارروائی تو اس آپریشن کی تکمیل کا محض ایک ذریعہ تھا جس کا سہارا لیا گیا۔

پاکستان میں ہی نہیں بلکہ عدلیہ کی عالمی تاریخ میں بھٹو کا مقدمہ ایک منفرد اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس انوکھے اور حیران کن مقدمہ کے بارے میں شروع سے ہی طرح طرح کے اندیشوں اور شکوک و شبہات نے جنم لینا شروع کر دیا تھا جو بعد ازاں ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک اس مقدمہ کی سماعت اور اپیل تک گہرے ہوتے گئے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران مجموعی طور پر ایسا رویہ اختیار کیا گیا جس کی بابت بلا جھجک اور بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ انصاف کے ان تقاضوں کو پورا نہیں کیا گیا جن سے یہ ثابت ہوتا کہ ملزم کے ساتھ انصاف کیا گیا تھا۔

ہر فوجداری مقدمہ سے ملزم اور مجرم کے حلقۂ احباب کا متاثر ہونا فطری بات ہوتی ہے۔ جس کیس میں بھٹو جیسا عالمی شہرت یافتہ رہنماء ماخوذ ہو تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے متاثر ہونے والوں کا دائرہ کتنا وسیع اور بین الاقوامی ہو گا۔ اس مقدمہ میں صرف بھٹو کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگایا گیا تھا بلکہ عدلیہ کا وقار اور انصاف کے تقاضے بھی داؤ پر لگ گئے تھے۔ بھٹو کیس کے طویل فیصلہ کو پڑھ کر ہر قاری کے ذہن میں کئی طرح کے سوالات ابھرتے ہیں کہ کیا عدلیہ بحران کا شکار ہو گئی تھی؟ کیا مقدمہ کی سماعت قانونی تقاضوں کے مطابق منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوئی تھی؟ کیا ججوں کے دل بغض و عناد سے خالی تھے؟ کیا مجرم کو شک کا فائدہ دیا گیا؟ چار اور تین کی نسبت سے صادر شدہ فیصلہ، جس پر عمل کیا گیا، اُس کی قانونی حیثیت کیا تھی؟ یہ کتاب اسی نوعیت کے زیادہ سے زیادہ سوالوں کا جواب دینے کی ایک کوشش ہے۔

بھٹو اپنی بے پناہ خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود ایک انسان تھے۔ بلاشبہ اختیار و اقتدار کے اعلیٰ مراتب پر اُن سے بہت سی غلطیاں اور لغزشیں سرزد ہوئیں لیکن 4 اپریل 1979ء کی اندھیری رات میں انہوں نے عوام کے ایک عظیم ہیرو کی حیثیت سے کمال جرأت و استقامت سے پھانسی کے پھندے کو گلے لگا کر وقت کے آمر و جابر کے سامنے گردن جھکانے سے انکار کر کے اپنے تمام گناہوں اور خطاؤں کی تلافی کر دی۔ ایک دلیر، جرّی اور بے باک قائد کے طور پر ملک و قوم کیلئے جان کا نذرانہ پیش کر کے وہ اس صداقت کی زندہ جاوید شہادت بن گئے کہ۔

جفا کے سامنے گردن وفا شعاروں کی
کٹی ہے بر سرِ میداں مگر جھکی تو نہیں

www.bhutto.org

www.bhutto.org

دوسرا باب

بھٹو کی ملکی و ملی خدمات پر طائرانہ نظر

جلال الدین اکبر یا بہادر شاہ ظفر

ہر بڑی شخصیت کی طرح جناب بھٹو کے متعلق بھی لوگوں کے خیالات و آرا میں ایک عظیم تضاد اور تفاوت پایا جاتا ہے۔ ان کے مداحوں کی بھی کمی نہیں اور ان کے ناقدین بھی بے شمار ہیں۔ مداح ان کی خامیوں کو خاطر میں نہیں لاتے' ان کی فروگذاشتوں کا تذکرہ سننے کو تیار نہیں تو ناقدین ان کی کسی خوبی کو تسلیم کرنے سے یوں انکاری ہیں کہ ان کے خیال میں بھٹو صاحب کی ذات سے ملک و قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ان کے متعلق بہت لکھا اور کہا جا چکا ہے لیکن تاریخ کا فیصلہ ابھی باقی ہے' عین ممکن ہے جب مخالفت و مخاصمت کے ہنگامے سرد ہو جائیں۔ محبت و عقیدت کے جذبات میں اعتدال اور ٹھہراؤ آ جائے تو ان کی شخصیت کے ساتھ انصاف ہو سکے۔ اور یہ طے کیا جا سکے کہ وہ پاکستان کی تاریخ میں مغلِ اعظم جلال الدین اکبر کا درجہ رکھتے ہیں یا ناکامی و نامرادی کے پیکر بہادر شاہ ظفر کی سطح پر رکھے جانے کے قابل ہیں۔

جناب بھٹو کی ملک و قوم کیلئے خدمات اور ان کے شاندار کارناموں کا تذکرہ کرنے سے پہلے اُن کے خاندانی پس منظر کو سمجھنا اور اُن کے سوانحی خاکہ پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

خاندانی پس منظر

بھٹو سندھ کے ایک جاگیردار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے خاندان کا شمار سندھ کے قدیم خاندانوں میں ہوتا ہے۔ بھٹو قبیلہ ریاست جیسلمیر (راجستھان) اور دوسری روایت کے مطابق ضلع حصار کے راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔ جو صدیوں قبل مشرف بہ اسلام ہوا اور راجپوتانہ سے نقل مکانی کر

www.bhutto.org

کے 16ویں صدی عیسوی میں سندھ میں آبسا بھٹو کے پردادا اللہ بخش نے اپنے حسن تدبر اور فہم وفراست سے سرکار دربار میں اثر ورسوخ پیدا کیا اور ایک خاصی بڑی جاگیر کے مالک ٹھہرے۔ ان کا شمار ضلع لاڑکانہ کے معززین میں ہوتا تھا۔

بھٹو کے والد سرشاہنواز بھٹو 1919ء میں وائسرائے کونسل کے رُکن نامزد ہوئے۔ 1920ء میں فرسٹرکٹ بورڈ (لاڑکانہ) کے بلا مقابلہ چیئرمین منتخب ہوئے۔ انہوں نے ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1930ء میں لندن میں ہونے والی پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ صوبہ سندھ کو بمبئی سے الگ کرانے اور مسلمانوں کو اُن کے حقوق دلانے کیلئے زبردست جدوجُہد کی۔ 1935ء میں انہیں گورنر سندھ کا مشیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ 1937ء کے صوبائی انتخابات میں حصہ لیا لیکن ناکام رہے۔ اس کے بعد انہیں سندھ پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین بنادیا گیا۔ اپریل 1946ء میں نواب جونا گڑھ کے دیوان (وزیراعظم) بنے۔ اکتوبر 1947ء میں نواب نے ان کے مشورہ سے ریاست جونا گڑھ کا الحاق پاکستان کے ساتھ کر لیا۔ بھارت نے اس اقدام کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ریاست پر جبری قبضہ کر لیا تو شاہ نواز بھٹو نومبر 47ء میں پاکستان آ گئے۔ اس کے 10 سال بعد یعنی نومبر 57ء میں سندھ کا یہ ممتاز سیاست دان اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ بھٹو کی والدہ خورشید بیگم شاہنواز کی دوسری بیوی تھیں۔

بھٹو کا سوانحی خاکہ

5 جنوری 1928ء..... گڑھی خدا بخش (نوڈیرو) میں ولادت۔

1941ء..... 13 برس کی عمر میں شیریں امیر بیگم کے ساتھ پہلی شادی جو عمر میں ان سے دس سال بڑی تھیں۔

1947ء..... گاؤں کی مسجد سے ابتدا کر کے کراچی کے بشپ ہائی سکول پونا کے کانونٹ اسکول اور آخر میں بمبئی کے کیتھڈرل اسکول میں پڑھتے ہوئے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔

جنوری 49ء..... کیلی فورنیا کی برکلے یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس (انٹرنیشنل لاء) میں گریجوایشن کی۔

1950ء..... کرائسٹ چرچ آکسفورڈ سے اصولِ قانون میں ایم اے آنرز کیا۔ نصرت بھٹو کے ساتھ دوسری شادی۔

1953ء..... "لنکنز ان" (لندن) سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔

نومبر 53ء..... پاکستان واپسی..... بار کونسل کی رکنیت

1955ء..... چودھری محمد علی اور سہروردی کی سفارش پر اقوام متحدہ میں جانے والے وفد میں شرکت کی۔

www.bhutto.org

58-1954ء..... کراچی ہائی کورٹ میں پریکٹس۔
ستمبر57ء..... دوبارہ اقوام متحدہ میں اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے "امنِ عالم اور جارحیت" کے موضوع پر تقریر کی۔
اکتوبر58..... فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے جمہوری نظام کی بساط لپیٹ دی۔ ملک میں پہلے مارشل لاء کا نفاذ' صدر ایوب خان کی کابینہ میں 30 برس کی عُمر میں سب سے کم عُمر وزیر کی حیثیت سے شرکت۔ پہلے انہیں تجارت اور آبپاشی کا وزیر بنایا گیا' پھر صنعت و حرفت اور قدرتی وسائل کی وزارت کا قلمدان ملا۔ کچھ عرصہ اطلاعات و نشریات کے وزیر رہے۔ جنوری 63ء میں وزارت خارجہ جیسی اہم وزارت ملی۔
1965ء کی سترہ روزہ پاک بھارت جنگ کے دوران پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریریں کر کے لوگوں کے دلوں کو گرمایا۔
17جون66ء..... وزارت سے استعفیٰ۔
30نومبر67ء..... پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے نئی جماعت کی تشکیل۔
69-1968..... ایوب خان کے خلاف احتجاجی مہم کی قیادت۔ قید و بند کے مراحل "قائدِ عوام" کی حیثیت سے بے پناہ مقبولیت۔
25مارچ69ء..... صدر ایوب خان مستعفی ہو گئے۔ یحییٰ خان نے ملک میں دوسرا مارشل لاء نافذ کر کے عنانِ اقتدار سنبھال لی۔
یکم جنوری70ء..... ون یونٹ کا خاتمہ' چاروں صوبوں کی بحالی۔
دسمبر70ء..... پاکستان میں ملک گیر سطح پر پہلے عام انتخابات ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی پارٹی عوامی لیگ نے اور مغربی بازو میں بھٹو کی پیپلز پارٹی نے غیر معمولی اور خلاف توقع کامیابی حاصل کی۔
مارچ 71ء..... یحییٰ خان کا مجیب کو انتقال اقتدار سے انکار۔ 25 مارچ سے صوبے میں فوجی آپریشن کا آغاز۔
20نومبر71ء..... بھارت کے ساتھ مشرقی محاذ پر جنگ کا آغاز۔
16دسمبر71ء..... بھارت کے ساتھ دوسری جنگ میں مشرقی محاذ پر شکست۔ مشرقی پاکستان کا سقوط۔ بنگلہ دیش کا ظہور۔
20دسمبر71ء..... یحییٰ خان کو بزورِ شمشیر اقتدار سے الگ کیا گیا۔ بھٹو صاحب نے باقی ماندہ پاکستان کے صدر اور سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا منصب سنبھالا۔

بھٹو کا دورِ اقتدار (دسمبر71ء تا جولائی77ء)

20دسمبر71ء کو یحییٰ خان کی علیحدگی کے بعد بھٹو نے مغربی پاکستان کے اکثریتی لیڈر کی حیثیت

سے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی چونکہ قانونی لحاظ سے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا جانشین ایک مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہی بن سکتا تھا اس لئے بھٹو کو سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اقتدار سنبھالنا پڑا۔ اپنے ساڑھے پانچ سالہ دور میں انہوں نے جو اہم قومی و ملکی خدمات انجام دیں ان کا اجمالی تذکرہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

1۔ شملہ معاہدہ

سقوط ڈھاکہ کے نتیجہ میں پاکستان کے 93 ہزار جنگی قیدی اور مغربی پاکستان کا پانچ ہزار مربع میل رقبہ بھارت کے قبضہ میں تھا۔ طویل مذاکرات کے بعد 2 جولائی 72ء کو بھٹو اور اندرا گاندھی کے مابین سمجھوتہ طے پایا جسے شملہ معاہدہ کہتے ہیں۔ اس معاہدہ کی بدولت پاکستان کے جنگی قیدیوں کی رہائی عمل میں آئی اور کھویا ہوا رقبہ بھی واپس مل گیا۔ اس معاہدہ کو جناب بھٹو کے حسن تدبر اور فہم و فراست کا عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

2۔ 1973ء کا دستور

بھٹو صاحب نے جس وقت حکومت کی باگ ڈور سنبھالی پاکستان سرزمینِ بے آئین کی حیثیت رکھتا تھا۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اولین ترجیح دی اور ایک دستور ساز کمیٹی قائم کی۔ جس میں حزب اقتدار کے ساتھ حزب اختلاف کی جماعتوں کو بھی نمائندگی دی گئی۔ یوں اپریل 1973ء میں چاروں صوبوں اور تمام جماعتوں کے اتفاق رائے سے نئے آئین کی منظوری دی گئی۔ جو 14 اگست 73ء سے نافذ ہوا۔ اس دستور کی رُو سے پہلی بار اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ مذکورہ تاریخ سے بھٹو نے صدارت کا منصب چھوڑ کر وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھال لیا۔ یہ دستور آج بھی ملک کی مقدس ترین دستاویز ہے۔ اگرچہ مارشل لاء نے اس کا حلیہ مسخ کر دیا ہے۔

3۔ اسلامی سربراہی کانفرنس

بھٹو کے دور کا ایک اور کارنامہ فروری 74ء میں لاہور کے مقام پر دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس کا انعقاد ہے۔ جس میں 47 سربراہان مملکت و حکومت نے شرکت کی۔ خادم حرمین شاہ فیصل کی تجویز پر بھٹو کو اس کانفرنس کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ عالم اسلام کے اتحاد و یکجہتی میں اس کانفرنس نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ تہران کی خواہش تھی کہ وہ کانفرنس ایران میں ہو جبکہ قاہرہ کا اصرار تھا کہ یہ سعادت مصر کے حصہ میں آئے۔ لیکن شاہ فیصل اپنی تجویز پر ڈٹے رہے کہ یہ اعزاز پاکستان کو حاصل ہونا چاہئے۔

www.bhutto.org

4۔ مرزائیوں کو غیر مُسلم اقلیت قرار دینا

بھٹو کی اسلام دوستی کا ایک اور ثبوت ختم نبوت کے 90 سالہ پرانے مسئلہ کو حل کرنا اور مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا ہے۔ یہ تاریخ ساز فیصلہ 7 ستمبر 1974ء کو ایک آئینی ترمیم کی منظوری کے ذریعے کیا گیا۔ ملک کے دینی و مذہبی حلقوں میں اس اقدام کو زبردست سراہا گیا اور بھٹو کو سچا عاشقِ رسول ﷺ قرار دیا گیا۔

5۔ اسلامی اقدامات

مرزائیوں کے متعلق تاریخی فیصلہ کے علاوہ بھٹو کے دور میں حسبِ ذیل اسلامی اقدامات بھی بروئے کار لائے گئے۔

1..... ریڈ کریسنٹ کا نام بدل کر ہلالِ احمر رکھا گیا۔

2..... اتوار کی بجائے جمعہ کو سرکاری تعطیل کا دن قرار دیا گیا۔ جس پر یکم جولائی 1977ء سے عملدر آمد شروع ہوا۔

3..... 17 اپریل 1977ء کو ایک آرڈیننس کے ذریعے

ا..... شراب پر پابندی لگادی گئی اور بھٹو نے خود بھی شراب نوشی چھوڑ دی۔ نائٹ کلب بند کر دیئے گئے۔

ب..... گھوڑ دوڑ اور جوئے کو خلاف اسلام قرار دے کر اس کی ممانعت کر دی گئی۔

6۔ فرانس کے ساتھ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ

مارچ 1976ء میں بھٹو نے فرانس کے ساتھ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کا معاہدہ کیا وہ پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی زبردست خواہش رکھتے تھے۔ جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تو بھٹو نے کہا تھا۔ "ہم گھاس کھا کر گذارہ کر لیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے"۔ بھٹو ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ عالمِ اسلام کو ایٹمی صلاحیت ضرور حاصل کرنی چاہئے۔ کمیونسٹ، عیسائی، یہودی اور ہندو سب نے ایٹم بم بنالیا ہے تو دنیائے اسلام کو بھی ان کے برابر آنا چاہئے۔ دنیائے اسلام کا یہ بم دراصل اسرائیل کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ جسے امریکہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ 10 اگست 1976ء کو یہودی نژاد امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے دورہ لاہور کے موقع پر بھٹو کو ایٹمی پلانٹ کے حصول سے باز رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا "اگر تم ایٹمی پلانٹ کے ارادہ سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں عبرت ناک مثال بنادیں گے" ان کے اپنے الفاظ یوں تھے "We will make a horibble example of you."

اس واضح دھمکی کے باوجود بھٹو اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ امریکہ کی رکاوٹوں کے باعث بھٹو دور میں تو فرانس نے وہ سودا منسوخ کر دیا لیکن 1989ء میں بے نظیر کے دور میں صدر متراں اپنے دورۂ پاکستان

www.bhutto.org

کے موقع پر اس کی بحالی کا اعلان کر گئے یوں بالآخر پاکستان نے ایٹمی پلانٹ حاصل کر لیا۔

7۔ روس کے ساتھ خوشگوار تعلقات

پاکستان کا جھکاؤ شروع سے امریکہ کی طرف رہا۔ روس کے ساتھ اس کے مراسم واجبی سے تھے۔ جب لیاقت علی خان نے ماسکو کا دورہ منسوخ کر کے واشنگٹن کی راہ اختیار کر لی تو رُوسی اور زیادہ ناراض ہو گئے۔ بھٹو نے ایندھن اور قدرتی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے 1961ء میں روس کا دورہ کیا تو ایوب خان اور بیوروکریسی کی مخالفت کے باوجود روس کے ساتھ پاکستان میں تیل کی تلاش کا معاہدہ کیا۔ تیل کی مہم روسیوں کے سپرد کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے سٹیل مل لگانے کا ٹھیکہ بھی روس کو دے دیا۔ یہ مل بعد ازاں بھٹو کے اپنے دورِ حکومت میں مکمل ہوئی اور اس نے فولاد سازی کی بنیادی صنعت میں اہم رول ادا کیا۔ تیل کی تلاش کے نتائج 1973ء میں نکلے جب بھٹو نے بحیثیت وزیراعظم پاکستان میں نکلے ہوئے تیل کی بوتل قومی اسمبلی کے اجلاس میں مولانا مفتی محمود کو لا کر سونگھائی تھی۔

8۔ پاک چین دوستی کا معاہدہ

بھٹو پہلے شخص تھے جنہوں نے ایوب خان کو اپنے عظیم ہمسایہ چین کے ساتھ دوستی کی راہ پر ڈالا۔ اور 1963ء میں وزارتِ خارجہ کا قلمدان سنبھالنے کے صرف دو ماہ بعد چین کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر کے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ 1965ء کی جنگ کے دوران اس دُور اندیشی کے نتائج ظاہر ہوئے گو روس، امریکہ اور یورپ کو اس بات پر بڑا غصہ آیا تاہم چین کے ساتھ پاکستان کی دوستی ہر آڑے وقت میں مثالی ثابت ہوئی۔

9۔ عالم اسلام کے اتحاد کیلئے مساعی

یوں تو مشرقِ اوسط خصوصاً عربوں کے ساتھ پاکستان نے ابتداء ہی سے اچھے روابط قائم کر لئے تھے جس کی زندہ مثالیں معاہدہ بغداد اور بعد ازاں سینٹو میں اس کی شمولیت کی شکل میں موجود تھیں لیکن بھٹو نے نہ صرف ان روابط کو مضبوط کیا بلکہ پورے عالم اسلام کو ایک کڑی میں پرونے کیلئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انہوں نے پاکستان کو برصغیر کے حصار سے نکال کر ایک طرف روس، چین، انڈونیشیا اور ملائیشیا کے ساتھ دوستی کے رشتے استوار کئے۔ دوسری طرف عرب دنیا سے برادرانہ تعلقات کو فروغ دیا۔ فروری 1974ء میں لاہور میں ہونیوالی دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس اس سلسلے میں سنگ میل ثابت ہوئی جب 47 اسلامی ملکوں کے سربراہان مملکت و حکومت نے اکٹھے تاریخی بادشاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی اور اکٹھے بیٹھ کر اپنے اجتماعی مسائل پر غور کیا۔ خادم حرمین اور پاسبان کعبہ فروضہ نبوی ﷺ جلالۃ الملک شاہ فیصل کی تجویز پر بھٹو کو اس کانفرنس کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ قاہرہ اور تہران بھی اس کانفرنس کو

اپنے ملک میں کرانے کے خواہاں تھے مگر شاہ فیصل نے اس اعزاز سے پاکستان کو سرفراز ہونے کا موقع دیا۔ بھٹو نے مصر کے جمال عبدالناصر' لیبیا کے محمد معمر القذافی' شام کے حافظ الاسد' فلسطینی رہنما یاسر عرفات اور انڈونیشیا کے سربراہ سوئیکارنو کے ساتھ ذاتی مراسم مضبوط کئے اور عالم اسلام کے اتحاد کو عملی شکل دی۔

10 سابق والیان ریاست کو سرکاری خزانہ سے جو وظیفہ ملتا تھا وہ بند کر دیا۔

بعض سنگین غلطیاں

بلاشبہ بھٹو زبردست فہم و فراست کے مالک اور ایک مدبر و دانشور سیاست دان تھے لیکن ان کی ذات بشری کمزوریوں سے پاک نہ تھی۔ اپنے دورِ عروج میں اُن سے جو فاش غلطیاں سرزد ہوئیں اُن میں سے درج ذیل قابل ذکر ہیں۔

1۔ یحییٰ خان کی معاونت و رفاقت

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ 1970ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ قومی اسمبلی کی اکثریتی پارٹی کے طور پر سامنے آئی تھی اور آئین و قانون کی رو سے اقتدار کا مستحق شیخ مجیب الرحمٰن تھا۔ لیکن یحییٰ خان اور اس کی فوجی جنتا کسی قیمت پر اقتدار چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ یحییٰ خان سمیت کئی جرنیلوں کے ساتھ بھٹو کے گہرے تعلقات تھے۔ اس لئے جرنیلی ٹولہ نے انتقالِ اقتدار کی راہ میں جو رکاوٹیں کھڑی کیں اور مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے میں جو کردار ادا کیا گو بنیادی طور پر اس کے ذمہ دار وہ خود تھے لیکن اس مسئلہ میں بھٹو کا کردار بھی افسوس ناک رہا۔ ایک محبِ وطن اور عالمی سطح کے زیرک سیاست دان ہوتے ہوئے ان کا فرض تھا کہ غلط روی سے مجیب کو بھی روکتے اور یحییٰ کا ہاتھ بھی پکڑتے۔ وہ اُس وقت اس پوزیشن میں تھے لیکن بھٹو کے حامیوں کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی دونوں بڑی طاقتوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھی جس پر بڑے عرصہ سے کام ہو رہا تھا۔ بھٹو چاہتے بھی تو اس کارروائی کو نہیں روک سکتے تھے۔

2۔ جنرل ضیاء الحق کا بطور کمانڈر انچیف تقرر

بھٹو کی دوسری سنگین غلطی جس پر بعد میں وہ خود بھی بہت پچھتائے اور اپنی کتاب "اگر مجھے قتل کیا گیا؟" میں اس کا کھل کر اعتراف کیا۔ وہ جنرل ضیاء الحق کو پاک آرمی کا کمانڈر انچیف مقرر کرنا تھا۔

یکم مارچ 1976ء کو جنرل ٹکا خان کی ریٹائرمنٹ سے قبل ہی بھٹو نے ضیاء الحق کو اُن کا جانشین مقرر کرنے کی بابت رائے مانگی تو ٹکا خان نے اس تجویز کی مخالفت کی تھی کیونکہ ایک تو کور کمانڈروں میں وہ

سب سے جونیئر تھے' دوسرے انہیں فیلڈ کا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔ 1965ء یا 1971ء کی جنگ میں انہوں نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ خود جنرل ہیڈ کوارٹرز کے کارپرداز بھی اُن کی تقرری کے حق میں نہ تھے۔ اس کے باوجود جنرل ضیاء کو سات سینئر جرنیلوں پر ترجیح دے کر پاک فوج کا سربراہ بنادیا گیا۔

اس تقرری کا پس منظر یہ تھا کہ بھٹو ایک عرصہ سے انہیں جانتے تھے۔ وہ ضیاء کو ایک مذہبی دستقی شخص سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص نماز روزہ میں مشغول رہے گا اور سیاسی معاملات میں حکومت کیلئے کوئی مشکلات پیدا نہیں کرے گا لیکن ضیاء الحق میجری کے زمانہ سے ہی سیاسی امور میں دلچسپی لیتے آرہے تھے۔ جب وہ ایک ڈویژن کے کمانڈر بنے تو انہوں نے بھٹو کا قرب اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے انہیں کئی تقاریب میں مدعو کیا۔ ایسی تقاریب میں وہ بھٹو کی تعریف و توصیف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے بھٹو کی ملکی اور مسلح افواج کیلئے شاندار خدمات کی ستائش کے طور پر انہیں ایک مرصع تلوار پیش کی جب انہیں لیفٹننٹ جنرل کے عہدہ پر ترقی اور ملتان میں مقیم دوسری کور کی کمان ملی تو انہوں نے بھٹو کو اپنی آرمرڈ کور کا کرنل انچیف بنانے کی تجویز پیش کی۔

ملٹری سیکرٹری (تب جنرل فیض علی چشتی) نے تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ ایسی تقرریاں سیاسی قائدین کیلئے نہیں ہوتیں۔ صرف ریٹائرڈ فوجی شخصیات اس اعزاز کی مستحق ہوتی ہیں۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل ٹکا خان نے اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ حال ہی میں ایران کے شہزادہ محمد رضا شاہ پہلوی کو فرنٹیئر کانسٹیبلری کا کرنل انچیف بنایا گیا ہے۔ جنرل چشتی نے جواب دیا کہ ایک تو ایرانی شہزادہ کے پاکستانی سیاست میں ملوث ہونے کا کوئی امکان نہیں دوسرے پاک فوج اور فرنٹیئر کانسٹیبلری میں زمین آسمان کا فرق ہے تاہم ان کی دلیل کو کسی نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور بھٹو صاحب کو آرمرڈ کور کا کرنل انچیف بنادیا گیا۔ جب وہ کرنل انچیف کا رینک پہننے کیلئے ملتان آئے تو ضیاء الحق نے فوجی افسروں کو اُن کی بیگمات اور بچوں سمیت استقبال کیلئے سڑک پر لائن اپ کر دیا۔ افسروں نے ان کے حق میں نعرے لگائے اور بیگمات نے ان پر گلپاشی کی۔ اس کے بعد جب ضیاء الحق گیریژن افسروں سے خطاب کرنے آئے تو ایک نوجوان کیپٹن نے ہمت کرتے ہوئے سوال داغ دیا "جناب والا! آپ "جرنیل آن میرٹ" ہیں یا "پولیٹیکل جرنیل" ہیں جو آپ کو اتنے پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں؟" اس پر سوال کنندہ کو تو بطور سزا ایک دور دراز مقام پر ٹرانسفر کر دیا گیا اور آخر میں فوج سے چھٹی کر دی گئی اور جنرل ضیاء کو اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد پاک آرمی کی کمان سونپ دی گئی۔

بھٹو کے ساتھ ضیاء کے قریبی تعلقات اور اعتماد کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ 1973ء میں بھٹو کا تختہ الٹنے کی "اٹک سازش" میں ملوث کچھ افسروں پر مقدمہ چلانے کیلئے ضیاء الحق (تب میجر جنرل) کو جنرل کورٹ مارشل کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ معاملہ کی نوعیت و سنگینی کے پیشِ نظر وزیراعظم نے اس میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا اور خود کو کیس کی پیش رفت سے باخبر رکھنے لگے۔

ضیاء نے اس معاملہ کو جیسے نمٹایا اور بھٹو صاحب کے اطمینان کے مطابق کارروائی کی۔ اس نے وزیراعظم کو یقین دلادیا کہ وہ ہر طرح سے قابلِ اعتماد ہیں چنانچہ سات سینئر جرنیلوں کو نظرانداز کر کے انہیں چیف آف آرمی سٹاف بنادیا گیا۔

بھٹو کو خوش کرنے کیلئے ضیاء کی کوششوں میں ایک اور واقعہ کا ذکر بھی بے محل نہ ہو گا۔ جنرل ٹکا خان کے دور میں مفتی محمود کے اصرار پر فوجی میسوں میں شراب پیش کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اگست 76ء میں فارمیشن کمانڈروں کا اجلاس ہوا ——— تو حسبِ دستور ایک روز وزیراعظم جی ایچ کیو کے مہمان بنے۔ اس موقع پر یہ تجویز زیرِ غور آئی کہ فوجی میسوں میں شراب کی ممانعت ختم کر دی جائے۔ اس تجویز کے محرک خود جنرل ضیاء الحق تھے۔ جنہوں نے چیف آف آرمی سٹاف بنتے ہی "ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ" کو فوج کا ماٹو قرار دیا۔ یہ معاملہ فارمیشن کمانڈروں کے اجلاس میں اٹھایا گیا تو بعض جرنیلوں نے اس کی مخالفت کی مگر ضیاء الحق اپنی تجویز پر قائم رہے اور شام کو ان کے حکم سے نہ صرف بھٹو صاحب بلکہ دیگر مہمانوں کو بھی شراب پیش کی گئی۔ اس پر بھٹو صاحب کے قریب بیٹھے ہوئے ایک جرنیل نے مسکراتے ہوئے کہا "سر آپ کے مبارک قدموں کے طفیل ہماری تشنہ لبی ختم کرنے کا سلسلہ بھی بحال ہو گیا ہے" اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ بھٹو نے اپنی مخصوص شراب کا ایک جام اُس جرنیل کو پیش کرنے کا اشارہ کیا یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود فوجی کمانڈروں کی اکثریت نے فوجی میسوں میں شراب نوشی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

اس سلسلے میں واقفانِ حال کہتے ہیں کہ جنرل ضیاء کو کمانڈر انچیف بنانے کا فیصلہ بھٹو نے نہیں کیا بلکہ یہ فیصلہ اوپر سے ان پر تھوپا گیا تھا۔ جسے انہوں نے ناچار قبول کر لیا۔ مولانا کوثر نیازی اپنی کتاب "اور لائن کٹ گئی" میں لکھتے ہیں

"جنرل ٹکا خان ابھی فوج کے سربراہ تھے، ان کی ریٹائرمنٹ سے پانچ چھ ماہ پہلے کی بات ہے کرنل بلائی نامی ایک شخص امریکی سفارتخانہ میں ملٹری اتاشی کے عہدہ پر فائز تھا۔ وہ انتہائی اہم اور باخبر افسر تھا۔ پشاور میں گالف کھیلتے ہوئے اس نے انکشاف کیا کہ

"تمہارے آئندہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق ہوں گے" اس عہدہ کیلئے تین نام سرِفہرست تھے اور سروسز کے لوگ انہی کا ذکر کرتے تھے۔ یہ تین نام لیفٹننٹ جنرل شریف، مجید ملک اور عزت بخش اعوان کے تھے۔ جب کرنل بلائی نے ضیاء الحق کا نام لیا تو اس افسر کو جس کا تعلق پاک فضائیہ سے تھا بڑا تعجب ہوا۔ اس نے یہ بات ایئر مارشل ذوالفقار علی خان کو بتائی مگر وہ ہنس کر ٹال گئے۔

چھ ماہ بعد وہی نام جو کرنل بلائی نے بتایا تھا پاکستان آرمی کے چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر پوری دنیا کے سامنے آیا اور جنرل ضیاء الحق اپنے سے کئی سینئر جرنیلوں کو سپرسیڈ کر کے پاکستانی افواج کے

www.bhutto.org

سربراہ بن گئے۔

کرنل بلائی ضیاء الحق کے دور میں ملازمت سے ریٹائر ہوا بعد ازاں 1985ء میں جب وہ پاکستان کے نجی دورہ پر آیا تو ضیاء الحق نے ایوان صدر میں اس کی ضیافت کی۔

(اور لائن کٹ گئی) صہ 75 مولانا کوثر نیازی)

آخری دور کے بعض قابلِ ذکر واقعات

7 جنوری 1977ء بھٹو کا اعلان کہ قومی اسمبلی 10 جنوری کو اور صوبائی اسمبلیاں 13 جنوری کو توڑ دی جائیں گی۔ 10 جنوری رفیق باجوہ کے گھر پاکستان قومی اتحاد کی تشکیل عمل میں آئی۔

7 مارچ 77ء..... قومی اسمبلی کے انتخابات..... پیپلز پارٹی نے 155 سیٹیں حاصل کیں جبکہ پی این اے کو صرف 36 نشستیں ملیں۔

10 مارچ..... صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات..... قومی اتحاد کی طرف سے بائیکاٹ۔

21 اپریل..... لاہور 'کراچی' اور حیدر آباد میں جزوی مارشل لاء کا نفاذ۔

28 اپریل..... قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے انکشاف کیا کہ "سفید ہاتھی" (امریکہ) میرے خلاف سازش میں ملوث ہے' اس کے اشارے پر میرے خلاف ایک بین الاقوامی سازش بروئے کار لائی جا رہی ہے۔

30 اپریل..... بھٹو نے ڈرامائی انداز میں کھلی جیپ میں پنڈی کا دورہ کیا اور صدر کے علاقہ میں امریکی سنٹر کے قریب میگافون کے ذریعے حاضرین سے خطاب کے دوران بتایا کہ امریکہ وزیر خارجہ نے مجھے خط لکھا ہے جس میں امریکہ نے پاکستان کو مذاکرات کی دعوت دی ہے۔ "ہم بات چیت کو تیار ہیں لیکن اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہیں" جس کا واضح مطلب تھا کہ ہم مذاکرات تو کر سکتے ہیں لیکن ایٹمی پلانٹ کے منصوبہ سے ہرگز دستبردار نہیں ہوں گے۔ انہوں نے ہنری کسنجر کا خط بھی ہوا میں لہرا کر عوام کو دکھایا۔

یوں بھٹو نے امریکہ کی طرف سے خاموش مذاکرات کا راز طشت از بام کر دیا۔ اس کے بعد امریکہ کیلئے انہیں برداشت کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

14 مئی..... بھٹو کی مولانا مودودی سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات۔

16 مئی..... ملک گیر احتجاجی مظاہروں اور توڑ پھوڑ کے پیش نظر راولپنڈی میں کور کمانڈرز کا اجلاس۔ جس میں طے کیا گیا کہ اگر فریقین میں مفاہمت نہیں ہوتی تو فوجی اقدام ناگزیر ہو جائیگا۔

3 جون..... حکومت اور قومی اتحاد کے مابین مذاکرات کا آغاز۔

15 جون..... حکومت اور پی این اے کے درمیان زبانی سمجھوتہ طے پا گیا۔ محض نوک پلک درست کرنا باقی رہ گیا۔

www.bhutto.org

17 جون..... بھٹو کی 5 اسلامی ممالک کے 6 روزہ دورہ پر روانگی جس میں لیبیا' کویت' عرب امارات' افغانستان اور ایران کا دورہ شامل تھا۔ 23 کو واپسی۔

25 جون..... قومی اتحاد کی طرف سے بعض نئے نکات پیش کر دیئے گئے۔ مذاکرات میں ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا۔

یکم جولائی..... مذاکرات کا دوسرا اور فیصلہ کن دور شروع ہوا۔ ساڑھے تیرہ گھنٹے کی بات چیت کے بعد 2 جولائی کی صبح تک تمام امور طے پا گئے۔

3 جولائی..... رات کو کھانے کے بعد حکومت اور پی این اے کے مابین مذاکرات کا آخری دور۔ بعض تکنیکی امور پر اختلاف۔ بھٹو نے ان نکات پر غور کیلئے کچھ وقت مانگا۔ رات کو امریکی سفیر نے بھٹو سے دوبارہ ملاقات کی جو ایک سربستہ راز ہے۔

4 جولائی..... کابینہ کے اجلاس میں سمجھوتہ پر فوری دستخط کرنے پر اتفاق رائے۔ رات 30-11 بجے بھٹو نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ وہ سمجھوتہ پر دستخط کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور کل صبح سمجھوتہ ہو جائیگا۔

دوسری طرف رات بارہ بجے جنرل فیض علی چشتی کی نگرانی میں فوج نے اپنا آپریشن "فیئر پلے" شروع کر دیا۔ پیر پگاڑا' میاں طفیل محمد اور سردار عبدالقیوم خان کے سوا قومی اتحاد کے جملہ قائدین اور متعدد وفاقی وزراء کو حراست میں لے لیا گیا۔ بھٹو کو گرفتار کرنے کیلئے صبح تک کی مہلت دیدی گئی۔ صبح کو ناشتہ کے بعد انہیں بھی حراست میں لیکر مری کے گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچا دیا گیا۔ یوں 20 دسمبر 71ء کو ڈرامائی انداز میں شروع ہونے والے بھٹو کے دور اقتدار کا خاتمہ بھی بڑے ہی ڈرامائی اور پُراسرار حالات میں ہوا۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

تیسرا باب

مقدمہ کیسے بنایا گیا؟ پس پردہ حقائق

مقدمہ کا پس منظر

ملک کی تاریخ میں 5 جولائی 1977ء کا دن بھلایا نہیں جاسکتا۔ یہی وہ تاریخ تھی جب سورج طلوع ہونے سے قبل ہی پورے ملک میں مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا۔ دراصل فوجی ہائی کمان ٹیک اوور کرنے کا فیصلہ بہت پہلے کر چکی تھی۔ جنرل ضیاء الحق اس بات سے خوفزدہ تھے کہ کہیں حکومت اور قومی اتحاد کے مابین مذاکرات کامیاب نہ ہو جائیں۔ جنرل جہاں زیب ارباب کے بقول آرمی کی طرف سے دونوں حلقوں میں "خاص آدمی" چھوڑ دیئے گئے تھے تاکہ مذاکرات کی بیل سرے نہ چڑھ سکے اور 3 جولائی سے فوجی دستوں کی تعیناتی شروع کر دی گئی تھی۔ کور کمانڈرز کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ 4 تاریخ کی رات کو کارروائی کیلئے تیار رہیں اور یہ کہ اگر مارشل لاء نہ لگانا پڑا تو بروقت مطلع کر دیا جائیگا۔ چنانچہ 3 جولائی کو سمجھوتہ پر اتفاق رائے ہو جانے اور 4 جولائی کی رات کو وفاقی کابینہ کی طرف سے سمجھوتہ کی توثیق کے باوجود "آپریشن فیئر پلے" پر عملدرآمد کیا گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ فوج نے حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بہت پہلے سے بنا رکھا تھا۔ فوجی آپریشن انتہائی سہل اور دارالحکومت تک محدود تھا۔ راولپنڈی کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی اس کی تیاری پہلے سے کر چکے تھے۔ تمام کارروائی بڑے آرام کے ساتھ صبح 5 بجے تک مکمل کر لی گئی۔ ان شواہد کی روشنی میں یہ کہنا غلط ہو گا کہ ضیاء نے مارشل لاء لگانے کا فیصلہ 4 جولائی کو ہی کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس فیصلہ پر بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنا لندن کا دورہ منسوخ کر کے اپنی جگہ جنرل جمال سید میاں کو بھجوا دیا حالانکہ انہی دنوں ان کی چہیتی بیٹی

www.bhutto.org

زین ضیاء کا لندن میں دل کا آپریشن ہو رہا تھا۔ وہ اس آپریشن کے دوران اپنی صاحب زادی کے پاس رہ سکتے تھے۔ مگر انہوں نے لندن جانے کی بجائے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی۔ وہ بھٹو کو آخر وقت تک اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے رہے۔ ان دنوں ان کی حالت یہ ہوا کرتی تھی کہ بھٹو کے احترام میں آرام دہ صوفہ پر بھی ایسے تن کے بیٹھتے تھے جیسے بھٹو کوئی بہت بڑے روحانی پیشوا ہوں۔ انہیں بارہا بھٹو کی کار کا دروازہ کھولتے اور بڑے احترام کے ساتھ جھک کر سینے پر ہاتھ رکھ کر آداب و کورنش بجالاتے ہوئے دیکھا گیا۔ ان تمام اقدامات کی غرض و غایت یہ تھی کہ بھٹو کے اعتماد کو کوئی ٹھیس نہ لگے اور وہ حسبِ معمول ضیاء کو اپنا "وفادار خادم" سمجھتے رہیں۔ شاید کسی نے ایسے ہی موقع کی مناسبت سے کہا ہے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں..... حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

عوام نے صبح سات بجے کے بلٹن میں اس اقدام کی خبر سنی تو اُن کی طرف سے ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا گیا البتہ جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد کی طرف سے مارشل لاء کے نفاذ کا خیر مقدم کیا گیا۔ عام لوگوں میں ایک تاثر یہ بھی تھا کہ یہ سب کچھ بھٹو کے ایماء پر ہی ہوا ہے تاکہ قومی اتحاد کی تحریک کو اس طرح دبا دیا جائے۔ لوگوں کی اکثریت نے تیسرے مارشل لاء کو خوش آمدید تو نہیں کہا البتہ 90 دنوں کے اندر انتخابات کرانے کے واضح وعدہ پر یقین کر کے ان مخصوص حالات میں فوج کی کارروائی کو دُرست اور غنیمت سمجھا۔

5 جولائی کو مارشل لاء کے نفاذ سے متعلق ایک غیر معمولی گزٹ میں اعلان کیا گیا کہ

1..... قومی اسمبلی، سینٹ اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں۔

2..... دستور کو معطل کر دیا گیا ہے۔

3..... وفاقی حکومت برطرف کر دی گئی ہے

4..... صدر فضل الٰہی اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس یعقوب علی خان اپنے اپنے عہدوں پر بدستور کام کرتے رہیں گے۔

5..... مارشل لاء کے کسی حکم کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔

یہ مارشل لاء اتنی خاموشی اور دبے پاؤں ملک پر مسلط ہوا کہ کسی کو اس کے قدموں کی چاپ تک سنائی نہیں دی۔ اسلام کے سپاہی کی حیثیت سے جنرل ضیاء الحق کا یہ عزم و عہد سکون و اطمینان کا باعث بنا کہ اگلے چند ماہ وہ اپنی تمام تر توجہ صرف انتخابات کے انعقاد پر مرتکز رکھیں گے اور اپنا کام ختم کر کے افواج پاکستان واپس بیرکوں میں چلی جائیں گی۔ اپنے اولین خطاب میں ضیاء الحق نے قوم کو یقین دلایا

"میں یہ بات بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں مجھے صرف اس خلاء کو پُر کرنے کیلئے آنا پڑا جو سیاست دانوں نے پیدا کر دیا تھا۔ میں نے یہ چیلنج اسلام کے ایک سپاہی کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ میں عام انتخابات کراؤں گا جو انشاء اللہ اسی سال اکتوبر میں ہوں گے۔ انتخابات مکمل

www.bhutto.org

ہوتے ہی میں اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دوں گا۔"

اس واضح یقین دہانی کے علاوہ یہ مارشل لاء اپنی نوعیت اور طریق کار کے لحاظ سے بھی ایک بالکل نئی طرز کا تھا۔ شروع میں ضیاء الحق اسے مارشل لاء کا نام دینے سے گریزاں تھے۔ وہ اسے "انتخابات کیلئے عارضی انتظام" کا نام دے رہے تھے۔ اس پر جنرل جمال سید میاں نے انہیں سمجھایا کہ جب آپ گھوڑے پر سوار ہو گئے ہیں تو اس پر وزن ڈالنے سے گریز کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کھل کر کہیں کہ ملک مارشل لاء نافذ ہو چکا ہے۔ ضیاء الحق نے جواب دیا " آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر میری خواہش یہ ہے کہ ہم پر آئین شکنی کا الزام نہ آئے جو مارشل لاء کے اعلان کی صورت میں آسکتا ہے۔"

اپنے مقصد کے دوٹوک تعین کے ساتھ ہی اس مارشل لاء کے ابتدائی اقدامات سے بھی یہی محسوس ہوا کہ اس کے کوئی سیاسی مقاصد نہیں ہیں۔ اس کا عمومی رویہ نرم و نازک اور شیریں تھا۔ کسی سیاسی رہنماء یا کارکن کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ سول ملازمین کو کسی تادیبی کارروائی کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔

ابتداء میں فوج نے اپنی غیر جانبداری کا بھرم رکھنے کی بھرپور کوشش کی چنانچہ جمعہ 15 جولائی کو ضیاء الحق نے جنرل چشتی، جنرل کے ایم عارف، غلام اسحاق خان اور مری کے جی او سی میجر جنرل اختر عبدالرحمٰن کی معیت میں پہلے پنجاب ہاؤس میں مقیم قومی اتحاد کے رہنماؤں کی خیریت دریافت کی اور دو گھنٹے تک بات چیت کی پھر وہ پنجاب ہاؤس کے بالمقابل گورنر ہاؤس پہنچے اور وہاں تنہائی میں مسٹر بھٹو سے ملاقات کی۔ جنرل صاحب نے مسٹر بھٹو کے احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھا اور انہیں یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ معزول شدہ وزیر اعظم ہیں۔ جنرل امتیاز ابھی تک اُن کے ملٹری سیکرٹری کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اس ملاقات میں بھٹو نے ضیاء کو خوب کھری کھری سنائیں اور آئین شکنی کے نتائج سے ڈرایا۔ آخر میں انتقام کی دھمکی بھی دی۔ جس سے ضیاء الحق نے یہ اندازہ لگالیا کہ اگر بھٹو دوبارہ برسر اقتدار آ گئے تو وہ انہیں کسی قیمت پر معاف نہیں کریں گے۔ ماضی کی ایسی لاتعداد مثالیں موجود تھیں کہ بھٹو جس سے ناراض ہوئے مصیبتوں نے اُس کا گھر دیکھ لیا۔

بھٹو کے مزاج و سرشت کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود ابتداء میں ضیاء نے اس تاثر کو بہت ہی مدھم سر میں رکھنا چاہا کہ فوج ان کی مخالف ہے یا ان کی پارٹی کو کچلنا چاہتی ہے۔ انہوں نے ملکی و غیر ملکی نامہ نگاروں کو جو انٹرویو دیئے ان میں اس بات پر اصرار کیا کہ

1..... فوج کسی کا احتساب نہیں کرے گی نہ ہی کسی قسم کے مقدمات چلائے جائیں گے۔

2..... انتخابات میں دھاندلی برائے نام ہوئی تھی اور پیپلز پارٹی کی جیت دھاندلی کے بغیر بھی یقینی تھی۔

3..... بھٹو کے متعلق اظہار خیال کرتے وقت وہ ان کی مذمت کم اور تعریف زیادہ کرتے تھے۔ چنانچہ 17 جولائی کو مشہور جریدے "نیوز ویک" کو انٹرویو دیتے ہوئے ضیاء نے کہا "میں نے جناب بھٹو کے بہت

www.bhutto.org

قریب رہ کر کام کیا ہے اور وہ مجھ پر بہت مہربان بھی تھے لیکن مجھے اپنا فرض سمجھ کر جو کچھ کرنا پڑا اس پر کوئی افسوس نہیں البتہ اس بات کا دکھ ہے کہ مجھے یہ کارروائی ایک ایسے شخص کے خلاف کرنی پڑی جس کا ہمیشہ سے احترام کرتا آیا تھا اور جس نے اپوزیشن کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کیلئے انتہائی سنجیدگی سے اپنی بہترین کوشش کی۔ حقیقت میں جناب بھٹو مفاہمت کیلئے اس حد تک بڑھ گئے جہاں تک کوئی سیاست دان زیادہ سے زیادہ حد تک آگے جاسکتا ہے لیکن فریقین میں بہت زیادہ عدم اعتماد آڑے رہا۔ "وہ بڑے پختہ عزم کے مالک ہیں۔ انہیں تاریخ کا شعور و ادراک حاصل ہے۔ وہ حالات کا مقابلہ کرنا جانتے ہیں اور ایک عظیم سیاست دان ہیں"

مارشل لاء پینترا بدلتا ہے

لیکن جب 28 جولائی کو مری سے حکومت اور اپوزیشن کے مقتدر رہنماء رہا کر دیئے گئے تو بھٹو نے اسلام آباد' لاڑکانہ' لاہور اور پشاور کا طوفانی دورہ کیا اور اپنی جماعت کے سیاسی کارکنوں کے عظیم اجتماعات میں ضیاء کو یہ یاد دہانی کرائی کہ آئین میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سزا موت مقرر ہے پھر 8 اگست کو بھٹو کی لاہور میں آمد کے موقع پر پیپلز پارٹی نے طاقت کا جو زبردست مظاہرہ کیا اس نے ضیاء الحق کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ممکن ہے اکتوبر 77ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی پھر جیت جائے وہ بھٹو کو دوبارہ کسی قیمت پر برسر اقتدار دیکھنے کو تیار نہیں تھے۔ لاہور میں بھٹو کے فقید المثال استقبال نے ایک طرف مارشل لاء کو پریشان کر دیا' دوسری طرف قومی اتحاد بھی لرزاں و ہراساں نظر آنے لگا۔ محبوبیت و مقبولیت کے اس سیلاب نے خود بھٹو کو بھی ایک گونہ "پاگل" بنا دیا۔ اس سٹریٹ فورس نے اُس کی سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا توازن بگاڑ دیا۔ وہ یہ بھول گیا کہ یہ 1970ء نہیں۔ 1977ء ہے۔ جب فوج اور نوکر شاہی اس کی حامی نہیں بلکہ مخالف اور جان کی دشمن بن چکی ہے۔ انہی دنوں لاہور کے ہوائی اڈہ پر مولانا شاہ احمد نورانی کے ساتھ بھٹو کے حامیوں نے جو بدتمیزی اور بدسلوکی کی اس نے احتجاجی تحریک چلانے والے تمام طبقوں کو خوفزدہ کر دیا۔ بدلی ہوئی صورت حال میں فوج اور قومی اتحاد ایک دوسرے کے قریب آنے لگے اور بھٹو پر کاری ضرب لگانے کی منصوبہ بندی شروع ہو گئی۔

چونکہ جنرل ضیاء الحق وزیر اعظم بھٹو کو خوش کرنے کیلئے بہت دور تک جاتے رہے تھے اور ان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے بھٹو کو محروم اقتدار کرنے کے بعد انہوں نے بھٹو سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب قومی اتحاد کی قیادت اور دوسرے لیڈروں کی طرف سے اُن کے دل کی بات کہی جانے لگی یعنی بھٹو کے احتساب کا مطالبہ ہونے لگا تو انہیں ایک رسمی بہانہ ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے جنرل چشتی' راؤ فرمان علی اور جنرل کے ایم عارف کو ہدایت کی کہ وہ بھٹو کے خلاف مقدمات تلاش کریں۔ اس سلسلہ میں آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کو بھی ان سے تعاون کی ہدایت کر دی گئی۔ 20 اگست کو ایف آئی اے کے

www.bhutto.org

ڈائریکٹر جنرل نے الیکشن سیل کے اراکین سے ملاقاتیں کیں اور بتایا کہ بھٹو کے خلاف مقدمات میں ناکافی گواہیوں کے باعث ماتحت عدالتیں ان کی گرفتاری کے احکام جاری کرنے سے ہچکچا رہی ہیں۔ اس موقع پر انہوں نے مقدمات کی ایک فہرست سیل کے حوالے کر دی۔ 21 اگست کو الیکشن سیل کے اراکین نے ضیاء سے ملاقات کی اور یہ بات اصولی طور پر طے کر لی گئی کہ بھٹو کو 4 ستمبر سے پہلے پہلے گرفتار کر لیا جائیگا۔

بھٹو کی گرفتاری اور ضمانت پر رہائی

بڑی سوچ بچار کے بعد طے پایا کہ بھٹو کو قتل کے گھناؤنے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔ حسبِ پروگرام 3 اور 4 ستمبر کی درمیانی شب ایف آئی اے نے صبح چار بجے انہیں ان کی اقامت گاہ 70 کلفٹن کراچی سے حراست میں لیکر ایئر فورس کے ایک طیارہ کے ذریعے لاہور پہنچا دیا جہاں پہلے انہیں ایک فوجی میس میں رکھا گیا بعد ازاں سات دن کے ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

مارشل لاء حکام نے بھٹو پر فوجداری کا مقدمہ قائم کرنے کا فیصلہ کرتے وقت سوچا ہو گا کہ اس طرح بھٹو پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالا جا سکے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مقدمہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ بھٹو کو فوجداری اور گھناؤنے قتل کے جرم میں ملوث کر کے اور قانونی موشگافیوں میں اُلجھا کر سیاسی میدان سے خارج کر دیا جائے۔ کیونکہ ضیاء ان کے دوبارہ حکومت میں آنے کا خطرہ مول لینے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ چنانچہ پولیس کی پرانی فائلوں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نواب محمد احمد خان کے قتل کا مقدمہ نکالا گیا۔ تفتیش کی کڑیاں جوڑی گئیں اور ملک کے سابق وزیر اعظم کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں سماعت شروع ہو گئی۔ اس مرحلہ پر فوجی حکام یہ بات بھول گئے کہ وہ عدلیہ کے ہاتھوں بھٹو کو میدان سیاست سے خارج کراتے کراتے خود عدلیہ کو عوام کے اعتماد سے محروم کر بیٹھیں گے اور عدلیہ کو ایک ایسے بحران میں پھنسا دیں گے کہ عدلیہ کے ارکان اس بحران سے نکلنا چاہیں گے تب بھی نہیں نکل سکیں گے۔

بھٹو کی دوبارہ گرفتاری

13 ستمبر کو جس وقت لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس صمدانی نے بھٹو کی ضمانت منظور کر کے ان کی رہائی کا حکم صادر کیا۔ اُس وقت جنرل ضیاء جی ایچ کیو کے کانفرنس ہال میں سیاست دانوں کے ایک ملک گیر کنونشن کی صدارت کر رہے تھے۔ جس میں مولانا مفتی محمود، مولانا نورانی، پروفیسر غفور احمد، خان محمد اشرف خان، بیگم نصرت بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ، ڈاکٹر غلام حسین، خان عبدالقیوم خان اور شیرباز مزاری جیسے مقتدر رہنماء شریک تھے اور آئندہ انتخابات کے ضوابط و طریق کار پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس سے پیشتر کھر، جتوئی، ظہور الٰہی، امیر عبداللہ روکڑی، میاں طفیل محمد، ایوب کھوڑو اور اصغر خان وغیرہ الیکشن سیل کے اراکین سے مل کر اس امر کی یقین دہانی کرا چکے تھے کہ بھٹو کی گرفتاری پر کوئی خاص ردِ عمل نہیں

www.bhutto.org

ہونے دیں گے۔

6 ستمبر کو انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر ایم اے کے چودھری (محمود علی خان چودھری) نے آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل غلام جیلانی خان کی موجودگی میں الیکشن سیل سے ملاقات کی۔ انہوں نے سیل کو امن وامان کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے خبردار کیا کہ اگر کھلی سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی گئی تو زبردست خون خرابے کا خطرہ ہے۔ انہوں نے ایف ایس ایف کو توڑ کر پولیس میں مدغم کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

13 ستمبر کو مین کانفرنس کے درمیان ضیاء کے اے ڈی سی دبے پاؤں اندر آئے اور کاغذ کا ایک پرزہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چٹ پر یہ اطلاع درج تھی کہ ہائی کورٹ کے ایک جج نے بھٹو کی ضمانت لے لی ہے۔

سیاست دانوں کی مشترکہ میٹنگ ختم ہونے پر موصول شدہ "بُری خبر" کے علاوہ انتخابات ملتوی کرنے کی تجاویز کا جائزہ لینے کیلئے ضیاء کے زیرِ صدارت ایک اور اجلاس ہوا۔ سیل کے اراکین نے مارچ 78ء تک انتخابات ملتوی کر دینے کی تجویز پیش کی۔ ضیاء الحق نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ایسا التواء زیادہ سے زیادہ چار ہفتوں کیلئے ہو سکتا ہے۔

بھٹو کی ضمانت پر رہائی ضیاء الحق اور ان کے رفقاء کو سخت ناگوار گزری۔ ان دنوں جنرل اقبال لاہور کے ڈی ایم ایل اے تھے۔ انہیں اس بات پر سی ایم ایل اے کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا کہ انہوں نے بھٹو کو رہا کیوں ہونے دیا۔ اگر عدالت نے ضمانت منظور کر ہی لی تھی تو انہیں کسی اور مقدمہ میں گرفتار کیوں نہ کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ ہائی کورٹ کے ضمانت لینے والے دو بنچ اور انڈی پینڈنٹ جج خواجہ ایم اے کے صمدانی کو فارغ کر کے چلتا کر دیا گیا۔

جنرل اقبال کی نرم روی کے باعث بھٹو ملتان میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کرنے کے بعد کراچی پہنچے اور وہاں بھی جلسہ کا اعلان کر دیا۔ فوجی جنتا کیلئے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اس دفعہ انہیں مارشل لاء کے ضابطہ نمبر 12 کے تحت گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تاکہ کسی اپیل، دلیل اور وکیل کی کوئی گنجائش نہ رہے اور کوئی عدالت ان کی ضمانت نہ لے سکے۔ نئی پلاننگ کے تحت ان کی گرفتاری 17 ستمبر کو عمل میں لائی گئی۔ یہ ان کی آخری نظربندی تھی۔ جو اُن کی موت تک مختلف صورتوں سے قید میں تبدیل ہوتی رہی اور اس بار انہیں مر کر ہی رہائی ملی۔

مقدمہ کی مختصر روئداد

بھٹو کو دوسری بار جس الزام کے تحت گرفتار کیا گیا ہائی کورٹ میں ان پر جو مقدمہ چلایا گیا اس کی مختصر روئداد اس طرح ہے کہ

www.bhutto.org

"احمد رضا قصوری پیپلز پارٹی کے بانی اراکین میں سے ایک تھے۔شروع شروع میں وہ بھٹو کے زبردست مداح اور قصیدہ خواں رہے۔ 1970ء کے انتخابات میں پی پی پی کے ٹکٹ پر قصور سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ مشرقی پاکستان کی شکست وریخت کے دوران بھٹو نے جو کردار ادا کیا اور جرنیلوں کے ساتھ مل کر انتقال اقتدار کی راہ میں جو رکاوٹیں ڈالیں۔ اس چیز نے قصوری کو بھٹو سے بدظن کر دیا۔ وہ بھٹو کو اقتدار کا بھوکا قرار دینے اور اس پر اعلانیہ زہریلی تنقید کرنے لگے۔اس طرح بھٹو کے ساتھ ان کی دوستی رفاقت عداوت مخاصمت میں بدل گئی۔ انہوں نے پی پی پی کو چھوڑ کر اصغر خان کی جماعت تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کر لی اور بھٹو کی ذات نیز اُس کی پالیسیوں پر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ حملے کرنے لگے۔ وہ 1973ء کے دستور پر دستخط نہ کرنے والے نو اراکین اسمبلی میں سے ایک تھے۔

10 اور 11 نومبر 1974ء کی درمیان رات کو وہ اپنے والد نواب محمد احمد خان' والدہ اور اپنی خالہ مسز ایم مہدی خان کے ساتھ شادمان کالونی میں سید شبیر حسین شاہ کے ہاں شادی میں شرکت کرنے کے بعد کار میں شاہ جمال کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک گول چکر کے قریب ان کی کار پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ خود کار چلا رہے تھے اور اُن کے والد برابر کی سیٹ پر بیٹھے تھے جبکہ عقبی نشست پر ان کی والدہ اور خالہ بیٹھی تھیں۔ وہ برستی ہوئی گولیوں میں تیزی سے کار کو نکال کر لے گئے تاہم تھوڑی دور جا کر جب اُن کے والد کی گردن ایک طرف لڑھک گئی تو پتہ چلا کہ اُن کے سر میں گولی لگی ہے اور جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ کار دائیں طرف سے چکنا چور اور شیشے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ قصوری اپنے زخمی باپ کو لے کر سیدھے امریکن ہسپتال (گلبرگ) پہنچے۔ جہاں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے صبح دو بجکر 55 منٹ پر مضروب نے دم دے دیا۔ اس موقع پر احمد رضا قصوری نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ان پر یہ فائرنگ سیاسی وجوہات کی بناء پر کرائی گئی ہے۔ کیونکہ وہ قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے رکن اور حکومت کے شدید نقاد ہیں۔ 3 جون 1974ء کو قومی اسمبلی کے ایوان میں تو تکار کے دوران بھٹو نے دھمکی دی تھی کہ "میں تم سے بیزار ہو چکا ہوں' تم اپنی زبان بند رکھو۔ میں تمہاری بکواس مزید برداشت نہیں کروں گا" اس کھلی دھمکی کی روشنی میں اسے پختہ یقین ہے کہ یہ حملہ وزیر اعظم مسٹر بھٹو کے ایماء پر کرایا گیا ہے یہ کہ اس سے پہلے بھی 24 اگست 1974ء کو اسلام آباد میں ان کی کار پر حملہ کر کے ان کی جان لینے کی ناکام کوشش کی گئی تھی"

وقوعہ کی اطلاع ملتے ہی لاہور کے ڈپٹی کمشنر ایس ایس پی اور ڈی آئی جی ہسپتال پہنچے۔ ان کی تجویز پر قصوری نے صبح 3 بجکر 20 منٹ پر مذکورہ بالا ایف آئی آر تھانہ اچھرہ میں درج کرائی۔ لاش کے پوسٹ مارٹم سے پتہ چلا کہ مقتول کے سر کے اوپر والے دائیں حصے اور بائیں طرف کے عقبی حصہ میں گولیاں لگی

www.bhutto.org

تھیں۔ سر میں سے سکہ کے دو ٹکڑے اور ایک گولی بر آمد ہوئی جائے واردات سے اچھرہ کے ایس ایچ او عبدالحئی نیازی نے 24 خول جمع کئے جو چار مختلف جگہوں پر پڑے تھے۔ تفتیش کی ابتدائی نگرانی ڈی ایس پی عبدالاحد نے کی جو 1975ء میں فوت ہو گیا۔ تفتیش بظاہر آگے نہیں بڑھ رہی تھی اس لئے یہ کیس سپیشل برانچ کے ملک محمد وارث کے سپرد کیا گیا۔ دوسری طرف حکومت پنجاب نے لاہور ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی ٹریبونل قائم کیا۔ اس ٹریبونل نے 26 فروری 1975ء کو اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی جس میں مقدمہ کی چھان بین کیلئے بعض رہنماء خطوط تجویز کئے گئے تھے۔ حکومت نے وہ رپورٹ منظر عام پر نہیں آنے دی۔ اکتوبر 1975ء میں ڈی ایس پی محمد وارث نے انسپکٹر جنرل پنجاب کی معرفت صوبائی حکومت سے ہدایات حاصل کرنے کے بعد مقدمہ کو عدم سراغ یابی کی بناء پر داخل دفتر کر دیا۔

مقدمہ کو دوبارہ کیسے زندہ کیا گیا؟

نواب محمد احمد خان کے قتل کیس کو دوبارہ جیسے شروع کیا گیا اس کی صورت یہ بنی کہ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد فوجی حکومت نے وفاقی ادارۂ تحقیقات (ایف۔ آئی۔ اے) کو ایف ایس ایف کی کارروائیوں کی چھان بین ماضی میں ہونے والے سیاسی قتل، اغوا اور جلسوں کو درہم برہم کرنے کے اقدامات کی تحقیقات کا حکم دیا۔ ایف آئی اے کے ایک انسپکٹر چودھری محمد بوٹا نے مارچ 75ء میں ایئر مارشل اصغر خان کی آمد پر لاہور ریلوے سٹیشن کی عمارت میں بم پھٹنے اور ایف ایس ایف (فیڈرل سیکورٹی فورس) کے کرایہ کے ایجنٹ محمد ریاض کے موقع پر پکڑے جانے اور بعد میں اعلیٰ حکام کی مداخلت پر اس کو چھوڑ دیئے جانے کے واقعات کی تفتیش اور ایف ایس ایف کے متعدد اہل کاروں سے پوچھ گچھ کی تو ریاض نے بتایا کہ نواب محمد احمد خان کے قتل میں بھی ایف ایس ایف کا ہاتھ تھا۔ اس سلسلے میں انسپکٹر غلام حسین سے رابطہ قائم کیا گیا تو اس نے کہا کہ اگر مجھے وعدہ معاف گواہ بنانے کا یقین دلایا جائے تو میں تمام واقعات سے پردہ اٹھانے کو تیار ہوں۔ اُس کی درخواست منظور کر لی گئی تو وعدہ معاف گواہ نے انکشاف کیا کہ نواب محمد احمد خان کو ایف ایس ایف کے اہل کاران ارشد اقبال، رانا افتخار اور صوفی غلام مصطفیٰ نے اس کی نگرانی میں قتل کیا تھا۔ اتنا سراغ ملنے پر 24 جولائی کو ملزم ارشد اقبال کو ملتان سے گرفتار کر لیا گیا اگلے دن رانا افتخار بھی پکڑا گیا۔ ان دونوں نے ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر آپریشنز میاں عباس اور ہیڈ کانسٹیبل صوفی غلام مصطفیٰ کے جرم میں ملوث ہونے کا انکشاف کیا۔ میاں عباس کو پکڑا گیا تو اس نے واردات کا سلسلہ ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود سے جوڑا جو 5 جولائی سے زیر حراست تھا اور اُس نے 14 اگست 77ء کو مارشل لاء حکام کو درخواست دی تھی کہ اگر اس کی جان بخشی کر دی جائے تو وہ سارے معاملہ کو طشت از بام کرنے کو تیار ہے۔ اس کی یہ استدعا بھی فوراً قبول کر لی گئی۔ یوں مسعود محمود

www.bhutto.org

اور غلام حسین کی شکل میں استغاثہ کو دو مضبوط گواہ مل گئے۔

سازش کی کڑیاں کیسے ملائی گئیں اور گواہ کس طرح بنائے گئے؟

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں فوجی حکام بھٹو کے خلاف مواد تلاش کرنے کیلئے بے چین تھے۔ غلام حسین کے اشارہ پر ارشد اقبال اور رانا افتخار کو گرفتار کر کے لاہور لایا گیا۔ انہیں ایک کوٹھی میں رکھ کر ان کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا گیا۔ ان دونوں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تو باقی ملزمان کو بھی طرح طرح کی ترغیب و تحریص سے گواہی دینے پر آمادہ کیا گیا۔ جنرل چشتی نے چاروں ملزمان کے لواحقین کو اپنے دفتر میں بلا کر یقین دلایا کہ ان کی رحم کی اپیلیں منظور کر کے ان کی جان بخش دی جائیگی۔ ایسے وعدہ وعید پر یقین کر کے گواہانِ استغاثہ مسعود محمود غلام حسین نیز چاروں ملزمان ارشد اقبال، رانا افتخار، صوفی غلام مصطفیٰ اور میاں محمد عباس نے جو سب ایف ایس ایف سے تعلق رکھتے تھے سازش کا تانا بانا بن کر ایک بے سروپا مقدمہ کیلئے زمین ہموار کر دی۔ کئی گواہ ایسے تھے کہ ان کی دُم پر پاؤں رکھا گیا تو وہ جھوٹی گواہی دینے پر آمادہ ہو گئے۔ مسعود محمود، سعید احمد خان، عبدالوکیل خان اور محمد اصغر عرف ہلاکو خان ایک نے اپنا ایمان بیچ دیا۔

اس سلسلے میں محمود علی خان چودھری (سابق آئی جی ڈائریکٹر انٹیلی جنس اور ہوم سیکرٹری پنجاب) کی بیان کردہ روایت بھی قابل ذکر ہے۔ ان کا بیان ہے کہ :-

"فوجی حکام نے عنانِ اقتدار سنبھالنے کے بعد تفتیش کیلئے یہ کیس ایف آئی اے کے ڈائریکٹر جنرل صغیر انور کے حوالے کیا۔ صغیر انور ایک پولیس افسر تھے اور ایک بار مسٹر بھٹو نے ناراض ہو کر انہیں معطل کر دیا تھا۔ وہ خاصا عرصہ معطل رہے۔ ملک میں نفاذِ مارشل لاء کے بعد وہ مسعود محمود کے جانشین بنے۔ انویسٹی گیشن کے بعد وہ فائل لیکر شریف الدین پیرزادہ کے پاس گئے کہ اس کیس کو قانونی نقطہ نظر سے چیک کر دیجئے آیا یہ مقدمہ کورٹ میں بھیجنے کے قابل ہے یا نہیں۔ انہوں نے وہ کیس اپنے ایڈیشنل سیکرٹری کرنل حسن کو دیدیا۔ کرنل حسن نے بغور جائزہ لینے کے بعد صغیر انور کو بتایا کہ یہ کوئی کیس نہیں بنتا۔ صغیر انور اس کیس کو لیکر ایم انور بار ایٹ لاء (کیپٹن سرور شہید نشانِ حیدر کے برادر بزرگ) کے پاس پہنچے۔ وہ بھی بھٹو کے ستائے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے یہ کیس ہو جائیگا۔ اس طرح یہ کیس سیشن کورٹ کی بجائے براہ راست ہائی کورٹ میں دائر کر دیا گیا"

"سیاسی لوگ' از علی سفیان آفاقی

صفحہ 76-75' اشاعت.....1990ء"

گواہوں کو سکھانے پڑھانے اور بریفنگ دینے کے سلسلہ میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے "دختر مشرق" میں انکشاف کیا ہے کہ "حکومت نے ظاہرداری اور دکھاوے کی حد تک بھی غیر جانبداری روا

www.bhutto.org

نہیں رکھی۔ ایک صبح میں عدالت میں آئی تو میں نے ایف ایس ایف کے ڈپٹی ڈائریکٹر عبدالخالق کو مختلف گواہوں کو بریف کرتے ہوئے سنا کہ انہیں عدالت میں کیا کہنا ہے۔ "یہ کیسا انصاف ہے؟" میں نے احتجاج کیا تو خالق نے پولیس کو حکم دیا "اسے یہاں سے لے جاؤ" پولیس میری طرف بڑھنا چاہتی تھی کہ میرے والد جیل سے پہنچ گئے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری درگت بنتی دیکھ کر پریشان ہوں' اس لئے خاموش ہو گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ استغاثہ نے عدالت کے قریب ہی ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ جہاں گواہی دینے والوں کی مناسب خاطر تواضع کا مکمل انتظام تھا اور وہاں ان کی شہادتوں کو نکھارنے کا کام انجام پاتا تھا۔"

تحقیقات میں عبدالخالق کا کردار

ایف آئی اے کے ڈائریکٹر عبدالخالق نے جولائی 77ء میں کیس کی تفتیش ملزموں کی گرفتاری اور گواہوں کو ترغیب و تحریص دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے تین ماتحتوں نے جو بیان دیئے صفائی کے نقطہ نظر سے وہ خاصے اہم تھے۔ عبدالخالق نے ان کے بیانوں کی تصدیق کرتے ہوئے عدالت کو بتایا۔ "اس کیس کی تمام تر تحقیقات میرے افسروں نے میری براہ راست نگرانی' ہدایات اور زیر کنٹرول کی تھی۔ میں نے ہی تمام ملزموں کو گرفتار کیا تھا"۔

خالق کے ماتحتوں میں سے ایک اسلم ساہی (گواہ استغاثہ نمبر 40) جنوری 1976ء میں ایف آئی اے میں انسپکٹر تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا تھا "مجھے تحقیقات و تفتیش کرنے کیلئے جو احکام دیئے جاتے ہیں میں ہمیشہ ان کی پابندی کرتا ہوں" اس بیان کی مشکوک تشریح کی جا سکتی تھی۔ بالکل ان پولیس افسروں کے بیانوں کی طرح جنہوں نے یہ کہا تھا کہ انہوں نے سعید احمد خان اور باجوہ کی ہدایات کے مطابق تحقیقات کی تھی۔ بھٹو کے حامیوں کا یہ کہنا درست تھا کہ گواہوں کی تیاری میں ترغیبات نے اہم کردار ادا کیا۔ اس بات کی تصدیق اپیل کی سماعت کے دوران بڑی تاخیر سے ہوئی اور وہ بھی عبدالخالق کے ہاتھوں بار شل لاء لگنے کے بعد اسے یہ فرض سونپا گیا تھا کہ ایف ایس ایف کی سرگرمیوں کے متعلق چھان بین کرے۔ اس حوالے سے وہ قتل کے مقدمہ تک پہنچا اور اس نے تمام ممکنہ ذرائع سے مقدمہ کو س کے منطقی انجام تک پہنچانے کی کوشش کی۔

انہی دنوں وکیل صفائی کے ہاتھ اس کا ایک ؛ لگا جو اس نے اپنے افسر اعلیٰ ڈائریکٹر ایف آئی اے کو لکھا تھا۔ اس خط کے ذریعے ایک خاص شخص ریاض احمد کی ایف آئی اے میں تقرری کی درخواست کی گئی تھی۔ وہ شریک ملزمان میں سے ایک افتخار رانا کا چھوٹا بھائی تھا۔ خالق نے اس کی بھرتی کی سفارش کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"افتخار احمد کی اعترافی شہادت حاصل کرنے میں اس کے بھائی ریاض احمد اور والد نے قابل قدر کام

www.bhutto.org

لیا ہے۔ باپ نے بڑے اخلاص سے صرف اپنے بیٹے ہی کو قابو کرنے میں ہماری مدد نہیں کی' بلکہ وہ دوسرے ملزموں پر بھی اثرانداز ہوا"

اس سفارش کی روشنی میں ریاض احمد کی تقرری کنفرم کر دی گئی حالانکہ وہ عمر کے مقررہ معیار سے کہیں بڑا تھا۔ جب شہادت کا یہ حصہ خالق کے سامنے رکھا گیا جو واضح طور پر بدعنوانی کی نشاندہی کرتا تھا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"ہاں لالچ اور ترغیبات دی گئی تھیں لیکن دوسری طرف سے اس سے بھی بڑی ترغیبات کی پیشکش کی گئی تھی"۔ صفائی نے اس سے انکار کیا کہ ایسی کسی بات کا ثبوت موجود نہیں ہے۔ یوں صفائی کو یہ واضح ثبوت مل گیا کہ جو آدمی تحقیقات کا انچارج تھا' اس نے ناجائز ذرائع استعمال کئے تھے۔

راؤ عبدالرشید کا بیانِ حلفی

استغاثہ کے گواہ کس طرح دباؤ ڈال کر تیار کئے گئے۔ اس کی تصدیق راؤ عبدالرشید کے اس بیان حلفی سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے اپریل 78ء میں سپریم کورٹ میں داخل کیا تھا۔ اس سلسلہ میں صفائی کے نزدیک یہ امر انتہائی مشکوک تھا کہ استغاثہ نے کارتوسوں میں ردّوبدل کی بابت جو کہانی گھڑی تھی' اس کے مرکزی کردار راؤ رشید کو (جو قتل کے زمانہ میں پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس تھے) بطور گواہ طلب نہیں کیا حالانکہ ردّوبدل کے سلسلہ میں میٹنگ انہی کے گھر ہوئی تھی۔ صرف ان کی شہادت سے ہی میٹنگ کی تصدیق ہو سکتی تھی۔ جون 78ء کے اوائل میں جب گواہوں کی شہادتیں پڑھی جا رہی تھیں' تو راؤ رشید کو پھر جیل بھیج دیا گیا۔ اُن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ان کی گواہی بھٹو کے حق میں ہو گی۔ سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت سے کچھ عرصے پہلے انہوں نے ایک بیان حلفی داخل کیا تھا جس میں صفائی کے اس موقف کی تائید کی گئی تھی کہ جو لوگ واقعات سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن پر شدید دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ سابق وزیراعظم کو ملزم قرار دیں۔ راؤ رشید کو بھٹو حکومت کا تختہ الٹتے ہی حراست میں لے لیا گیا تھا۔ ان دنوں وہ انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر تھے۔ جب لاہور ہائی کورٹ میں مقدمہ چل رہا تھا تو وہ 8 ماہ تک نظر بند رہے۔ رہائی کے بعد انہوں نے جو بیان حلفی دیا اس میں انہوں نے بڑی تفصیل سے لکھا تھا کہ فوجی حکام نے اُن کے ساتھ "چھری اور گاجر" والا سلوک کیا تھا۔ بعض اوقات اُن پر شدید دباؤ ڈالا جاتا اور بعض اوقات انہیں ملازمت پر بحالی کے علاوہ بیرون ملک سفارت کی پیشکش کی جاتی بشرطیکہ وہ بھٹو کے خلاف شہادت دینے پر تیار ہو جائیں۔

"میں جانتا ہوں مجھے سچ بولنے کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی"۔ انہوں نے اپنے بیان حلفی میں لکھا تھا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا فرض ہے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس بیان حلفی کو پیش کرنے کے بعد مجھے کن نتائج کا سامنا کرنا ہو گا"۔ یہ شہادت کے چند اجزاء میں سے ایک تھا جو بھٹو کی حمایت میں ریکارڈ پر تھے۔ صفائی

www.bhutto.org

کے گواہ کی حیثیت سے ان کا بیان ریکارڈ نہ ہونے پر یہ ان کی طرف سے اس کی تھوڑی سی تلافی تھی۔
تاہم 5 جون 78ء کو مارشل لاء ریگولیشن کے تحت ان کی دوبارہ گرفتاری کا واضح مطلب یہ تھا کہ ان پر زبردست دباؤ ڈالے جانے کے امکانات ابھی موجود ہیں تاکہ وہ اپنا بیان حلفی واپس لے لیں۔ مختلف اوقات میں یہ خبر بھی سننے میں آئی کہ ان پر اٹک کے قلعہ میں تشدد کیا گیا تھا۔ ان کی اہلیہ اور دختر کو بھی گھر میں نظر بند رکھا گیا لیکن ان کا بیان حلفی ریکارڈ پر موجود رہا اور انہوں نے اس میں کوئی تبدیلی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ راؤ رشید نے سچ پر قائم رہنے کی جو قیمت ادا کی بھٹو نے خود ان الفاظ میں اس کا اعتراف کیا تھا۔ "راؤ رشید جیسے بہادر آدمی بہت کم ہوتے ہیں۔" وہ اپیل کے خاتمہ یعنی دسمبر تک جیل میں رہے جب انہیں رہا کیا گیا اس وقت بھی انہوں نے چیف جسٹس کے نام ایک خط میں لکھا کہ وہ اب بھی اپنے بیان حلفی پر قائم ہیں۔ صفائی کو توقع تھی کہ اگر اضافی شہادتوں کی اجازت دی گئی تو انہیں بطور گواہ ضرور بلایا جائیگا۔ مگر ایسا کبھی نہ ہو سکا۔

جام صادق علی اور کھر کے بیاناتِ حلفی

گواہوں پر دباؤ کو ثابت کرنے کیلئے بھٹو کے حق میں راؤ رشید کے علاوہ کچھ اور بیان حلفی بھی داخل کئے گئے۔ ان میں سے ایک سندھ کے سابق وزیر جام صادق علی کا اور دوسرا پنجاب کے سابق گورنر غلام مصطفیٰ کھر کا تھا۔ ان میں کہا گیا تھا کہ ان پر فوجی حکومت کی طرف سے شدید دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ بھٹو کو مجرم قرار دیں' تاہم وہ دونوں لندن میں محفوظ تھے۔ جہاں وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے اور ان الزامات سے بچے ہوئے تھے جو ان پر لگائے جا رہے تھے اُن کا سوا خدہ وطن واپسی کی صورت میں ہو سکتا تھا۔ راؤ رشید کے مقابلہ میں انہیں بہت کم قیمت ادا کرنی پڑی۔

جنرل چشتی کی گواہی

جنرل ضیاء کی موت کے بعد ایک خبر شائع ہوئی کہ اعتراف کرنے والے شریک ملزموں میں سے ایک کی والدہ نے یہ انکشاف کیا کہ اُس کے بیٹے سے جان بخشی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کہانی کی تصدیق جسے شائع نہیں ہونے دیا گیا جنرل فیض علی چشتی کی یادداشتوں (Betrayals of Another kind مطبوعہ 1989ء) سے ہوتی ہے۔ چشتی لکھتے ہیں :-

"جب 4 اپریل 79ء کو مسٹر بھٹو کو پھانسی دیدی گئی تو اخبارات میں شور مچا کہ شریک ملزمان کو کیوں پھانسی نہیں دی گئی۔ جنرل ضیاء پر دباؤ بڑھ رہا تھا کہ وہ کوئی فیصلہ کریں۔ مارشل لاء ایڈ منسٹریٹرز اور کور کمانڈرز کی ایک میٹنگ میں جنرل سوار خان (گورنر پنجاب) نے جنرل ضیاء سے فیصلہ کے بارے میں پوچھا۔ جنرل ضیاء نے کہا چونکہ کوئی چارہ کار نہیں رہا اس لئے پھانسی دی جائیگی۔ میں نے جنرل ضیاء کو وعدہ یاد دلایا

www.bhutto.org

جو اس نے چاروں ملزموں سے کیا تھا کہ انہیں کچھ نہیں ہو گا۔ لیکن اس نے اپنے وعدہ کا پاس نہیں کیا۔ اعتراف کرنے والے ملزمان عدالت میں حاضر ہوتے تو وہ بالکل فٹ اور خوش و خرم نظر آتے۔ وہ ان آدمیوں کی طرح دکھائی نہیں دیتے تھے جو موت کی کوٹھڑیوں سے لائے جاتے ہیں"۔

کرنل رفیع الدین کا انکشاف

حال ہی میں راولپنڈی جیل کے سابق سپیشل سیکورٹی سپرنٹنڈنٹ کرنل رفیع الدین کی کتاب "بھٹو کے آخری 323 دن" جنگ پبلشرز لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ کرنل موصوف 17 مئی 78ء سے 4 اپریل 79ء تک بھٹو کی حفاظت اور سیکورٹی پر مامور رہے تھے۔ وہ بہت سی باتوں کے عینی شاہد ہیں اور بھٹو کیس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ مقدمہ کے شریک ملزمان کو گواہی پر آمادہ کرنے اور اس پر قائم رکھنے کیلئے فوجی حکام کو کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے۔ اس کے متعلق محولہ بالا کتاب سے ایک انکشاف افزا اقتباس نذرِ قارئین ہے۔

"آخر کار — اوائل جون 1978ء میں سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے مجھے بلایا اور کہا کہ کور کمانڈر صاحب (جنرل فیض علی چشتی) کافی متفکر ہیں کہ کہیں شریک ملزمان ہائی کورٹ میں بھٹو صاحب کے خلاف دیئے ہوئے بیانات سے منحرف نہ ہو جائیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ جنرل صاحب چاہتے ہیں کہ میں اُن سے جیل میں ملوں، اُن کے خیالات معلوم کروں اور اُن کی ڈھارس بندھواؤں کہ وہ اپنے بیانوں پر ثابت قدم رہیں اور اُن کو یقین دلاؤں کہ اگر وہ اپنی گواہی پر قائم رہے تو اُن کو ہرگز پھانسی نہیں لگنے دی جائیگی۔ اس کے ساتھ مجھے یہ بھی کہا گیا کہ کور کمانڈر صاحب چاہتے ہیں کہ اُن کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ اُن کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

ان چار شریک ملزمان میں سے غلام مصطفیٰ سپیشل سروس گروپ کے جوان تھے جنہوں نے میرے ہوتے ہوئے چراٹ میں سروس کی تھی۔ جب میں ان قیدیوں کی بیرک میں پہلی دفعہ گیا تو اُس نے مجھے پہچان لیا اور میرا نام لے کر مجھے خوش آمدید کہا۔ میں جب بھی اس بیرک میں جاتا تو غلام مصطفیٰ سے ضرور ملتا۔ اگرچہ وہ میری کمپنی کا تو نہیں تھا بلکہ ابراہیم کمپنی کا تھا لیکن ایس ایس جی کے ناطے ہمارا رشتہ ضرور تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ وہ قتل کے کیس میں کہاں تک ملوث ہے؟ اس نے جواب دیا "مجھے بھٹو صاحب کی شمولیت کا بالکل علم نہیں، ہمیں کہا گیا کہ ان کو ملوث کرنے سے ہم بچ جائیں گے"۔ اُس نے اپنی آنکھوں میں ایک خاص معنی خیز کیفیت لاتے ہوئے دھیمی آواز میں بتایا "مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اس کیس میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دیا جائے گا۔"

(بھٹو کے آخری 323 دن۔ از کرنل رفیع الدین
صفحہ 96۔ 95 جنگ پبلشرز اشاعت دوم دسمبر 91ء)

www.bhutto.org

ضیاء اپنے اصلی روپ میں

تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے ضیاء کیلئے اپنے اصل چہرہ کو چھپانا ناممکن بنا دیا۔ چند ہفتے بلکہ چند دن پہلے بھٹو کو عظیم سیاست دان اور محب وطن کہنے والے ضیاءؒ نے اپنے چہرہ سے نقاب اتار پھینکی اور اُٹھتے بیٹھتے بھٹو کو مطعون کرنا شروع کر دیا۔ اب اُسے بھٹو کی ذات میں سو برائیاں نظر آنے لگیں۔ وہ اپنی تقریروں، ٹی وی نشریوں اور اخباری بیانوں میں بھٹو کو "خائن، دھوکے باز، قاتل اور شیطان مجسم قرار دینے لگے۔ نمونہ کے طور پر تین انٹرویوز سے اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

نیویارک ٹائمز کو انٹرویو

6 ستمبر 77ء کو نیویارک ٹائمز کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے ضیاء نے کہا کہ "میں نے ذاتی طور پر بھٹو کی گرفتاری کا حکم دیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ہمارا لیڈر کس ٹائپ کا ہے۔ مسٹر بھٹو 1977ء کے مکیاولی اور شیطان مجسم تھے وہ ملک کو گستاپو کی طرز پر چلا رہے تھے۔ سرکاری فنڈز کا ناجائز استعمال کرتے رہے۔" انہوں نے مزید کہا کہ "مسٹر بھٹو کے ایک سیاسی قتل میں ملوث ہونے کی دستاویز میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے"

اُردو ڈائجسٹ کو انٹرویو

14 ستمبر کو ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (لاہور) کے ایڈیٹر الطاف حسن قریشی کو انٹرویو دیتے ہوئے ضیاء الحق نے بھٹو کو "دھوکے باز اور قاتل" قرار دیا اور کہا کہ فراہم شدہ ثبوت کے تحت وہ سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔

کیہان انٹرنیشنل کو انٹرویو

19 ستمبر کو تہران کے روزنامہ کیہان انٹرنیشنل سے گفتگو کرتے ضیاء نے کہا "بھٹو اور ان کے ساتھی سزا سے نہیں بچ سکتے۔ بھٹو نے اقتدار کی خاطر اپنے عزیز ترین دوستوں کو بھی قتل کرانے سے گریز نہیں کیا۔ بھٹو کے خلاف قتل کے 40 مقدمات ہیں۔ اگر سپریم کورٹ نے ان کی اپیل منظور کرتے ہوئے انہیں بری کر دیا تو انہیں مزید مقدمات کا سامنا کرنا ہو گا۔ بھٹو مکیاولی کی بھٹکی ہوئی روح اور قاتل ہیں۔"

چالان کی تکمیل اور کیس کی سماعت کا آغاز

بھٹو کے خلاف کیس کی تیاری اور سماعت کا آغاز کس سرعت سے کیا گیا اس کا اندازہ واقعات کی اس تیز رفتاری سے بخوبی کیا جا سکتا ہے.....

www.bhutto.org

5جولائی 77ء..... ملک میں مارشل لاء کا نفاذ

12جولائی..... جسٹس مشتاق حسین کی بحیثیت قائم مقام چیف جسٹس تقرری۔

14جولائی..... نواب محمد احمد خان کے کیس کی تفتیش کا آغاز۔

18جولائی..... غلام حسین کا اعترافِ جرم اور وعدہ معاف گواہ بننے کی درخواست۔

24جولائی..... ملزم ارشد اقبال کی ملتان سے گرفتاری۔

25جولائی..... ملزم افتخار رانا کو حراست میں لے لیا گیا۔

26جولائی..... ارشد اقبال اور رانا افتخار احمد کا لاہور کے علاقہ مجسٹریٹ ذوالفقار علی طور کی عدالت میں بیان اور اعترافِ جرم۔

30جولائی..... احمد رضا قصوری نے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر لاہور کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا۔

31جولائی..... (1) ایڈیشنل سیشن جج لاہور شیخ مظفر حسین کی عدالت میں مقدمہ کی سماعت، بیگم نواب محمد احمد خان نے بیان دیا کہ بھٹو کے سوا ہماری کسی سے دشمنی نہیں تھی۔

(2) میاں محمد عباس کو پکڑ لیا گیا۔ مسعود محمود کا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے نام 100 صفحات پر مشتمل مراسلہ کہ اسے _____ وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے تو وہ ایف ایس ایف کے سیاہ کارناموں کے بارے میں سب کچھ بتانے کو تیار ہے۔

3ستمبر..... لاڑکانہ سے بھٹو کی گرفتاری

12ستمبر..... بھٹو پر فرد جرم عائد کر دی گئی

13ستمبر..... بھٹو کی ضمانت پر رہائی

14ستمبر..... مقدمہ کی سماعت کیلئے فل بینچ کی تشکیل۔

15ستمبر..... جسٹس مشتاق حسین کو چیف الیکشن کمشنر بنا دیا گیا۔

16ستمبر..... مقدمہ کا چالان عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

17ستمبر..... بھٹو کو مارشل لاء ریگولیشن نمبر 12 کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

11اکتوبر..... ہائی کورٹ میں مقدمہ کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

چوتھا باب

ہائیکورٹ میں مقدمہ کی سماعت

مقدمہ کے بنیادی کوائف

عنوان

سرکار.........مستغیث

بنام.........

ذوالفقار علی بھٹو و دیگران......... ..ملزمان

نمبر.....فوجداری مقدمہ نمبر 60 لغایت 1977ء

حوالہ نمبر.....پی ایل ڈی 1978ء لاہور 523

سماعت کنندہ فل بینچ..... مشتاق حسین (چیف جسٹس) ذکی الدین پال، ایم ایس ایچ قریشی، آفتاب حسین اور گلباز خان۔

وکلائے استغاثہ...........ایم اے رحمان اور اعجاز حسین بٹالوی

وکلائے صفائی.....ڈی ایم اعوان، احسان قادر شاہ، عنایت اللہ اور مس طلعت یعقوب برائے مسئول الیہ نمبر 1

میاں قربان صادق اکرام برائے مسئول الیہ نمبر 2 ارشاد احمد قریشی، برائے مسئول الیہان نمبر 3 تا 5

www.bhutto.org

صدور فیصلہ کی تاریخ..... 18 مارچ 1978ء

یاد رہے کہ فیصلہ جسٹس آفتاب حسین نے لکھا تھا اور وہ متفقہ رائے سے صادر کیا گیا یعنی بینچ کے پانچوں جج اس سے متفق تھے۔

پانچوں ملزمان کے نام اور پتے

1..... ذوالفقار علی بھٹو ولد سر شاہنواز بھٹو ساکن المرتضیٰ۔ لاڑکانہ (سابق وزیر اعظم پاکستان)

2..... میاں محمد عباس ولد میاں عبدالحمید قوم راجپوت ساکن ٹھٹھی آرائیاں وزیر آباد (سابق ڈائریکٹر آپریشنز (ایف ایس ایف)

3..... غلام مصطفیٰ عرف جی ایم چودھری ولد کرم الٰہی قوم راجپوت ساکن چوک حبیب قاضیاں تھانہ گوجر خان، راولپنڈی۔ سابق انسپکٹر ایف ایس ایف لاہور۔

4..... ارشد اقبال ولد فضل الرحمٰن قوم کمبوہ ساکن اچھرہ لاہور۔ سابق سب انسپکٹر ایف ایس ایف۔ لاہور۔

5..... رانا افتخار احمد ولد رانا محمد صدیق قوم راجپوت، ساکن چک گ۔ ب/294 تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع فیصل آباد سابق اے ایس آئی ایف ایس ایف۔ راولپنڈی۔

شکایت کنندہ.....

احمد رضا خان قصوری ولد نواب ایم اے خان قوم پٹھان ساکن جے۔ 130 ماڈل ٹاؤن لاہور (سابق رکن قومی اسمبلی، پاکستان)

ہائی کورٹ میں سماعت کے قابلِ ذکر واقعات

ہائی کورٹ میں بھٹو پر نواب محمد احمد خان کے قتل کی سازش کا بانی، قاتل اور "بڑے ملزم" کی حیثیت سے مقدمہ چلایا گیا۔ استغاثہ نے حسبِ ذیل امور ثابت کرنے کیلئے ڈھیر ساری دستاویزات کے ساتھ ساتھ 41 گواہ پیش کئے۔ یاد رہے کہ شروع میں جو فہرست پیش کی گئی اس میں گواہوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی لیکن بعد میں خود استغاثہ نے اپنے ہی گواہوں کو بھگتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے کا نام بھی گواہانِ استغاثہ میں شامل تھا بعد میں استغاثہ نے یہ کہہ کر انہیں ترک کر دیا کہ وہ بھٹو سے مل گئے ہیں۔

(ا)..... بھٹو اور قصوری کے مابین کشیدہ تعلقات اور مخاصمت، جس کی بناء پر بھٹو نے 3 جون 74ء کو قومی اسمبلی کے فلور پر قصوری کو مذکورہ بالا دھمکی دی۔

(ب)..... قصوری کو قتل کرنے کیلئے بھٹو اور مسعود محمود کے مابین سازش اور اس میں غلام حسین سمیت دوسرے ملزمان کی شرکت۔

www.bhutto.org

(ج) ..... قصوری پر 24 اگست 74ء کو اسلام آباد میں اور 10 نومبر 74ء میں ہونے والے حملہ کے پیچھے بھٹو کا ہاتھ تھا۔

(د) ..... بھٹو اور اس کے ماتحتوں خصوصاً سعید احمد خان و عبدالحمید باجوہ کی طرف سے کئے گئے اقدامات تاکہ تفتیش کا رخ ایسی نہج پر ڈال دیا جائے کہ اصل ملزمان کا پتہ نہ چل سکے۔ نیز تفتیش میں وفاقی حکومت کے اعلیٰ افسران کی مداخلت' اور

(ح) ..... پولیس کی طرف سے وفاقی حکومت کے مذکورہ بالا حکام کے ایماء پر 75۔ 1974ء میں غلط ریکارڈ کی تیاری تاکہ مقدمہ کے سلسلہ میں اُس وقت کے وزیراعظم کو تحفظ فراہم کیا جاسکے۔

سابق وزیراعظم کیلئے یہ انتہائی دکھ اور صدمہ کی بات تھی کہ وہ اپنے آپ کو قتل کی سازش کے ایک مقدمہ میں پھنسا ہوا پا رہے تھے۔ لیکن اب مارشل لاء حکام کے ہاتھوں میں تھے اور اس بات پر مجبور تھے کہ ایک عام شہری کی طرح انصاف حاصل کریں۔ یہ کوئی نجی نوعیت کا مقدمہ نہیں تھا کیونکہ اس میں حکومت نے استغاثہ اور پراسیکیوٹر کا کردار ادا کیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے وہ اس اعتبار سے خاصے خوش قسمت واقع ہوئے کہ ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا گیا جو فوراً اُن کی قسمت کا فیصلہ کر دیتی تاہم انہوں نے خود کو جس عدالت میں اور جس بینچ کے روبرو پایا۔ اُس کی اپنی خامیاں تھیں۔ اُن کی بدقسمتی کا آغاز یوں ہوا کہ سماعت کنندہ بینچ کے سربراہ یعنی قائم مقام چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین ان کے ذاتی دشمن تھے۔ اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ بھٹو کو قتل کے مقدمہ میں ملوث کرنے اور سخت ترین سزا دینے میں مولوی مشتاق حسین کے ذاتی بغض و عناد کو بڑا دخل تھا۔ اِس لئے بھٹو نے ابتداء ہی سے عدالت کی کارروائی پر عدمِ اعتماد کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔

بھٹو کے ساتھ مولوی مشتاق کی مخاصمت کا اصل سبب

بھٹو کے ساتھ مولوی مشتاق حسین کی اَن بن اور مخاصمت کا آغاز کئی برس پیشتر ہوا تھا۔ 1963ء میں بھٹو وزیر خارجہ تھے اور مشتاق حسین وزارت قانون کے سیکرٹری تھے۔ ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران ان دونوں کے مابین کچھ غلط فہمی پیدا ہوئی اور ایک دوسرے کے خلاف دل میں گرہ پڑ گئی۔ پھر 1968ء میں ایوب خان کے حکم پر بھٹو کو قید کیا گیا تو نصرت بھٹو کی طرف سے دائر کردہ رٹ پیٹیشن پر بھٹو کو میانوالی جیل سے ساہیوال جیل منتقل کیا گیا۔ آخر میں انہیں لاہور کیمپ جیل پہنچا دیا گیا۔ جیل میں نظر بند بھٹو کی اس درخواست کی سماعت جسٹس مشتاق حسین نے کی۔ یہاں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ان کا رویہ سخت رہا اور نوبت تُو تکار تک پہنچی تاہم جج نے نظر بندی کو خلافِ قانون قرار دیتے ہوئے بھٹو کو ان کے حسبِ منشاء بذریعہ ٹرین لاہور سے ان کے آبائی گاؤں نوڈیرو (لاڑکانہ) تک پہنچایا۔ اس کے باوجود بھٹو یہ کہتے رہے کہ اس معاملہ میں مشتاق حسین کی کسی عنایت کا دخل نہیں تھا بلکہ

www.bhutto.org

یاد رہے کہ شیخ انوار الحق کی طرح مولوی مشتاق حسین کا تعلق بھی مشرقی پنجاب کے اُسی ضلع (جالندھر) سے تھا جہاں کے رہنے والے جنرل ضیاء الحق تھے۔ مصدقہ ذرائع کے مطابق شیخ انوار الحق کی بیوی مولوی مشتاق حسین کی منہ بولی بہن تھیں اور یوں دونوں میں پرانے اور قریبی تعلقات تھے۔ جنرل ضیاء کے قریب ترین رفقائے کار مثلاً جنرل چشتی' جنرل رحیم الدین' جنرل کے ایم عارف' جنرل اختر عبدالرحمٰن' جنرل مجیب الرحمٰن اور ان کے بھائی حاجی حبیب الرحمٰن (سابق آئی جی پنجاب) کا تعلق بھی ضلع جالندھر سے تھا۔ یوں سول اور فوجی بیوروکریسی میں "جالندھری ٹولہ" نے اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ جنرل ضیاء نے ہر حساس عہدہ کیلئے چُن چُن کر ایسے افراد کا انتخاب کیا جن کا تعلق ان کی جنم بھومی سے تھا۔ اس پر کراچی کے ایک ہفت روزہ نے طنز کرتے ہوئے زور دار کالم لکھا جس کا عنوان تھا۔ "جالندھر چلو' ورنہ اندر چلو"

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ضیاء کے دور میں مولوی مشتاق حسین کو سپریم کورٹ کا جج بنانے کی پیشکش کی گئی مگر اُنہوں نے لاہور ہائی کورٹ کا سینئر جج رہنے کو ترجیح دی۔ اُنہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ریٹائرمنٹ تک ہائی کورٹ میں رہیں گے۔ اُن کی دلی خواہش تھی کہ بھٹو کسی مقدمہ میں ماخوذ ہو کر ایک بار پھر اُن کی عدالت میں آئیں۔ اُنہیں "مائی لارڈ" کہہ کر پکاریں اور اُن سے انصاف کے طلب گار ہوں۔ وہ اس لمحے کی لذّت اور احساسِ تفاخر سے لطف اندوز ہونے کے خواہاں تھے۔ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ نفاذِ مارشل لاء کے فوراً بعد وہ گھڑی آ گئی جب بھٹو بحیثیت ملزم اُن کے سامنے پیش ہوئے اور مولوی مشتاق نے جی بھر کے اُن کی تذلیل و توہین کر کے اپنے احساسِ تفاخر کی تسکین کر لی یہ بات الگ ہے اس سے ہائی کورٹ کے فیصلہ کی حیثیت مشکوک ہو گئی اور لوگ اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرنے لگے اور بھٹو نے مقدمہ کی سماعت پر پہلے دن سے عدمِ اعتماد کا اظہار کرنا شروع کر دیا مولوی مشتاق کو اپنے نظر انداز کئے جانے کا کتنا رنج تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سماعت کے ابتدائی ایام میں ہی ایک دن چیف جسٹس وکیلِ صفائی کی کسی بات سے برہم ہوئے اور کہنے لگے "اگر کسی مفروضہ کیس میں آپ کو نظر انداز کر کے دوسرے کو فوقیت دیدی جائے تو تم کیسا محسوس کرو گے؟" یہ مفروضہ سوال ظاہر کرتا ہے کہ زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔

بھٹو کے خیال میں مولوی مشتاق دوسرے امور کی بناء پر بھی اس منصب کے اہل نہیں تھے۔ انہیں قائم مقام چیف جسٹس کے عہدہ کے ساتھ ساتھ 15 جولائی 77ء سے چیف الیکشن کمشنر کا اضافی منصب بھی سونپ دیا گیا تھا۔ جو کہ ایک انتظامی عہدہ تھا۔ یوں بیک وقت عدلیہ اور انتظامیہ کے دو عہدوں پر فائز ہونے کی بناء پر قانونی اور اخلاقی لحاظ سے وہ بھٹو کیس کی سماعت کے مجاز نہیں رہے تھے۔ یکم سے 3 اگست 77ء تک پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی (مجلس قائمہ) کا ایک اجلاس کراچی میں بھٹو کی زیرِ صدارت منعقد ہوا اس اجلاس میں پارٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے بھٹو نے مولوی مشتاق کی اس دوہری پوزیشن پر تنقید

www.bhutto.org

بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے ایوب خان کو اُن کی رہائی پر مجبور کر دیا تھا اور حکومت نے از خود ان کی نظر بندی کے احکام واپس لے لئے تھے۔ مقدمۂ قتل کی سماعت کے دوران ایک روز مشتاق حسین نے اپنی یہ نیکی جتائی کہ انہوں نے کیمپ جیل میں منصفانہ سماعت کی تھی تو بھٹو نے اعتراض کرتے ہوئے فوراً جواب دیا کہ میری رہائی منصفانہ سماعت یا کسی کی "نوازش" کے نتیجہ میں عمل میں نہیں آئی تھی بلکہ حالات سے مجبور ہو کر حکومت نے مجھے رہا کیا تھا۔

اُن کے باہمی تعلقات کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ گورنر کھر کے زمانہ میں گورنر ہاؤس کے گرد بنائی گئی دیوار میں کچھ بدعنوانیوں کی رپورٹ ہفت روزہ "چٹان" میں شائع ہوئی اور شورش کاشمیری نے اپنی تقریروں میں بھی ان بدعنوانیوں کا ذکر کیا اور اس کی مکمل رپورٹ سیکرٹری مواصلات نے شورش کاشمیری کو فراہم کی تھی۔ واقعہ کی عدالتی تحقیقات مولوی مشتاق حسین نے اپنی رپورٹ میں صحیح صورتِ حال واضح کر کے رپورٹ اسلام آباد پہنچ کر بھٹو کو پیش کر دی۔ بھٹو نے رپورٹ پڑھی تو وہ تحقیقاتی جج کی دیانت داری سے بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ انہیں جب بھی کوئی اچھا کام کرانا مقصود ہو گا مولوی مشتاق حسین کے سپرد کیا کریں گے۔ اس کے باوجود پہلے ان کے جونیئر سردار محمد اقبال کو ان پر ترجیح دی گئی اور سردار محمد اقبال کی ریٹائرمنٹ کے بعد دوسری بار مولوی صاحب کو نظرانداز کر کے جسٹس اسلم ریاض حسین کو لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا گیا تو مولوی صاحب حکومت کے اس فیصلہ سے سخت دل برداشتہ ہوئے۔ وہ طویل رخصت پر برطانیہ چلے گئے اور لندن سے 6 جولائی 77ء کو اُس وقت لوٹے جب بھٹو حکومت کی بساط لپیٹی جا چکی تھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "دراصل بھٹو مولوی مشتاق کی دیانت داری سے خائف تھے۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے انہوں نے مولوی صاحب کے بعض فیصلوں پر اثرانداز ہونے کی کوشش کر کے دیکھ لیا تھا کہ وہ دباؤ میں آ کر فیصلے نہیں کرتے"۔ بھٹو کے حامیوں کا خیال ہے کہ ترقیوں کے معاملے میں بھٹو کی اپنی پالیسی تھی۔ وہ سنیارٹی کی بجائے جسے زیادہ قابل اور بہتر سمجھتے اسے دوسروں پر فوقیت دیکر ترقی دے دیتے تھے۔ یہ سلوک صرف مولوی مشتاق کے ساتھ روا نہیں رکھا گیا بلکہ فوج کے کم از کم سات سینئر جرنیلوں کو نظرانداز کر کے جنرل ضیاء کو ان پر فوقیت دینے کا واقعہ اس کی زندہ مثال ہے۔ مولوی مشتاق کو ایک بار نہیں دو بار سپرسیڈ ( ) کیا گیا تھا۔ وہ لاہور ہائی کورٹ کے سینئر ترین جج تھے لیکن بھٹو نے انہیں چیف جسٹس بنایا نہ سپریم کورٹ کا جج۔ بھٹو نے یہ سب کچھ یحییٰ بختیار (اٹارنی جنرل) کے مشورہ پر کیا۔ بختیار کی رائے تھی کہ مولوی مشتاق سول جج بننے کے لائق بھی نہیں اور ہر وہ شخص جس نے بھٹو کے بارے میں ان کا فیصلہ پڑھا ہے وہ تسلیم کرے گا کہ یحییٰ بختیار کی رائے درست تھی۔ نئی حکومت نے 12 جولائی 77ء کو انہیں قائم مقام چیف جسٹس بنایا اور 15 جولائی کو چیف الیکشن کمشنر بھی مقرر کر دیا۔

www.bhutto.org

کی۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ چونکہ ان کی تقرری فوج نے کی ہے۔ اس لئے مولوی مشتاق کا یہ کہنا کہ پیپلز پارٹی نے مارچ کے انتخابات میں زبردست دھاندلی کی تھی۔ ثابت کرتا ہے کہ ان کا دل پی پی کے خلاف بغض وعناد سے خالی نہیں۔ انہیں قطعاً یقین نہیں تھا کہ اکتوبر کے مجوزہ انتخابات میں مولوی مشتاق غیر جانبدار رہ سکیں گے۔

پھر مارشل لاء کے ضابطہ نمبر 12 کے تحت ضمانت کی منسوخی اور دوبارہ گرفتاری کے بعد جب بھٹو کو لاہور لایا گیا اور انہیں پتہ چلا کہ ان کے خلاف مقدمہ کی سماعت ایسا بینچ کرے گا جس کا سربراہ مولوی مشتاق کو بنایا گیا ہے تو وہ سمجھ گئے تھے کہ مقدمہ کی سماعت منصفانہ نہیں ہوگی۔ اُنہوں نے اس حوالہ سے کئی درخواستیں دیں کہ قائم مقام چیف جسٹس بیک وقت دو عہدوں پر فائز ہیں اور وہ اُن کے خلاف عناد رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی ضمانت کی منسوخی کے خلاف بھی دلائل دیئے۔ اس موقع پر اُنہیں یقین دلایا گیا کہ ان کے وکیل کی معروضات ختم ہونے پر انہیں موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنی معروضات پیش کر سکیں۔ انہیں "گھنٹوں تک" بولنے کی اجازت دی جائیگی۔ لیکن جب وہ موقع آیا تو انہیں مطلع کیا گیا کہ وہ اپنی معروضات تحریری شکل میں پیش کر سکتے ہیں۔ بھٹو نے اسے کمتر درجہ کا نعم البدل خیال کیا۔ ان کی یہ شکایت کہ انہیں قائم مقام چیف جسٹس پر مطلق اعتماد نہیں درخواست کی صورت میں مسل کے ساتھ لگا لی گئی۔

مقدمہ کی باقاعدہ سماعت کا آغاز

مقدمہ کی باقاعدہ سماعت 11 اکتوبر 77ء سے شروع ہوئی عدالت کا کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سابق وزیر اعظم خوبصورت لباس پہنے ہوئے عدالت میں پیش ہوئے تو مولوی مشتاق نے اپنی اونچی پشت والی کرسی سے نیچی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ اُن کے دائیں بائیں دو دو جج بیٹھے تھے، جن کا انتخاب اُنہوں نے اپنی مرضی سے کیا تھا۔ اُن میں سے جسٹس آفتاب حسین کا جماعتِ اسلامی سے گہرا تعلق تھا۔ دوسرے جج ذکی الدین پال تھے۔ جنہوں نے ایک زمانہ میں بھٹو کی سیاسی مخالفت کی تھی۔ دوسرے دو جج ایس ایم ایچ قریشی اور گلباز خان سابقہ بیوروکریٹ تھے۔ چار کی بجائے پانچ ججوں پر مشتمل بینچ میں خود قائم مقام چیف جسٹس بھی شامل تھے۔

مقدمہ کی سماعت شروع ہوتے ہی پہلی بے قاعدگی یہ روا رکھی گئی کہ معمول کے مطابق کیس کی سماعت پہلے سیشن جج کی عدالت میں ہونی چاہیے تھی لیکن ایسا کرنے کی بجائے وہ کیس ہائی کورٹ کو دے دیا گیا۔ ہائی کورٹ کی طرف یوں جست لگانے کی کبھی کوئی وضاحت پیش نہیں کی گئی۔ یوں بھٹو کو سیشن کورٹ کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کے ایک حق سے محروم کر دیا گیا۔ ان شبہات اور خدشات کی بناء پر بھٹو کو ابتداء ہی میں یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ کارروائی کا بائیکاٹ کر دیں تاہم بھٹو نے ایسا نہیں کیا۔

www.bhutto.org

کارروائی کے پہلے دن قائم مقام چیف جسٹس نے چارج شیٹ پڑھ کر سنائی۔ بھٹو سے کہا گیا کہ وہ اٹھ کر کھڑے ہو جائیں اور توجہ سے سنیں یہ ایک ڈرامائی لمحہ تھا۔ فردِ جرم پڑھنے میں شاید دو منٹ صرف ہوئے ہوں گے۔ بھٹو نے جرم سے انکار کیا۔ اس کے بعد انہیں بیٹھنے کی اجازت دیدی گئی۔

گواہانِ استغاثہ کی شہادتیں

استغاثہ نے کارروائی کا آغاز بڑے اعتماد سے کیا۔ اسے جو الزامات ثابت کرنے تھے اُن میں سب سے اہم یہ تھا کہ سابق وزیراعظم کے بارے میں یہ ثابت کیا جائے کہ وہ احمد رضا قصوری کو قتل کرانے کا محرک اور جواز رکھتے تھے۔ استغاثہ کی طرف سے مسٹر قصوری پہلے گواہ کے طور پر پیش ہُوا۔ لمبا تڑنگا سیاہ کالے بالوں والا یہ آدمی جس نے بھڑک دار لباس پہن رکھا تھا پانچ دن تک گواہی کے کٹہرے میں کھڑا بھٹو کے خلاف زہریلے انداز میں یوں بولتا رہا جیسے وہ اپنی ہی آواز کی مستی سے سرشار ہو۔ اس نے اپنے اور بھٹو کے درمیان تعلقات کی مختصر تاریخ بیان کی۔ اس نے بھٹو پر پاکستان کو توڑنے کا الزام لگایا اور اُسے اقتدار کا بھوکا قرار دیا۔ اُس نے عدالت کو بتایا "میں نے 1973ء کے آئین پر اس لئے دستخط نہیں کئے تھے کہ نہ اس میں اسلام تھا نہ جمہوریت تھی اور نہ ہی وہ منصفانہ تھا"۔ اس کے بعد اُس نے 3 جون 74ء کو قومی اسمبلی میں پیش آنے والے ناخوشگوار واقعہ کا ذکر کیا۔ جس کے دوران بھٹو نے اسے ختم کرانے کی دھمکی دی تھی۔ پی پی پی میں اپنی دوبارہ شمولیت کے متعلق اُس نے وضاحت پیش کی کہ "میں نے سیاسی چال کے طور پر عارضی صلح کر لی تھی اور بھٹو کو تحسین آمیز خطوط لکھے تھے"۔

قصوری کی شہادت ریکارڈ ہو جانے کے بعد وکیل استغاثہ ایم انور بار ایٹ لاء نے کارروائی آگے بڑھاتے ہوئے دوسرے گواہوں کو پیش کیا۔ قصوری نے محض انگلی اُٹھائی اور الزام لگایا گیا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ اب مسعود محمود کی باری تھی کہ سازش کی مختلف کڑیوں کے مابین ربط پیدا کرے۔ وہ 9 دن تک بولتا رہا۔ وہ ٹھگنے قد کا کلین شیو آدمی تھا۔ اُس نے تفصیل سے اپنے ابتدائی کیریئر کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اسے دھمکیاں دی گئی تھیں کہ اگر اُس نے میاں عباس (ڈائریکٹر آپریشنز ایف ایس ایف) کے ذریعے قصوری کو قتل نہ کرایا تو اُس کے خاندان کو ختم کر دیا جائیگا۔ اس نے ایم آر ویلچ کے ذریعے کوئٹہ میں قصوری کو قتل کرانے کی داستان بھی خوب نمک مرچ لگا کر بیان کی۔

مسعود محمود گواہی کے کٹہرے سے نیچے اترا تو اس کی جگہ بھٹو کے چیف سیکورٹی افسر سعید احمد خان نے سنبھالی۔ وہ چھوٹے قد کا سیاہ اور فربہ آدمی تھا۔ اس کا بیان ابھی جاری تھا کہ استغاثہ کے سرکاری وکیل ایم انور 13 نومبر 77ء کو دل کا دورہ پڑنے سے جاں بحق ہو گئے۔ اُن کی جگہ اُن کے نائب اعجاز حسین بٹالوی کھڑے ہوئے انہیں اپنی وکالت پر بڑا ناز تھا اور ان کی آواز ایم انور سے بھی زیادہ بلند آہنگ تھی۔ استغاثہ کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ دوسرے گواہوں اور شہادتوں کے ذریعے یہ ثابت کیا جائے کہ قتل

www.bhutto.org

کی تفتیش مناسب انداز میں نہیں ہوئی اور وفاقی حکام نے اس میں مداخلت کی تھی۔ استغاثہ کی اس مشکل کو تیسرے گواہ سعید احمد خان نے اس طرح حل کیا کہ اس نے تفتیش میں مداخلت کرنے سابق وزیر اعظم کو بچانے کی خاطر اس کا رُخ غلط سمت پر ڈالنے شفیع الرحمٰن ٹریبونل کی کارروائی میں دلچسپی لینے اور اپنے ماتحت عبدالحمید باجوہ کے ذریعے مسز قصوری کو پی پی میں دوبارہ شمولیت کی ترغیب دینے کا اعتراف کر لیا اور اس کی یہ توجیہہ پیش کی کہ اسے وزیر اعظم کی طرف سے کیس کی دیکھ بھال کرنے کا حکم ملا تھا۔ استغاثہ جو کچھ کہلوانا چاہتا تھا سعید احمد خان نے اسی طرح گیت گایا تاکہ مسعود محمود کی شہادت کی تصدیق ہو سکے اور اس میں مطابقت پیدا کی جا سکے۔

چوتھا گواہ ایک طویل القامت اینگلو پاکستانی، ایم آر ویلچ (Mervyn Ruper Welch.) تھا۔ اُس کا بیان قلمبند کرنے میں ایک دن سے بھی کم وقت لگا۔ اُس نے کہا کہ وہ مسعود محمود سے زبانی اور ٹیلی فون پر دونوں طرح ہدایات وصول کرتا رہا۔ ایک ایسی ہی گفتگو سے جو مسٹر قصوری کے متعلق تھی اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قصوری کا صفایا کر دیا جائے۔ اُس نے اپنی گواہی میں تسلیم کیا کہ "میں سیاسی لیڈروں اور حکومت دشمن عناصر پر کڑی نظر رکھنے کے علاوہ اُن کی بابت انٹیلی جنس رپورٹیں بھی بھیجا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک قصوری بھی تھا۔"

ان چار گواہوں کی شہادت ریکارڈ پر آ جانے سے استغاثہ کے کیس کا تانا بانا بُنا گیا۔ بعد میں 35 گواہوں کی شہادتوں کا مقصد محض اس کہانی کو تقویت پہنچانا تھا۔ ان سب نے اس انداز میں گواہیاں قلمبند کرائیں جس سے استغاثہ کی کہانی کو استحکام حاصل ہوا۔ کئی پولیس والوں نے وقوعہ کے بارے میں جو بیانات دیئے وہ اکثر واقعاتی تھے اور وزیر اعظم کو کسی طور ملوث نہیں کرتے تھے۔

استغاثہ کے گواہ نمبر 12 محمد اصغر (سابق ایس ایس پی لاہور) نے بڑا طویل بیان دیا۔ اُس نے بطور خاص اس میٹنگ کا ذکر کیا جو راؤ عبدالرشید (تب آئی جی پنجاب) کے گھر پر ہوئی تھی جس میں مبینہ طور پر اسے کہا گیا تھا کہ قصوری کے والد کی لاش کو ہسپتال سے لا کر دفن کرا دے۔ محمد اصغر کو اس میٹنگ کے بارے میں بہت کچھ یاد تھا لیکن یہ اہم بات یاد نہیں تھی کہ اس نے اتنی اہم میٹنگ کا ذکر اپنے کسی سابقہ بیان میں کیا تھا یا نہیں۔ اُس نے تسلیم کیا کہ سعید احمد خان اور عبدالحمید باجوہ کی وجہ سے تفتیش و تحقیقات میں آزاد نہیں تھا۔ وہ اس بات پر سختی سے قائم رہا کہ پولیس وزیر اعظم سے پوچھ گچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی جبکہ اس کے خیال میں تحقیقات کا آغاز وہیں سے ہونا چاہئے تھا اس نے کہا "اندھے قتل" کی بناء پر یہ ضروری تھا کہ تفتیش کی ابتداء محرک اور جواز سے کی جاتی۔

اُس کے بیان میں بطور ضمیمہ اضافہ عبدالوکیل خان (سابق ڈی آئی جی لاہور رینج) نے کیا جس نے محمد اصغر کی شہادت کی تائید کرتے ہوئے سعید احمد خان اور عبدالحمید باجوہ کی مداخلت کی شکایت کی۔ اسے ایسی مداخلت پر اس وقت شک گزرا جب باجوہ نے یہ پوچھا تھا کہ ایف آئی آر میں وزیر اعظم کا نام کیوں

www.bhutto.org

شامل کیا گیا اور مشورہ دیا کہ اسے حیلے بہانے نظر انداز کیا جا سکتا تھا اُس نے چلے ہوئے کارتوس باجوہ کو اس لئے نہیں دیئے کیونکہ اسے "شبہ" تھا کہ باجوہ کا تعلق ایف ایس ایف سے ہے۔ وہ اس معاملے میں دست درازی کرے گا۔ بعد میں استغاثہ نے ثابت کیا کہ سعید احمد خان باجوہ اور ایف ایس ایف کے مابین واحد تعلق وزیر اعظم کی ذات تھی جبکہ اصغر کے بیان سے یہ ظاہر ہوا کہ وزیر اعظم سے ہٹ کر بھی ان میں کئی طرح کا قریبی تعاون و اشتراک موجود تھا۔

عبدالوکیل خان نے جو کچھ کہا اس کا زیادہ تر حصہ سنی سنائی باتوں پر مبنی تھا یعنی ایسی باتیں جو اسے دوسروں نے بتائی تھیں۔ اس نے بتایا کہ ایک ڈی ایس پی عبدالحمید کیس کی نگرانی پر مامور رہا جو فوت ہو چکا ہے۔ کچھ باتیں عبدالحمید باجوہ سے سُنی تھیں وہ بھی اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ وکیل خان کی شہادت کا بیشتر حصہ ان دونوں "مُردہ" گواہوں کی بتائی ہوئی باتوں پر مشتمل تھا۔

وکیل خان نے بھی راؤ رشید کے گھر میں ہونے والی میٹنگ کا ذکر کیا لیکن اصغر کے برعکس اُس نے بتایا کہ میں اس اجلاس میں شریک نہیں ہوا تھا۔ بہت سے نکات اُسے بالکل یاد نہ تھے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ ۱۱ نومبر ۷۴ء کو وہ کہاں تھا۔ جب مختلف گفتگوؤں کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے قدرے بے رخی سے جواب دیا "میں روزمرہ واقعات کی ڈائری نہیں رکھتا" اس کے باوجود اس کا بیان اصغر کی تائید و مطابقت میں سمجھا گیا۔ دوسرے پولیس افسروں نے جو کچھ بتایا اسے بھی استغاثہ کے کیس کیلئے موافق قرار دیا گیا۔

استغاثہ کے گواہ نمبر 14 محمد وارث نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو کی حیثیت سے تفتیش میں حصہ لیا تھا۔ اس نے بھی شکایت کی کہ سعید احمد خان نے تحقیقات پر کلیتاً کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ سعید احمد خان اور باجوہ نے اسے سمجھایا تھا کہ ابتدائی رپورٹ میں وزیر اعظم کا نام درج ہو گیا ہے اس لئے احتیاط سے کارروائی کی جائے۔ اس نے ایسی کئی میٹنگوں کا حوالہ دیا جو سعید احمد خان کے حکم پر طلب کی گئیں اور ان میں اس نے تحقیقات کے بارے میں ہدایات دیں۔ اُس نے مزید بتایا کہ قصوری کے خاندانی تنازعات کے متعلق بھی چھان بین کی گئی تھی۔ یکم اکتوبر 75ء کو سراغ نہ ملنے کی بناء پر اس کیس کو داخل دفتر کر دیا گیا۔ اُس نے کہا کہ وہ تفتیش سے مطمئن نہیں تھا کیونکہ اس میں ایف ایس ایف کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ استغاثہ کے نقطہ نظر سے اس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ ایف ایس ایف نے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی تھی۔

تین دوسرے پولیس اہل کاروں نے جو گواہی دی اس کا تعلق اس بات سے تھا کہ چلے ہوئے کارتوسوں کا پیکٹ کس وقت کس کے سپرد کیا گیا۔ اس پارسل کو مہر بند کرنے میں جو تاخیر ہوئی اس سے استغاثہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان کارتوسوں کو بدلا گیا تھا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 19 ڈرائیور غلام حسین چونکہ ان پڑھ تھا اس لئے وہ اُن اندراجات کو پڑھنے سے

www.bhutto.org

قاصر تھا جو اس سلسلے میں جیپ کی لاگ بک میں درج تھے کہ وہ جیپ کب نکالی گئی جس کی بابت استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ وہ قتل کی واردات میں استعمال ہوئی تھی۔ صفائی کا موقف یہ تھا کہ لاگ بک کے اندراجات سے استغاثہ کے کیس کے تضادات ظاہر ہوتے ہیں۔

بیسواں گواہ امیر باد شاہ ایف ایس ایف میں انسپکٹر رہ چکا تھا۔ اُس نے اپنی گواہی میں تسلیم کیا کہ اُس نے ملزم غلام مصطفیٰ کو اسلحہ جاری کیا تھا۔ اس ملزم کا قاتلانہ حملے میں محض اتنا کردار تھا کہ اس نے اسلحہ دیا اور اس کی رسید کی تصدیق کی۔ امیر باد شاہ کی شہادت کے مطابق میاں عباس نے اسے ستمبر 74ء میں فون پر ہدایت کی تھی کہ رجسٹر میں اندراج کئے بغیر مصطفیٰ کو اسلحہ اور گولہ بارود فراہم کرے۔ اُس نے اپنے بیان میں کہا "میں نے غلام مصطفیٰ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اسلحہ کس مقصد کیلئے درکار ہے"

استغاثہ کا 24واں گواہ ایف ایس ایف کے اسلحہ خانہ کا انچارج فضل علی تھا۔ اس نے بتایا کہ اگست 74ء میں میاں عباس کے حکم پر غلام حسین کو ہتھیار اور ایمونیشن جاری کیا تھا۔ یہ گولہ بارود اندراج کئے بغیر محض رسید لیکر جاری کیا گیا تھا۔ کیونکہ میاں عباس نے ایسی ہی ہدایات دی تھیں "جب میں نے قواعد وضوابط پورا کئے بغیر اسلحہ دینے سے انکار کیا تو میاں عباس مجھ پر خوب گرجا برسا۔ اس سے پہلے میں نے 9 مئی 74ء کو 1500 روند (گولیاں) غلام حسین کو دیئے تھے"۔ اس نے اپنا بیان ان الفاظ پر ختم کیا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اسلحہ مجرمانہ واردات میں استعمال کیلئے حاصل کیا جارہا ہے تو میں ان رسیدوں کی فوٹو سٹیٹ ضرور محفوظ کر لیتا کیونکہ وہ رسیدیں مجھ سے لے لی گئی تھیں۔ میرا تاثر یہ تھا کہ ہتھیار اور ایمونیشن کسی خاص ڈیوٹی کیلئے لیا جارہا ہے"۔

دریں اثناء مسعود محمود کے ڈرائیور منظور حسین نے بھی گواہ استغاثہ نمبر 21 کی حیثیت سے شہادت قلمبند کرائی۔ اُس نے جو کچھ بتایا وہ اُس روز کے واقعات کی بابت مسعود محمود کے بیان سے بہت مختلف تھا بعد میں اس تضاد بیانی کو صفائی نے اپنے حق میں خوب استعمال کیا۔

ان گواہوں کے بیانات صبح کا سیشن ختم ہونے سے پہلے مکمل ہو گئے۔ وعدہ معاف گواہ غلام حسین نے اپنا بیان سات دنوں میں مکمل کیا پہلا حصہ چار دنوں میں، دوسرا حصہ کرسمس کی تعطیلات کے بعد تین دنوں میں اختتام کو پہنچا۔ غلام حسین کے بیان کے مطابق وہ میاں عباس کے احکام کے تحت کام کر رہا تھا کہ قصوری کو ٹھکانے لگایا جائے۔ وہ خود اس گھناؤنے جرم میں شامل ہونے پر رضامند نہیں تھا لیکن اگر ایسا نہ کرتا تو اس کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔

"میں اپنے خاندان کی کفالت کیلئے ایف ایس ایف میں بھرتی ہوا تھا اور میں اس جرم کے ارتکاب کیلئے قطعاً تیار نہیں تھا"

اُس نے اپنے بیان میں کہا۔

www.bhutto.org

غلام حسین نے قصوری پر دو حملے کرائے ایک اسلام آباد میں اور دوسرا لاہور میں لیکن اس کی دونوں کوششیں ناکام رہیں۔ "میں نے عین موقع پر فیصلہ کر لیا تھا کہ میں قصوری کو قتل نہیں کروں گا اس لئے ہوا میں فائرنگ کرتا رہا" اس نے اپنی گواہی میں بتایا اُس نے مزید انکشاف کیا۔ اُس کی اپنی زندگی خطرے میں تھی کیونکہ اُسے اپنے "پرائیویٹ ذرائع" سے پتہ چل گیا تھا کہ میاں عباس نے ایک دوسری ٹیم کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ اگر وہ مطلوبہ کام نہ کرے تو اسے ختم کر دیا جائے۔ اسلحہ کی فراہمی کے بارے میں اس نے فضل علی کی تائید کی جس سے ثابت ہوا کہ 9 مئی 74ء کو اسے جو 1500 روند دیئے گئے تھے ان میں سے 30 روند لاہور میں اور 7 اسلام آباد میں فائر کئے گئے۔ یوں کل میں سے 51 خول کم تھے باقی ٹریننگ کے دوران کم ہو گئے تھے۔

وقوعہ لاہور کے بارے میں اس کی روایت یہ تھی کہ وہ خود ایک قریبی تنگ گلی میں اوپر نیچے ٹہلتا رہا۔ اس شریک ملزم نے شروع میں یہ بھی کہا تھا کہ پہلا شاٹ خود اس نے اپنے پستول سے فائر کیا تھا۔ غلام حسین نے لیاقت اور ظہیر کا نام بھی لیا جو اس کے گروپ میں قصوری کے قتل کیلئے مامور کئے گئے تھے اور یہ کہ وقوعہ کے وقت لیاقت موقع پر موجود تھا۔ اس نے زور دے کر یہ بات کہی۔

"مجھے معلوم تھا کہ میاں عباس کے وزیر اعظم کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ مجھے جو بھی احکام ملے۔ وہ میاں عباس کی طرف سے دیئے گئے تھے"

مجسٹریٹ ذوالفقار علی طور کے سامنے اس نے جو ابتدائی بیان دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں اپنی گواہی میں اُس نے کہیں زیادہ معلومات فراہم کیں۔ اُس نے اپنی شہادت کا اختتام ان الفاظ پر کیا۔

"قصوری کے ساتھ میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی' میں تو اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ اسلام آباد اور لاہور میں اس پر جو فائرنگ کی گئی وہ دباؤ اور ترغیب کا نتیجہ تھی"۔ آخر میں اس نے یہ عذر بھی پیش کیا۔

"جب میاں عباس کو وعدہ معاف گواہ بننے سے متعلق میری درخواست کا پتہ چلا تو اس نے ایک قیدی کے ذریعے مجھے پیغام بھجوایا کہ اگر میری درخواست قبول کر لی جائے اور مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے تو مجھے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ اُسے بھی معافی مل جائے۔ چونکہ اُس نے مجھ سے مدد کی درخواست کی تھی اس لئے میں نے اپنا بیان اس طرح دیا کہ وہ اس معاملہ میں کم سے کم پھنسے"

استغاثہ کے 34 ویں گواہ عبدالحئی نیازی نے بھی جو وقوعہ کی رات کو ایس ایچ او تھانہ اچھرہ کی حیثیت سے ڈیوٹی پر تھا ایک بار پھر پہلے گواہوں کے بیانات کی تائید کی جنہوں نے یہ کہا تھا کہ وہ تفتیش و تحقیقات میں آزاد نہیں تھے۔ اُس نے بتایا

"حالات ایسے تھے کہ نہ تو میں کیس کی تحقیقات کر سکتا تھا نہ ہی اپنی مرضی سے کوئی بیان دے سکتا تھا۔ میں نے پولیس کے دو اہل کاروں محمد بشیر (گواہ استغاثہ نمبر 8) اور عبدالعزیز (گواہ استغاثہ نمبر 11) کے ساتھ ابتدائی مراحل میں تفتیش کی تھی۔ باجوہ اور ڈی ایس پی عبدالاحد نے مجھے ہدایات دی تھیں' باجوہ نے

www.bhutto.org

مجھے ذرا یاد دھکا یا اور دباؤ بھی ڈالا تھا"

نیازی نے بھی 11 نومبر راؤ رشید کے گھر ہونے والی میٹنگ کا ذکر کیا حالانکہ اس نے پہلے بیان میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ استغاثہ کے ایماء پر راؤ رشید کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے کبھی طلب نہیں کیا گیا تاکہ اس بات کی تصدیق کرائی جا سکتی کہ جس مبینہ میٹنگ کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔ وہ وزیر اعظم کے مفادات کا تحفظ کرنے کیلئے بلائی گئی تھی یا کسی اور مقصد سے اور یہ کہ آیا کوئی ایسی میٹنگ ہوئی بھی تھی یا نہیں۔

عبدالحئی نیازی اور ماہرِ اسلحہ کی شہادتیں

اُس نے عدالت کو یہ بھی بتایا کہ قتل کے بعد جائے واردات سے برآمد کردہ اشیاء کی فہرست کا مسودہ ایوانِ وزیر اعظم سے موصول ہوا تھا جو اصل فہرست سے مختلف تھا۔ اگر میں اس مسودہ کے مطابق عمل نہ کرتا تو میرے خلاف جھوٹے مقدمات بنا دیئے جاتے۔ اصل فہرست اس لئے تیار نہیں کی گئی تھی کہ قتل میں مسٹر بھٹو کا نام ملوث تھا۔ کسی وکیل صفائی نے جرح نہیں کی۔ خود مسٹر بھٹو نے بھی جرح کرنے سے انکار کر دیا۔ سماعت کے دوران ماہر اسلحہ نادر حسین عابدی نے گواہی دی کہ قتل کے بعد برآمد شدہ اشیاء اُس کے سامنے سربمہر نہیں کی گئی تھیں۔

اس کے بعد جو گواہ پیش ہوئے اُن میں بیشتر کا تعلق ایف آئی اے سے تھا۔ جنہوں نے فوج کے برسر اقتدار آنے کے بعد از سرِ نو تحقیقات کی تھی۔ گواہ نمبر 19 انسپکٹر محمد یونا نے بیان دیا کہ "ساری تحقیقات عبدالخالق (ڈپٹی ڈائریکٹر ایف آئی اے) کے زیرِ نگرانی کی گئی تھی" عبدالخالق خود بھی آخری گواہ کے طور پر پیش ہوا۔

ان تمام گواہوں نے بڑی شدت کے ساتھ اس بات سے انکار کیا کہ ملزمان پر کسی قسم کا تشدد کیا گیا تھا، یا اُن پر کوئی دباؤ ڈالا گیا تھا۔ البتہ مجسٹریٹ ذوالفقار علی طور (گواہ استغاثہ نمبر 10) نے اپنے بیان میں تسلیم کیا کہ اُس نے ملزمان سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ دباؤ کے تحت بیان دے رہے ہیں یا رضا کارانہ طور پر بیان قلمبند کرا رہے ہیں یہ ہی ان سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں اور کس مقصد کیلئے بیان دے رہے ہیں۔ اُس نے محض وہ سب کچھ قلمبند کر لیا جو اُنہوں نے بتایا تھا۔

میاں عباس کا اپنے بیان سے انحراف

یوں اکتالیس گواہوں کی شہادت مکمل ہو گئی جن میں دو وعدہ معاف گواہ اور چار شریک ملزم شامل تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا۔ صرف ایک وزیر اعظم تھے جو آخر تک اپنی بے گناہی پر ڈٹے رہے۔ ایک شریک ملزم میاں محمد عباس سماعت کے پہلے دن ہی اپنے اعترافی بیان سے منحرف ہو

www.bhutto.org

گیا اور اب تک اس پر قائم تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ اس سے جس بیجا تشدد اور جبر کے ذریعے اقبال جرم کرایا گیا تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ اُسے اور دوسروں کو بہلایا پھسلایا گیا اور دھمکیاں دی گئیں اور اس بات کی پیشکش کی گئی کہ اگر وہ ایسے بیان دے دیں تو انہیں معافی مل جائیگی۔ اگر میاں عباس کے اس بیان کو درست مان لیا جائے تو یہ نتیجہ اَخذ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ دوسروں نے بھی شاید سب کچھ ایسے ہی جبر اور تشدد کے تحت کیا تھا۔

بھٹو کی علالت اور عدالت میں حاضر ہونے سے معذوری

استغاثہ اپنے گواہوں کی شہادتیں قلمبند کروانے میں نصف مرحلہ طے کر چکا تھا۔ نومبر کا دوسرا ہفتہ تھا کہ بھٹو اچانک بیمار پڑ گئے۔ وہ تیز بخار' شدید انفلوئنزا سانس کی تکلیف اور ضعف و نقاہت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ 13 نومبر کو عدالت میں حاضر نہیں ہو سکے اور عدالت 15 نومبر تک ملتوی کر دی گئی۔ بھٹو 15 نومبر کو بھی پیش نہیں ہو سکے۔ اس روز پروفیسر افتخار احمد سیکرٹری محکمہ صحت حکومت پنجاب نے بھٹو کا معائنہ کیا اور تصدیق کی کہ بھٹو واقعی علیل ہیں۔ انہیں شدید انفلوئنزا' بخار' نقاہت کے علاوہ ناک اور سانس کی تکلیف ہے۔ بھٹو کے وکیل مسٹر اعوان نے درخواست پیش کی کہ جب تک ان کا موکل صحت یاب نہیں ہو جاتا سماعت ملتوی کر دی جائے لیکن اُن کی یہ استدعا مسترد کر دی گئی۔ عدالت نے انہیں حکم دیا کہ وہ گواہ سعید احمد خان پر جرح کریں اور اس سلسلے میں اپنے موکل سے ہدایات حاصل کر لیں۔ بھٹو کئی دن تک بیمار رہے انہیں کوٹ لکھپت جیل سے عدالت میں نہیں لایا گیا تاہم سماعت ان کی غیر حاضری میں جاری رہی۔

25 نومبر کو بھٹو نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو خط لکھا کہ اب وہ پہلے سے بہتر ہیں تاہم عدالت میں مسلسل پانچ گھنٹوں تک حاضری نہیں دے سکتے۔ 26 نومبر کو مزید گواہی کیلئے قصوری کو دوبارہ طلب کیا گیا۔ وکیل صفائی نے اعتراض کیا کہ بھٹو کی عدم موجودگی میں اُس پر جرح کرنا مشکل ہو گا۔ اعتراض مسترد کر دیا گیا۔ 27 نومبر کو استغاثہ نے عدالت کو بتایا کہ بھٹو نے میڈیکل بورڈ سے اس لئے معائنہ کرانے سے انکار کر دیا ہے کہ وہ کسی عضویاتی مرض میں مبتلا نہیں۔ انہیں محض چند دن آرام کی ضرورت ہے اس موقع پر وکیل صفائی نے عدالت کو مطلع کیا کہ ان کا موکل 3 دسمبر تک عدالت میں حاضری کے قابل ہو سکے گا۔ یوں بھٹو کی غیر حاضری (77-11-13 تا 77-11-30) میں 15 گواہوں کی شہادتیں اور ان پر جرح قلمبند کی گئی۔ تین ہفتوں تک عدالت سے غیر حاضر رہنے کے بعد 7 دسمبر کو عدالت میں آئے لیکن 14 دسمبر کو دوبارہ علیل ہو گئے۔ عدالتی کارروائی اُن کی عدم موجودگی میں جاری رہی۔ 15 دسمبر کو ان کا گلا شدید خراب تھا اور کولیٹس کی شکایت بھی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے کارروائی میں حصہ لیا۔

www.bhutto.org

17 - دسمبر کا ناخوشگوار واقعہ

بھٹو کو اپنی بیگم اور بیٹی سے ملاقات کی شدید اور فطری خواہش تھی لیکن مولوی مشتاق نے اس سلسلے میں زیادہ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ ماں بیٹی دونوں عدالت کی کارروائی میں حاضر ہوتی تھیں۔ ابتداء میں وقفہ کے دوران انہیں بھٹو کے ساتھ چائے پینے کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن ایک ہی ہفتہ بعد یہ رعایت واپس لے لی گئی۔ 16 دسمبر 77ء کو بیگم بھٹو اور بے نظیر قذافی سٹیڈیم میں کرکٹ میچ دیکھنے گئیں۔ تماشائیوں نے جیل میں قید اپنے محبوب رہنماء کی حمایت کا اظہار کرتے ہوئے زور شور سے نعرے لگائے۔ " جئے بھٹو جئے بھٹو "۔ اس پر گڑبڑ پیدا ہو گئی، انتشار وابتری پھیل گئی۔ پولیس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں نصرت بھٹو اور بے نظیر دونوں زخمی ہو گئیں۔ بیٹی کے کندھے پر چوٹ آئی جبکہ ماں کے سر پر ضرب لگی۔ انہیں ہسپتال جا کر آپریشن کرانا پڑا۔ بھٹو نے اس حادثہ کی خبر سنی تو ان کا پریشان ہونا فطری امر تھا۔ وہ اس سلسلہ میں تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کیلئے بے چین تھے۔ وہ اپنے وکیل سے دور ایک کٹہرے میں بیٹھے تھے اور اپنے وکیل کے ذریعے عدالت سے یہ درخواست کرنا چاہتے تھے کہ عدالت ساعت کا سلسلہ جاری رکھے تاکہ وہ گیارہ بجے (وقفہ کے دوران) ضروری خبریں حاصل کر سکیں جبکہ چیف جسٹس نے اس دن بطور خاص یہ کہا کہ عدالت ساڑھے دس بجے برخاست کر دی جائیگی اور گیارہ بجے پھر ساعت شروع ہو گی۔ مسٹر بھٹو اپنی پوری کوشش کے باوجود اپنے وکیل کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکے۔ مسٹر اعوان چونکہ بھٹو کی بات نہیں سمجھ سکے تھے اس لئے وہ عدالت تک اُن کی درخواست نہیں پہنچا سکے۔۔ جب عدالت اٹھنے والی تھی تو بھٹو نے اپنے غصہ کا اظہار اپنے وکیل پر ان الفاظ میں کیا " "Damn it" " (اس پر لعنت بھیجو) ان کی آواز بڑی واضح اور سنائی دینے والی تھی۔ جسے چیف جسٹس نے سن لیا۔ مولوی مشتاق نے اس پر سخت اعتراض کرتے ہوئے بھٹو کو ڈانٹ پلائی کہ عدالت میں ایسے سخت الفاظ کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ بھٹو نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ کل کے حادثہ کی وجہ سے انتہائی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ قائم مقام چیف جسٹس نے پلٹ کر سختی سے جواب دیا "ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں"۔ یہ تو تکار ختم نہ ہو سکی۔ بھٹو جو جانتے تھے کہ ساری اہانت اور ذلت صرف ان کیلئے ہے۔ وہ پھٹ پڑے "بس میرے ساتھ بہت ہو چکا"

"کیا! بہت ہو چکا؟" چیف جسٹس نے سوال کیا

" آپ کی طرف سے اہانت اور تذلیل"۔ بھٹو نے برجستہ جواب دیا۔ یہ بات چیف جسٹس کو مشتعل کرنے کیلئے کافی تھی۔ انہوں نے پولیس افسروں کو حکم دیا کہ " جب تک اس آدمی کے ہوش ٹھکانے نہیں آتے 'اسے یہاں سے لے جاؤ" اس پر ججوں میں سے ایک نے کہا

"اس کا رویہ ٹھیک نہیں ہے ہم یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ خود کو سابق وزیر اعظم سمجھتا ہے لیکن ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں"

اس روز کی باقی ماندہ ساعت میں بھٹو کو عدالت میں آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چیف جسٹس نے حکم صادر کر دیا تھا کہ بھٹو اس قابل نہیں کہ عدالت میں کارروائی سُن سکے۔

عدالتِ عالیہ کی تجویز (Findings.)

پیش کردہ ساری شہادتوں اور دستاویزات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ہائی کورٹ نے قرار دیا کہ:۔

"استغاثہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ بھٹو کے قصوری کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے جو اس محرک کی بنیاد بنے کہ اُسے ختم کر دیا جائے۔

یہ کہ بھٹو نے مسعود محمود کے ساتھ سازش میں شرکت کی' اس منصوبے میں مختلف مراحل پر دوسرے ملزمان شریک ہو گئے تاکہ وعدہ معاف گواہ غلام حسین کے ساتھ مل کر اس مشن کو مکمل کر سکیں۔

یہ کہ اسلام آباد میں قصوری پر جو حملہ کیا گیا' وہ اسی آپریشن کا حصہ تھا۔ یہ کہ لاہور میں ہونے والا حملہ جس میں قصوری کا باپ مارا گیا اسی سازش کی ایک کڑی تھی۔

یہ کہ مقدمہ کی ابتدائی تفتیش دیانت داری سے نہیں کی گئی مختلف مراحل پر تحقیقات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی گئی تاکہ اصل مجرم بے نقاب نہ ہونے پائیں۔

یہ کہ ریکارڈ پر خاصی واقعاتی اور دستاویزی شہادت لائی گئی ہے جس سے وعدہ معاف گواہوں مسعود محمود اور غلام حسین کے بیانات پر یقین کرنے کیلئے ضروری تائید و حمایت میسر آئی ہے۔

یہ کہ ارشد اقبال' افتخار رانا اور غلام مصطفیٰ مقدمہ کی پوری سماعت کے دوران اپنے اقبالی بیانات پر قائم رہے۔

عدالت عالیہ نے آخر میں اس رائے کا اظہار کیا کہ واقعات ملزمان کے حق میں جرم کی سنگینی کو کم اور سزا میں تخفیف کرنے والے نہیں کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو ملک کا وزیراعظم تھا اور اس حیثیت میں پاکستان کے شہریوں کی جان و مال کا تحفظ کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ چہ جائیکہ وہ ایف ایس ایف کے ذریعے اپنے مخالفین کو قتل کراتا۔ یہ کہ دیگر چاروں ملزمان کیلئے اپنے حکام بالا کے ناجائز احکام کی بجا آوری لازمی نہیں تھی اور اس قسم کا عُذر قانون کی نظر میں کوئی معقول جواز نہیں بنتا۔"

عدالت کا فیصلہ

پیرا 618..... تمام الزامات جو ملزمان پر لگائے گئے تھے پوری طرح ثابت ہو گئے ہیں یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کی سازش نواب محمد احمد خان کے قتل پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہی کیونکہ قصوری کے قتل کا مشن پورا نہیں ہوا تھا۔ سازش کی سزا پر دفعہ 120 (ب)

www.bhutto.org

پڑھے بشمول دفعہ 115 ضابطہ فوجداری کا اطلاق ہوتا ہے۔

پیرا 619..... میں ملزمان ذوالفقار علی بھٹو' میاں محمد عباس اور غلام مُصطفیٰ کو ضابطہ فوجداری کی مندرجہ ذیل دفعات کے تحت مجرم گردانتا ہوں۔ دفعہ 120 (ب) پڑھے بشمول دفعہ 302' 301' 109 ضابطہ فوجداری میں ارشد اقبال اور رانا افتخار کو مزید دفعہ 120 (ب) پڑھے بشمول دفعہ 302' 307 دفعہ 34 ضابطہ فوجداری کے تحت مجرم گردانتا ہوں۔

پیرا 620..... میں پانچوں ملزموں کو ضابطہ فوجداری کی دفعہ 120۔ ب پڑھے بشمول دفعہ 115 پانچ سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔ میں ذوالفقار علی بھٹو' میاں محمد عباس اور غلام مصطفیٰ کو دفعہ 302 پڑھے بشمول دفعہ 109-111 ضابطہ فوجداری موت کی سزا دیتا ہوں۔

میں ارشد اقبال اور افتخار رانا کو زیر دفعہ 302 پڑھے بشمول دفعہ 301' 34 ضابطہ فوجداری موت کی سزا دیتا ہوں۔ ان تمام ملزموں کو اس وقت تک گردن سے لٹکا کر پھانسی دی جائے جب تک ان کی موت واقع نہ ہو جائے۔

میں ذوالفقار علی بھٹو' میاں محمد عباس اور غلام مصطفیٰ کو زیر دفعہ 307 پڑھے بشمول دفعہ 109 ضابطہ فوجداری سات سال قید کی سزا دیتا ہوں۔ میں ارشد اقبال اور رانا افتخار احمد کو زیر دفعہ 307 سے دفعہ 34 ضابطہ فوجداری کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے' سات سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔

ذوالفقار علی بھٹو کو زیر دفعہ 544 الف ضابطہ فوجداری 25 ہزار روپیہ معاوضہ بھی ادا کرنا ہو گا۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اسے 6 ماہ قید بامشقت بھگتنا ہو گی۔

معاوضہ کی رقم وصول ہونے کی صورت میں نواب محمد احمد خان کے وُرثاء کو ادا کی جائیگی۔

یہ سزائیں اور معاوضہ ادا کرنے کی سزا' سزائے موت کے تبدیل ہو کر نرم ہونے کی صورت میں مؤثر ہوں گی۔

میں نے صرف ذوالفقار علی بھٹو کو معاوضہ ادا کرنے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ جرم کا ارتکاب اُس کے احکام کے تحت کیا گیا تھا۔"

دستخط

(آفتاب حسین.....جج)

مشتاق حسین۔ چیف جسٹس .....میں اتفاق کرتا ہوں

ذکی الدین پال۔ جج.....میں اتفاق کرتا ہوں۔

ایم ایس ایچ قریشی۔ جج.....میں اتفاق کرتا ہوں۔

گلباز خان۔ جج.....میں اتفاق کرتا ہوں۔

www.bhutto.org

فیصلہ کا اعلان

مقدمہ کی سماعت 2 مارچ 78ء کو مکمل ہوئی اور 16 دن کی خاموشی کے بعد 18 مارچ کو ساڑھے آٹھ بجے سے بھی پہلے سزا کا اعلان کر دیا گیا تاکہ لوگوں کا ہجوم جمع نہ ہو سکے۔ فیصلہ کے اعلان سے پہلے نصرت بھٹو بے نظیر بھٹو سمیت پی پی کے بہت سے لیڈر اور کارکن گرفتار کر لئے گئے تھے۔ حکومت کو اندیشہ تھا کہ جب لوگوں کو فیصلہ کا پتہ چلے گا تو وہ گڑبڑ کریں گے۔ پانچ ججوں میں سے کسی ایک جج نے بھی اختلاف نہیں کیا تھا۔ سوئے اتفاق سے فل بنچ کے پانچوں جج پنجابی تھے۔ ان سب نے متفقہ طور پر بھٹو اور چاروں اعتراف کرنے والے ملزمان کیلئے سزائے موت کا فیصلہ کیا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ "ہر ملزم کو اس وقت تک تختہ دار پر لٹکایا جائے جب تک اس کی موت واقع نہ ہو جائے" یاد رہے کہ یہ فیصلہ جسٹس آفتاب حسین کے قلم سے تھا جو جماعت اسلامی سے گہری قربت کیلئے مشہور تھے۔

بہت سے لوگ یقین رکھتے تھے کہ ایسی سخت ترین سزا اُس شخص کو دی ہی نہیں جا سکتی جو ملک کا سابق وزیر اعظم ہی نہیں تھا بلکہ جس کا مقدمہ کتنے ہی سوالوں اور اعتراضات کی زد میں تھا اور جس نے اپنے مقدمہ کا بائیکاٹ بھی کر دیا تھا تاہم جو لوگ مقدمہ کی کارروائی سے قریب رہے تھے اُن کیلئے یہ فیصلہ حیران کن نہیں تھا۔ بھٹو کے وکیل انہیں پہلے ہی اس سے باخبر کر چکے تھے ۔ البتہ دنیا کو شدید دھچکا لگا اور صدمہ محسوس ہوا۔ فیصلہ کے فوراً بعد بھٹو کو موت کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پانچواں باب

عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کیوں؟

عدل گستری کے بارے میں مقولہ مشہور ہے کہ "انصاف نہ صرف کیا جائے بلکہ نظر بھی آنا چاہئے کہ انصاف کیا گیا ہے۔"

جہاں تک بھٹو کے خلاف مقدمہ قتل کا تعلق ہے بلاخوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کے ساتھ جو انصاف کیا گیا وہ کسی کو نظر نہیں آیا۔ کارروائی کے بہت بڑے حصہ کی سماعت ملزم کی غیر حاضری میں اور بند کمرے میں کی گئی جبکہ انصاف کا بین الاقوامی مسلمہ اصول یہ ہے کہ سماعت کے وقت ملزم کا حاضر ہونا لازمی ہے اور وہ لازماً کھلے عام ہونی چاہئے۔ یہ بات ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ بھٹو کے معاملہ میں عدالت نے شروع سے ہی مخاصمانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ انہوں نے خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی انتہائی کوشش کی مگر مولوی مشتاق کے مسلسل اہانت آمیز رویہ کے باعث ایک مرحلہ ایسا آ گیا جہاں بھٹو عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس باب میں ہم نے عدالت کے مخاصمانہ اور ذلت آمیز رویہ کے ساتھ ساتھ بھٹو کے خلاف چلائی گئی کردار کشی کی اس مہم پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کا مقصد بھٹو کو دنیا کا بدترین انسان اور شیطان مجسم ثابت کرنا اور ایک ایسی خوفناک فضاء پیدا کرنا تھا جس میں بھٹو کیلئے کسی طرف سے خیر کی آواز سنائی نہ دے۔ اس لئے ہم نے بائیکاٹ کے اسباب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں داخلی اسباب سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں خارجی اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

www.bhutto.org

بائیکاٹ کے داخلی اسباب

پاکستان میں قانونی نظام کو ہمیشہ دوسرے ملکوں کے مساوی اور متوازی رکھا گیا۔ خصوصاً برطانیہ کے ساتھ جہاں سے اس نے قانونی نظام ورثہ میں پایا لیکن لوگوں نے دیکھا کہ جب سابق وزیراعظم کے خلاف مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو ایسی بے قاعدگیاں کی جانے لگیں جو طے شدہ معمول کے مطابق نہیں تھیں۔ حکام بار بار اس بات کا ذکر کرتے تھے کہ بھٹو ایک عام قیدی ہے جس پر معمول کا مقدمہ چلایا جارہا ہے۔ جبکہ مقدمہ کی سماعت معمول کے نظام قانون کے تحت مجلی عدالت سیشن کورٹ کی بجائے براہ راست عدالتِ عالیہ میں شروع کی گئی۔ اس وجہ سے ملزم سیشن کورٹ کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کے ایک حق سے محروم ہوگیا۔ ہائی کورٹ کی طرف جو جست لگائی گئی اس کی بابت کبھی کوئی وضاحت پیش نہیں کی گئی۔ ایسے شبہات اور خدشات نے ابتدا ہی سے جنم لینا شروع کر دیا جو بالآخر بائیکاٹ کا موجب بنے۔

بھٹو کی طرف سے جس وکیل نے ضمانت کی درخواست پیش کی وہ مسٹر محمد حیات جونیجو تھے۔ انہوں نے سماعت میں حصہ نہیں لیا۔ ضمانت کی درخواست پر دلائل دیتے وقت انہوں نے کہا تھا کہ ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کیس کی سماعت کے وقت موجود ہوں تاکہ مسٹر بھٹو کے سینئر وکیل ذی ایم اعوان کی نیابت واعانت کر سکیں لیکن ان کی اچانک غیر حاضری سے ثابت ہوا کہ ان کی خدمات حاصل کرنے کیلئے انہیں بلایا ہی نہیں گیا۔ اس طرح دوسرے فریق کے حوصلہ کو پست کرنے کی دانستہ کوشش کی گئی۔ مسٹر یحییٰ بختیار کو کیس کا نگران اور مشیر مقرر کیا گیا تھا۔ چیف جسٹس کے ساتھ ان کی بھی رنجش اور اَن بن تھی۔ اس لئے چیف جسٹس کا عناد براہ راست وکالت کی راہ میں رکاوٹ بنا۔ یہ فیصلہ تو ناس کے ذریعے ہی کیا جا سکتا تھا کہ مولوی مشتاق کے تعلقات یحییٰ بختیار کے ساتھ زیادہ خراب تھے یا بھٹو کے ساتھ۔

سماعت کے پہلے ہی دن چیف جسٹس چارج شیٹ پڑھ کر سنانے لگے تو بھٹو نے بڑے درشت لہجہ میں کہا گیا وہ اٹھ کر کھڑے ہو جائیں اور توجہ سے سُنیں۔ چارج شیٹ ختم ہونے پر بھٹو کو بیٹھنے کی اجازت دیدی گئی۔

استغاثہ کے قریباً نصف گواہ بھگت چکے تھے کہ نومبر کے وسط میں بھٹو اچانک بیمار ہو گئے۔ انہیں شدید بخار، انفلوئنزا اور گلے کی تکلیف نے آلیا۔ وہ تقریباً تین ہفتے ان تکالیف میں مبتلا رہے اور عدالت میں حاضر نہیں ہو سکے۔ عدالت نے علالت کی بنا پر ان کی دو دن (13، 14 نومبر 77ء) کی میڈیکل رخصت تو منظور کر لی لیکن ان کے وکیل کو اس شق سے آگاہ کر دیا کہ بھٹو کی عدم موجودگی میں سماعت جاری رکھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس کی نمائندگی کرنے کیلئے ان کے وکلاء موجود ہیں جو اس سے ملاقات کر کے ضروری ہدایات لے سکتے ہیں۔

www.bhutto.org

15 نومبر کو عدالت کی ہدایت پر پروفیسر افتخار احمد سیکرٹری محکمہ صحت حکومت پنجاب نے بھٹو کا معائنہ کرنے کے بعد تصدیق کی کہ وہ واقعتاً علیل ہیں اور شدید انفلوئنزا حرارت، نقاہت نیز ناک اور سانس کے عوارض میں مبتلا ہیں۔ مسٹر اعوان نے اس رپورٹ کی روشنی میں درخواست پیش کی کہ جب تک ان کا موکل صحت یاب نہیں ہوتا اس وقت تک کیلئے سماعت ملتوی کر دی جائے۔ اُن کی یہ استدعا مسترد کر دی گئی۔ عدالت نے اُنہیں حکم دیا کہ وہ استغاثہ کے گواہ پر جرح کریں اور اس سلسلے میں اپنے موکل سے ہدایات حاصل کر لیں۔

بھٹو 13 نومبر سے 6 دسمبر تک علیل رہے۔ کوٹ لکھپت جیل میں بھٹو کی صحت عدالت کے نامناسب رویہ سے بھی متاثر ہوئی۔ ملیریا اور انفلوئنزا کے حملے نے مل کر اُن کی بیماری کو مزید پیچیدہ بنا دیا تھا۔ اُن کی غیر حاضری میں سماعت جاری رہی۔ اس دوران 15 گواہوں کی شہادتیں اور اُن پر جرح قلمبند کی گئی۔ وہ 7 دسمبر کو عدالت میں لائے گئے جب اُن کی موجودگی میں قصوری پر جرح ختم ہو گئی۔ 14 دسمبر کو بھٹو پر انفلوئنزا، بخار، کولیپس اور گلے کی تکلیف کا دوبارہ حملہ ہوا وہ عدالت میں پیش نہیں ہو سکے۔ سماعت اُن کے بغیر جاری رکھی گئی۔ 15 دسمبر کو عدالت کے باوجود وہ عدالت میں حاضر ہوئے اور کارروائی میں حصہ لیا۔ 16 دسمبر کو قذافی سٹیڈیم میں کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے پولیس کے لاٹھی چارج سے بے نظیر اور نصرت بھٹو زخمی ہو گئیں۔ اگلے دن بھٹو کو اس المناک حادثہ کی خبر ملی تو اُن کا پریشان ہونا فطری بات تھی لیکن مولوی مشتاق نے ایسے موقع پر بھی کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ عدالت کی بے رخی اور سرد مہری سے متاثر ہو کر کٹہرے میں بیٹھے ہوئے بھٹو نے جب مسٹر اعوان سے کہا کہ "Damn it" " (اس پر لعنت بھیجو) تو چیف جسٹس نے وہ الفاظ سن لئے اور بھٹو کو سخت لہجہ میں ڈانٹتے ہوئے کہا کہ عدالت میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ بھٹو نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ کل کے حادثہ کی وجہ سے انتہائی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ مولوی مشتاق نے پلٹ کر سختی سے جواب دیا "ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں"۔ اسی روز عدالت نے موسم سرما کی تعطیلات کے دوران بھی سماعت جاری رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تاہم فریقین کے وکلاء اس کے حق میں نہ تھے۔ اس لئے معاملہ ترک کر دیا گیا۔

انتقالِ مقدمہ کی درخواستیں

جیسا کہ متعدد واقعات سے ظاہر ہوا بھٹو کے ساتھ بینچ کا رویہ انتہائی مخاصمانہ و معاندانہ تھا۔ ابتداء ہی میں ایک دن مسٹر ڈی ایم اعوان نے ایک نکتہ پیش کرنے کی کوشش کی چیف جسٹس وکیل صفائی پر بھی برس پڑے اور اپنے غصہ کا اظہار کیا۔ اپنا نکتہ پیش کرنے کیلئے مسٹر اعوان نے ابھی "مائی لارڈ" کے الفاظ ہی کہے تھے کہ چیف جسٹس نے چیخ کر کہا "بیٹھ جاؤ"۔

چیف جسٹس کے اس رویہ پر مسٹر اعوان نے بلند آواز سے

www.bhutto.org

کہا "مائی لارڈ ہم جانتے ہیں کہ تمام پابندیاں اور بندشیں صرف وکیلِ صفائی کیلئے ہیں"

اس سے مولوی مشتاق کے غیظ و غضب میں اور بھی اضافہ ہوا اور انہوں نے مسٹر اعوان کو سخت ہدایات و احکامات سے نوازا۔ مسٹر اعوان اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ چیف جسٹس کو طیش اور غصہ کے عالم میں دیکھتے رہیں اچانک مولوی مشتاق کی نظر اُن پر پڑی تو وہ چیخ کر بولے۔

"تم میری طرف اس طرح گھور کے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

چیف جسٹس نے پریس کو منع کر دیا تھا کہ اس واقعہ کا ذکر اخبارات میں نہ آئے اگرچہ فیصلہ لکھتے وقت عدالت میں مسٹر اعوان کے رویہ پر تنقید کی گئی۔

صفائی کی طرف سے یہ شکایت بھی کئی بار کی گئی کہ استغاثہ کو اپنا مدعا پیش کرنے کیلئے زیادہ وقت دیا جاتا ہے مگر جب صفائی کی طرف سے کوئی سوال پوچھا جائے تو اکثر و بیشتر حالتوں میں اسے "غیر متعلقہ" کہہ کر روک دیا جاتا ہے۔

ان حالات نے بینچ پر سے بھٹو کے اعتماد کو کلیتاً ختم کر دیا چنانچہ اُنہوں نے نومبر 77ء میں انتقالِ مقدمہ کیلئے سپریم کورٹ میں ایک درخواست دائر کی جس میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس پر دو الزام لگائے گئے تھے۔

"اولاً یہ کہ وہ سماعت میں تعصب اور جانبداری کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ثانیاً یہ کہ وہ بیک وقت چیف جسٹس اور چیف الیکشن کمشنر کے دو عہدوں پر کام کر رہے ہیں جو کہ خلافِ آئین ہے۔"

یہ درخواست 30 نومبر کو زیرِ غور آئی۔ بھٹو کے وکیل مسٹر بختیار نے اپنے دلائل میں کہا کہ چیف جسٹس اُن کے موکل سے اس لئے بغض و عناد رکھتے ہیں کہ پی پی کے دورِ حکومت میں چیف جسٹس کے عہدہ پر ترقی کے وقت انہیں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ دوسرے پی پی کی مجلس عاملہ نے اوائل اگست میں کراچی میں ہونے والے ایک اجلاس کے دوران چیف جسٹس کے خلاف بحیثیت چیف الیکشن کمشنر جانبداری برتنے کا الزام لگایا تھا۔ مسٹر بختیار نے شکایت کی کہ چیف جسٹس سماعت کے دوران بھٹو کے خلاف طنزیہ ریمارکس پاس کرتے ہیں یہ کہ مسٹر بھٹو کو زبانی بیان دینے کی اجازت بھی نہیں دی گئی یہ کہ مسٹر بھٹو کی علالت کے دنوں میں اُن کے حاضر نہ ہونے کے باوجود مقدمہ کی کارروائی ملتوی کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ حالانکہ فوجداری مقدمات میں ملزم کی عدم موجودگی میں سماعت کرنے کوئی جواز نہیں۔

سپریم کورٹ نے اس درخواست کو قبل از وقت قرار دیا اور وکیلِ صفائی کو ہدایت کی کہ یہ عرضداشت ٹرائل بینچ کے روبرو پیش کرے۔ زیادہ مناسب یہ ہو گا کہ جانبداری کی شکایت مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد اپیل کی صورت میں دائر کی جائے۔

چیف جسٹس کے بیک وقت دو عہدوں پر کام کرنے سے متعلق شکایت 8 دسمبر کو زیرِ غور آئی۔ جسے اس بناء پر مسترد کر دیا گیا کہ چیف جسٹس کا بحیثیت چیف الیکشن کمشنر تقرر ایڈہاک بنیاد پر کیا گیا ہے۔ جو

www.bhutto.org

آئین کے عین مطابق ہے اس لئے دو عہدے سنبھالنے پر کوئی پابندی نہیں"

(اور الیکشن نہ ہوسکے از پروفیسر غفور احمد) صفحہ 151-142'

اس سلسلے میں دوسری درخواست 18 دسمبر کو ہائی کورٹ میں دی گئی۔ جس میں دورانِ سماعت جُملہ واقعات کا ذکر کرنے اور بینچ کے معاندانہ رویہ کی مثالیں دینے کے بعد استدعا کی گئی تھی کہ اُن کا کیس کسی دوسری عدالت یا بینچ میں منتقل کر دیا جائے۔ اس درخواست کو کرسمس کی چھٹیوں کے بعد لیا گیا اور کسی غور و فکر کے بغیر چیمبر میں ہی خارج کر دیا گیا۔

ان درخواستوں کے خارج ہونے پر مسٹر اعوان نے اعلان کیا کہ اب وہ اپنے موکل کی مزید وکالت نہیں کریں گے۔ اس لئے انہیں مقدمہ سے دستبردار ہونے کی اجازت دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی بھٹو نے اپنے وکلاء کے مختارنامے منسوخ کر دیئے اور اُنہیں ہدایات دینے سے انکار کر دیا۔ چیف جسٹس نے اس اقدام کو صفائی کے ایک ہتھکنڈہ سے تعبیر کیا اور سیخ پا ہو کر مسٹر اعوان کو کیس سے الگ ہونے کی اجازت نہیں دی۔ عدالت کی طرف سے ڈیڑھ گھنٹہ کی مہلت دی گئی کہ اس دوران کوئی حتمی فیصلہ کر لیا جائے۔ موکل اور وکیل طویل بات چیت کے بعد آخر کار اس بات پر متفق ہو گئے کہ بائیکاٹ کا فیصلہ درست ہے۔ وقفہ کے بعد اعوان نے عدالت کو مطلع کر دیا کہ "میرے موکل نے مختارنامے منسوخ کر دیئے ہیں اور وہ کارروائی کا بائیکاٹ کر رہا ہے۔"

انتقالِ مقدمہ کی ایک اور درخواست مسٹر بھٹو نے 23 فروری 78ء کو پنجاب کے قائم مقام گورنر کو بھجوائی جس میں یہ تاریخی اور معنی خیز جملہ بھی لکھا تھا:۔

"یہ قتل کا مقدمہ نہیں بلکہ مقدمے کا قتل کیا جا رہا ہے"

اس میں کہا گیا تھا کہ چیف جسٹس درخواست گزار کو صفائی کا موقع دیئے بغیر ہی موت کی سزا دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس مقدمہ کی سماعت روک دی جائے اور ضابطہ فوجداری کی دفعہ 527 کے تحت کسی دوسری ہائی کورٹ میں منتقل کر دی جائے۔

(دیکھئے مارشل لاء کا وائٹ پیپر صفحہ 31-130 از ستار طاہر' اشاعت 1986ء)

اس نئے اقدام سے مشتعل ہو کر اس کو روکنے کی غرض سے چیف جسٹس نے مسٹر اعوان اور احسان۔ قادر شاہ کو سرکاری خرچ پر بھٹو کا وکیل مقرر کر دیا۔ مسٹر اعوان نے عرض کیا کہ اُن کے موکل نے اُنہیں ہدایات دینے سے انکار کر دیا ہے اس لئے وہ گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے غلام حسین پر کوئی جرح نہیں کر سکتے۔ چیف جسٹس نے جھنجھلا کر کہا کہ "وہ تو ان کی طرف موتی پھینکنا چاہتے تھے لیکن وہ قبول نہیں کر رہے۔ اس لئے اب کچھ نہیں ہو سکتا"۔ مولوی مشتاق نے اس موقع پر بائبل کی جس عبارت کا اطلاق کیا

www.bhutto.org

وہ قطعی طور پر واضح تھا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ "میں تو سوروں کی طرف موتی پھینک رہا ہوں مگر وہ قبول کرنے کو تیار نہیں۔"

یوں 9 جنوری کے بعد نہ تو بھٹو عدالت میں پیش ہوئے نہ کارروائی میں حصہ لیا بائیکاٹ کا یہ فیصلہ بھٹو کے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوا کیونکہ اس طرح وہ اپنے دفاع میں کوئی گواہ پیش نہ کر سکے۔ جو استغاثہ کے گواہوں کی شہادتوں پر نئے انداز سے روشنی ڈال سکتے تھے۔ اب صرف گواہانِ استغاثہ کے بیان ریکارڈ پر رہ گئے۔ یہ بات اپنی جگہ بڑی عجیب اور حیرت انگیز ثابت ہوئی کہ ججوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ریکارڈ پر موجود مواد کے علاوہ کسی چیز پر توجہ نہیں دیں گے۔ یوں انہوں نے استغاثہ کے بیانات پر مشتمل ریکارڈ کو مکمل طور پر قبول کر لیا۔ جس وقت غلام حسین کی شہادت مکمل ہوئی بائیکاٹ مؤثر ہو چکا تھا۔ جب بھٹو کی باری آئی کہ وہ باقی ماندہ گواہوں پر جرح کریں تو انہوں نے نفی میں جواب دیا کیونکہ وہ کارروائی کا بائیکاٹ کر چکے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دس گواہوں کی شہادتیں کسی چیلنج کے بغیر ریکارڈ پر چلی گئیں اور بینچ نے انہیں جوں کا توں قبول کر لیا۔

24 جنوری کو بھٹو اپنا بیان ریکارڈ کرانے کی غرض سے عدالت میں حاضر ہوئے تو بائیکاٹ کا فیصلہ اُن کی راہ میں مزاحم نہیں ہوا۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران چیف جسٹس نے بھٹو کو یقین دلایا تھا کہ انہیں اپنی صفائی میں بولنے کا بھرپور موقع دیا جائیگا۔ اصل میں یہ ایک چال تھی کیونکہ جب بھی کسی گواہ سے کوئی بات پوچھنا چاہتے یا کسی نکتہ پر اصرار کرتے تو چیف جسٹس حکم دیتے۔ "شٹ اپ" "سٹ ڈاؤن"۔

بہرحال اب مسٹر بھٹو کے بولنے اور بیان قلمبند کرانے کا وقت آ گیا تھا چونکہ اُنہوں نے کارروائی کا بائیکاٹ کر رکھا تھا اس لئے اُنہوں نے شروع میں ہی واضح کر دیا کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہیں گے اور اپنی معروضات ان دو نکات تک محدود رکھیں گے کہ :-

1..... وہ وجوہات جن کی بناء پر یہ مقدمہ گھڑا اور تیار کیا گیا

2..... وہ وجوہات جن کی بناء پر انہیں عدالت پر اعتماد نہیں رہا تھا۔

پہلے دن وہ 67 سوالوں میں سے 53

کا جواب دے پائے تھے کہ عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ 25 جنوری کو عدالت میں آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کمرۂ عدالت خالی پڑا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ آج سے عدالت کی کارروائی بند کمرے میں ہوا کرے گی۔ چیف جسٹس نے اوائل نومبر میں غیر ملکی صحافیوں کو انٹرویو دیتے ہوئے عدالت کی کارروائی "دن کی پوری روشنی میں" کرنے کا جو وعدہ اور اعلان کیا تھا۔ اُس کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ بھٹو نے مولوی مشتاق کی اس وعدہ خلافی اور بند کمرے میں سماعت پر زبردست احتجاج کیا۔ انہوں نے واضح طور پر کہا "ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مقدمہ میں ان کیلئے کچھ 'قانون ہے اور استغاثہ کیلئے دوسرا قانون' میں یہ کرب اور اضطراب صرف اپنے ملک کیلئے برداشت کر رہا ہوں۔" انہوں نے دلیل

www.bhutto.org

دیتے ہوئے کہا کہ ان کے ساتھ یہ سلوک اس لئے کیا جارہا ہے کہ انہیں ایک اہم سیاسی شخصیت کی حیثیت حاصل ہے۔

"آپ اسے انصاف کہتے ہیں؟ آپ اسے مقدمہ کہتے ہیں؟ یہ حقیقت بھول جائیں کہ میں پاکستان کا صدر اور وزیراعظم رہ چکا ہوں۔ یہ بات بھی فراموش کر دیجئے کہ میں اس ملک کی سب سے بڑی پارٹی کا چیئرمین ہوں۔ ان باتوں سے قطع نظر میں اس ملک کا ایک شہری ہوں اور مقدمۂ قتل کا سامنا کر رہا ہوں۔ ایک شہری کو انصاف سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔" مگر بھٹو کے یہ الفاظ سنگلاخ زمین پر گرتے رہے وہاں ججوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا جو انہیں سنتا۔ جج بھٹو کے اس جذباتی اندازِ تکلم سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے جب انہیں باقی ماندہ سوالوں پر بولنے کو کہا گیا تو بھٹو نے انکار میں سر ہلا دیا۔ جب ان سے پوچھا گیا "کیا آپ اپنی صفائی میں شہادتیں پیش کریں گے؟" تو بھٹو نے جواب دیا "میں عدالت کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لے رہا۔" اُن کے ساتھ جو برتاؤ کیا جارہا تھا بھٹو نے اس کے خلاف نفرت و کراہت کا اظہار کیا۔ اُنہوں نے یہ شکایت بھی کی کہ گواہوں کی شہادتوں کو صحیح طور سے ریکارڈ نہیں کیا گیا۔ خود اُن کے اپنے بیان کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا کہ سٹینوگرافر نے اسے صحیح طور پر قلمبند نہیں کیا۔ بھٹو کے حامی اس بات پر شدید احتجاج کر رہے تھے کہ جہاں استغاثہ کے کیس اور شریک ملزمان کے بیانات کی پریس میں بھرپور تشہیر کی جا رہی تھی وہاں بھٹو کے بیان کو بالکل کوریج نہیں دی گئی۔

بھٹو کے بائیکاٹ اور بند کمرے میں سماعت کے باعث یہ مقدمہ خاموشی سے جاری رہا اور 2 مارچ کو ختم ہوا۔ بظاہر محسوس ہوتا تھا کہ جج پہلے ہی اپنا ذہن بنا چکے تھے۔ بھٹو نے بعد میں بتایا کہ "بساط میرے خلاف بچھائی گئی تھی چیف جسٹس شریک ملزموں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے اور انہیں دیکھ کر مسکراتے تھے، دھمکیاں، غصّہ، ڈانٹ ڈپٹ، گھُرکیاں، جھڑکیاں، خشمگیں نگاہوں سے گھُورنا اور چیخنا چلانا صرف میرے لئے مخصوص تھا۔" ان تمام مناظر کے پس منظر میں یہ مقدمہ ہر لحاظ سے اتنا محفوظ (Water Tight) نہیں تھا جتنا کہ محسوس ہوتا تھا۔

خصوصی کٹہرا کی تیاری

بڑے ملزم کی اہانت و تذلیل کا تذکرہ اُس خصوصی کٹہرا کی تیاری کا ذکر کئے بغیر نامکمل رہے گا جو لاہور ہائی کورٹ کی تاریخ میں پہلی بار راتوں رات بنوایا گیا اور مسٹر بھٹو کو اُن کے وکلاء سے الگ تھلگ اُس میں بیٹھنے پر مجبور کیا گیا۔ جب بھٹو نے اپنے وکلاء کے پاس بیٹھنے کی اجازت چاہی تو اُن کی التماس کو نامنظور کر دیا گیا۔ اس طرح اُن کے اور وکلاء کے مابین خاصا فاصلہ پڑ گیا۔

وکلائے صفائی کے ساتھ بینچ کا رویہ

لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مشتاق حسین کا رویہ مسٹر بھٹو کے وکلاء خصوصاً مسٹر اعوان کے

www.bhutto.org

ساتھ بڑا جارحانہ اور جانبدارانہ تھا جو دفاع کے حقوق کی سراسر نفی کرتا تھا۔ مسٹر اعوان نے سپریم کورٹ کو یاد دلایا کہ جسٹس موصوف ایکبار اس حد تک بڑھ گئے کہ اُنہوں نے اُن کے موکل کی طرف سے دائر کردہ رِٹ کی نقل اُن کے منہ پر دے ماری۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ جسٹس موصوف نے اُنہیں بے شمار دھمکیوں کا نشانہ بنایا اور توہینِ عدالت کا قانون یاد دلاتے ہوئے اُنہیں یہ جتایا کہ جج بدستور اپنی جگہ کام کرتے رہیں گے اور مسٹر اعوان کو دوسرے موکلوں کی طرف سے آئندہ بھی اُن کی عدالت میں آنا پڑے گا لہٰذا وہ اپنا دماغ درست رکھیں۔

ایک موقع پر انہوں نے عدالت کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے انتقالِ مقدمہ کی درخواست دی تو ججوں نے ایک حکم نامہ میں انہیں جھڑکنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

علاوہ ازیں ہائی کورٹ کی طرف سے جو فیصلہ صادر کیا گیا اُس میں بھی مسٹر اعوان کے رویہ پر تنقید کرتے ہوئے ذیل کے ریمارکس قلمبند کئے گئے۔

"میں بار کے اراکین کا بڑا احترام کرتا ہوں لیکن بدقسمتی سے بار کے ایک رکن کا رویہ مقدمہ کی ساری کارروائی کے دوران تمام تر آزادی دینے کے باوجود خودسری اور عدالت کی توہین کا رہا۔ بلاشبہ وکیل کو اپنے موکل کے سلسلے میں اپنا فرض ادا کرنا ہوتا ہے۔ تاہم اس کے ذمے عدالت کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ موکل کے ساتھ ساتھ چل کر پورا نہیں کر سکتا۔ پھر بھی اس وکیل نے یہی کیا۔ اس نے اپنے موکل کے ساتھ پوری پوری ملی بھگت جاری رکھی اور اس بناء پر غلط رویہ اختیار کیا مجھے توقع ہے کہ فاضل وکیل اس پر نظرِ ثانی کرے گا۔ وہ ذہنی طور پر اپنے اخلاق کا جائزہ لے گا اور معذرت کرے گا"

(پی ایل ڈی۔ 1978ء لاہور 523 پیرا نمبر 24۔ 623)

بڑا ملزم

مسٹر بھٹو کیلئے بڑے ملزم "(Principal accused)" کا نام تجویز کر کے عدالت نے صریحاً جانبداری کا مظاہرہ کیا۔ قانونی لحاظ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قصوری کے باپ کے قتل میں ملوث تھے اور قتل کرنے والے موقع کے شریک ملزموں سے زیادہ قابل نفرین نہیں تھے۔

بھٹو کے خلاف مقدمہ درج کرنے کی ہدایت

چیف جسٹس سماعت کے دوران معمولی معمولی باتوں پر کیسے طیش میں آجاتے اور مشتعل ہو جاتے تھے اس کا اندازہ درجِ ذیل واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

9 جنوری 78ء کو فل بینچ کے سامنے مقدمۂ قتل کی سماعت کے دوران ایک ملزم کے وکیل نے وعدہ معاف گواہ غلام حسین پر جرح کی تو اُس نے بتایا کہ

www.bhutto.org

ملزم غلام مصطفیٰ نے فلم ایکٹر محمد علی اور جسٹس (ریٹائرڈ) جمیل حسین رضوی کے خلاف استعمال کرنے کیلئے ایک مشین گن حاصل کی تھی۔ غلام حسین نے غلطی سے جمیل حسین رضوی کیلئے چیف جسٹس کے الفاظ استعمال کئے۔ چیف جسٹس نے اصلاح کی اور وعدہ معاف گواہ سے کہا کہ وہ لفظ جج استعمال کریں۔ چیف جسٹس نہیں پھر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "ابھی چیف جسٹس کی باری نہیں آئی"۔ اس موقع پر مسٹر بھٹو نے اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے مزاحاً کہا" وہ بھی آجائیگی" یہ ریمارکس مولوی مشتاق حسین نے مُنے تو ان کی اُفتادِ طبع اس دل لگی کو برداشت نہیں کر سکی۔ انہوں نے موقع پر موجود پولیس سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ وہ ان الفاظ کو نوٹ کرلیں اور انہیں قریب ترین عدالت میں ریکارڈ کرائیں"۔ فاضل جج نے کہا
" وجہ یہ نہیں کہ میں ان ریمارکس سے خوفزدہ ہوں بلکہ یہ اس لئے کیا جانا چاہئے کہ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر اس کا محاسبہ بھی ہو سکے "

"اور الیکشن نہ ہو سکے" از پروفیسر غفور احمد اشاعت اوّل صفحہ 82- 181 1990ء

بھٹو کے وکلاء نے شکایت کی کہ استغاثہ کے گواہوں کی شہادت کو اچھی طرح سیا جاتا چمکایا جاتا اور چپکانے کیلئے سخت کیا جاتا ہے یعنی پوری طرح لکھا پڑھا کر گواہی دلوائی جاتی ہے۔ انہوں نے اس نکتہ کو جرح کے دوران بطورِ خاص نمایاں کیا۔

برطانوی ماہرِ قانون کی شہادت

معروف برطانوی قانون دان جان میتھوز کیوسی اس مقدمہ کی کارروائی سننے کیلئے نومبر میں لاہور پہنچے۔ اُنہوں نے چند دن کارروائی سننے کے بعد اس پر حسبِ ذیل تبصرہ کیا تھا۔
"گواہ کی حمایت میں جانے والے بیان کے حصہ میں بینچ کی طرف سے جس انداز میں فوری مداخلت کی جاتی تھی اس طریقہ کار سے میں بہت حیران ہوا گواہ کو یوں ترغیب دی جاتی اور موقع فراہم کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے بیان سے پھر جائے یا اس میں تبدیلی کرے۔ پھر جو کچھ کیا جارہا تھا ٹائپسٹ اسے ساتھ کے ساتھ ٹائپ نہیں کرتا تھا بلکہ عدالت اسے اصلی سوال اور اس کا حتمی جواب ڈکٹیٹ کراتی تھی۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ گواہ نے پہلے جو کچھ کہا ہوتا تھا۔ عدالتی بیان اس کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ انہوں نے بینچ کے متکبرانہ انداز اور مخاصمانہ رویہ کا نوٹس لیتے ہوئے اس کا بھی ذکر کیا کہ چیف جسٹس کس طرح غصہ میں آجاتے تھے۔ اس اشتعال اور رویہ میں اس حد تک شدت آگئی کہ بھٹو نے مجبور ہو کر مقدمہ کسی دوسرے بینچ میں منتقل کرانے کی درخواست دینے کا فیصلہ کر لیا جب انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو ناچار کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا"

ایک اور قانون دان کی گواہی

بعد میں ایک اور قانون دان مسٹر جان میلویل ولیمز نے عدالتی کارروائی دیکھی جب بی بی سی نے انٹرویو

کے دوران ان سے گواہوں پر دباؤ اور جبر کی بابت سوال پوچھا تو انہوں نے جواب دیا
"تمام گواہوں کے بیانات میں ایک طرح سے مکمل یکسانیت اور مشابہت پائی جاتی تھی۔ جس سے یہ قوی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ شدید دباؤ کے تحت تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچانا چاہتے تھے۔ ملک میں سیاسی پس منظر اس قسم کا تھا کہ گواہ اپنے آپ کو پوری طرح دباؤ کے نیچے محسوس کرتے تھے"

بائیکاٹ کی خارجی وجوہات

عدالت کے اندر بینچ کے مخاصمانہ رویہ کے ساتھ ساتھ عدالت سے باہر کچھ ایسے حالات واسباب اور وجوہات نے جنم لینا شروع کر دیا جن کے باعث بھٹو کارروائی کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

بھٹو کی کردار کشی کی مہم

بھٹو کی گرفتاری و نظر بندی کے ساتھ ہی ضیاء الحق نے ان سے آنکھیں پھیرنی شروع کر دیں۔ اب تک جو بھٹو ان کی نظر میں عظیم سیاست دان' دانشور اور محبِ وطن تھا۔ وہ اچانک قاتل' دغاباز' خائن اور شیطان مجسم نظر آنے لگا۔ اب وہ اخباری بیانات نشری تقاریر اور انٹرویوز میں بھٹو پر کڑی تنقید اور ان کی تعریض و تنقیص کرنے لگے۔ اُن کی شہ پا کر رائٹسٹ صحافیوں اور دائیں بازو کے پریس نے بھٹو کے خلاف پروپیگنڈہ کی توپوں کے دہانے کھول دیئے۔ پریس نے زہر اگلنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ بھٹو کو پھانسی پر چڑھانے کا مطالبہ بھی کیا جانے لگا۔ ان لوگوں نے قانون' انصاف' رواداری اور شرافت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر بھٹو کی ذات اور شخصیت کو مسخ کر کے پیش کرنا شروع کر دیا۔ نئے نئے سکینڈل اور من گھڑت کہانیاں اس سے منسوب کی جانے لگیں۔

اگرچہ حکومت اور عدلیہ کی طرف سے لاکھ دعویٰ کیا گیا کہ بھٹو کیس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں لیکن سرکاری ذرائع ابلاغ عامہ اور دائیں بازو کے اخبارات و رسائل نے اسے سیاسی رنگ دیدیا اور یہ رنگ ہزار دعوؤں اور پردوں کے باوجود چھپائے نہ چھپ سکا۔ ہر باشعور صاحبِ قلم عوام کے مزاج سے آشنا صحافی اور باضمیر انسان زبانِ خلق پر جاری اس دعویٰ کا ہم نوا بن گیا کہ بھٹو کے کیس اس کی سزا اور پھانسی میں سیاست کا عنصر شامل تھا۔

زندگی کے آخری دو اڑھائی برسوں میں بھٹو پر ہزاروں الزام لگائے گئے۔ اُس کی ہر خوبی کو جھٹلایا گیا۔ ہر اچھائی کی مخالفت کی گئی۔ اُسے درندہ بھیڑیا اور سفاک ترین انسان بنا کر دکھایا گیا۔

بھٹو پر الزام تراشیاں

بھٹو اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ اُنہیں اپنی زندگی میں ہر طرح کا الزام سننا پڑا۔ مخالفوں نے اُن کی دھجیاں بکھیرنے کی مہم مسلسل جاری رکھی۔ بھٹو کے ہم عصر ہر سیاست دان نے انہیں گالی

www.bhutto.org

دی۔ ان کے اخلاق و کردار میں کیڑے نکالے۔ اُن کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یہ مخالفت اس خوف کی پیداوار تھی انہیں بھٹو سے محسوس ہوتا تھا۔ اس کی وجہ بھٹو کی عوامی مقبولیت اور ہر دلعزیزی تھی۔ یہ سیاست دان لوگوں کے سامنے اپنے مقدس چہرے اور مبارک اعمال نامے لیکر حاضر ہوتے۔ مذہب اخلاق ' رواداری ' اسلام کے اعلیٰ اصول شرافت ' تہذیب اور روحانی اقدار کا پرچار کرتے لیکن جونہی بھٹو کا ذکر شروع ہوتا۔ وہ ساری پاکیزہ و پسندیدہ اقدار کو فراموش کر کے ایسی زبان استعمال کرنے لگتے جو کوئی شریف آدمی اپنے گھریلو ملازم کے بارے میں بھی استعمال نہیں کرتا۔

یہ مطالعہ اپنی جگہ بڑا "معلومات افزا" ہے کہ بھٹو کے مخالف کیا کہتے تھے اور اُن پر کس طرح کی الزام تراشی کرتے تھے۔ اس الزام تراشی کی حقیقت کیا تھی اور الزام لگانے والے خود کس پایہ کے آدمی تھے۔

بھٹو پر ایک الزام یہ بھی لگایا گیا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو نہیں بلکہ "گھاسی رام" ہے۔ مسلمان نہیں ہندو ہے۔ اُس کی ماں ہندنی تھی۔ اُس کے ماموں کے فرضی اور طبع زاد انٹرویو بھی شائع کئے گئے۔

اسلام پسند پریس نے اس کے شجرۂ نسب کو خوب اچھالا۔ اس کی بڑی تشہیر کی۔ یہ بھٹو دشمنی کی انتہا تھی۔ اس سے زیادہ کم ظرفی اور کمینگی کا اظہار پڑھے لکھے لوگوں ' اسلام سے تعلق رکھنے والے اور دین کی ابتدائی تعلیمات جاننے والے لوگوں کی طرف سے بھی کبھی نہیں ہوا۔ کسی نے اپنے نظریاتی یا سیاسی مخالف پر ایسی گھٹیا الزام تراشی کبھی نہیں کی تھی۔

فرض کیجئے بھٹو کی والدہ ہندو بھی تھیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بعد میں وہ مسلمان ہو گئیں اور لیڈی خورشید بیگم شاہنواز کے نام سے موسوم ہوئیں۔ اُنہوں نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام ذوالفقار علی رکھا گیا جو سراسر اسلامی نام ہے۔ کیا اسلام احترام آدمیت اور تکریم انسانیت کی یہی تعلیم دیتا ہے۔ جس کا مظاہرہ بھٹو کے مخالفوں نے کیا؟ کیا اسلام میں نومسلموں کی اسی طرح تذلیل اور دلآزاری کی جاتی ہے جس طرح سے ان لوگوں نے ایک نومسلم خاتون کے ساتھ سلوک کیا؟ کیا یہ لوگ اپنے اپنے گریبانوں میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتے کہ خود ان میں سے 80 فیصد مسلمانوں کے آباؤاجداد غیر مسلم تھے۔

جس شخص کے نافذ کردہ آئین میں یہ شق موجود ہے کہ کوئی غیر مسلم پاکستان کا صدر یا وزیراعظم نہیں بن سکتا۔ اس کے بارے میں غلاظت پھیلانے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ اپنے مذہب کے ساتھ کتنا ظلم کر رہے ہیں۔

ایک زمانہ میں بھٹو کو کافر بھی قرار دیا گیا۔ اس کے خلاف کفر کے فتوؤں کا خوب چرچا ہوا۔ تکفیر کی یہ رسم بڑی پرانی ہے۔ اس سے پہلے منصور حلاج ' سرمد جیسی شخصیات اور آخر میں علامہ اقبال و قائداعظم جیسے مقتدر قائدین اس رسم کا ہدف بنے۔ بھٹو ان سے عظیم اور مقدس نہ تھے۔ ان لوگوں نے بھٹو کو ووٹ دینے والوں کو بھی مردود اور گمراہ قرار دیا۔ بہت سے علماء نے پی پی کے کارکنوں کی نماز جنازہ پڑھانے

www.bhutto.org

سے انکار کر دیا۔

بھٹو پر ایک الزام یہ لگایا گیا کہ اس نے ذاتی اقتدار کیلئے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ بلاشبہ یہ بڑا اہم اور سنگین الزام ہے۔ کاش یہ الزام لگانے والے حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ ہی شائع کر دیتے تاکہ پتہ چل جاتا کہ پاکستان توڑنے میں بھٹو کا کردار کس قدر تھا۔ بھٹو نے اپنے عہدِ حکومت میں بہت ظلم ڈھائے مگر اتنے نہیں جتنے کہ مخالف پریس اور سرکاری ذرائع ابلاغِ عامہ نے ان کے کھاتہ میں ڈال دیئے۔ مبالغہ کتنا کیا گیا اس کا اندازہ سب لوگوں کو ہے۔ اس سارے جبر و استبداد اور ظلم و ستم کے باوجود بھٹو اور اس سے پہلے حکمرانوں نے کسی انسان پر کوڑا نہیں آزمایا تھا۔ کوڑے لگانے کا سہرا فوجی حکومت کے سر بندھتا ہے۔ جس نے صحافیوں اور سیاسی کارکنوں پر بھی کوڑے برسانے سے دریغ نہیں کیا۔

بھٹو کے خلاف زبانیں کھلتی گئیں۔ پریس نے غلاظت اور گندگی کے ڈھیر لگا دیئے لیکن نوے دن کیلئے آنے والی "عارضی اور غیر جانبدار" حکومت خاموش رہی بلکہ اس حکومت نے بھٹو کے حامیوں پی پی کے کارکنوں اور اپنے مخالفین کی بازپرس شروع کی ان کی پکڑ دھکڑ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کیلئے قید و بند کے دروازے وا اور دار و رسن کی آزمائش عام کر دی گئی۔ بھٹو کے شیدائیوں کو جان کے لالے پڑ گئے۔ اور ایک وقت تو ایسا آ گیا جب گلیاں "سنجیاں" ہو گئیں تھیں اور "مرزا یار" اکیلا ہی دندناتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے عناصر کی حوصلہ افزائی ہونے لگی جو بھٹو کے خلاف لکھنے اور بولنے میں پہلے ہی بڑی شہرت رکھتے تھے۔

اپنے اقتدار کے ابتدائی ایام میں ہی جنرل ضیاء الحق اپنی تمام تر غیر جانبداریوں اور عارضی ذمہ داریوں کے اعلان کے باوجود بھٹو کو "مجسم شر" قرار دے چکے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ بھٹو کی منفی تشہیر ملک کے کونے کونے میں ہونی چاہئے۔ وہ عدالت کے ہر فیصلہ سے پہلے دوٹوک الفاظ میں پکار اٹھے کہ "بھٹو کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں"۔

پھر یہ دعویٰ بھی کرتے رہے کہ مارشل لاء کی حکومت بھٹو کیس میں فریق کی حیثیت نہیں رکھتی۔

دریں اثناء جنرل ضیاء نے یہ بھی انکشاف کیا کہ پاکستان قومی اتحاد کے کئی سربرآوردہ رہنماؤں نے ان کی منت سماجت کی کہ انتخابات ملتوی کر کے پہلے بھٹو کا قصہ پاک کیا جائے ان کے سرخیل چودھری ظہور الٰہی تھے جو بڑے زور و شور سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔ چودھری صاحب کی ایک ایسی ہی زہریلی تقریر کا یہ اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور قومی اتحاد کے مقتدر رہنماء نے جو زبان استعمال کی ہے اس کا جواب نہیں۔ وفاقی وزیر محنت چودھری ظہور الٰہی نے کہا:۔

"اللہ تعالیٰ نے جنرل ضیاء الحق سے کہا ہے کہ محاسبہ تم کرو تمام ممالک مل کر بھی بھٹو کو سزائے موت سے نہیں بچا سکتے ہم نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ اب چاہے برنا ہو یا برنا کا باپ"

(ڈان۔ یکم اگست 1978ء)

پھر زاہد سرفراز جیسے بھی تھے جو دعویٰ سے کہتے تھے کہ اگر بھٹو کو پھانسی نہ دی گئی تو وہ اس کے خلاف

www.bhutto.org

تحریک چلائیں گے۔ این ڈی پی کے رہنماء خان عبدالولی خان بڑی شدومد سے یہ بات کہہ رہے تھے کہ انتخابات سے پہلے احتساب کرنا اور بھٹو کو کیفر کردار تک پہنچانا ضروری ہے۔ قومی اتحاد کے تقریباً سبھی لیڈر ان کی آواز میں آواز ملانے لگے۔ حکومت نے اپنے زیر سرپرستی اخبارات کو ہدایات جاری کر دی تھیں کہ بھٹو کا نام شائع ہو نہ تصویر' ریڈیو اور ٹی وی والوں کو حکم ملا کہ بھٹو کا ذکر کبھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر نہ آنے پائے۔ ہر ممکن کوشش کی گئی کہ اس نام کو قابلِ نفرت بنا دیا جائے۔ اسے مٹا دیا جائے اور زبانوں پر نہ آنے دیا جائے۔

قومی اتحاد کے بعض سرکردہ رہنماء تو انتخابی مہم کے زمانہ سے ہی اُن کی دھجیاں بکھیرنے کے ساتھ ساتھ اخلاق و شرافت کا جنازہ بھی نکالنے لگے تھے۔ اُس دور میں بعض لیڈروں نے ذُو معنی اور مبتذل تقریریں کرنے میں بڑا نام پیدا کیا۔ اُنہوں نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے مجمع میں بھٹو کو ننگی گالیاں دیں اور خوب داد پائی۔

پریس کو بھٹو کی نظربندی کے بعد وہ کھلی چھٹی مل گئی جس کا اُسے مدت سے انتظار تھا۔ بھٹو کے بارے میں ملک گیر پیمانے پر پروپیگنڈہ کی مہم چلائی گئی جس کی چند جھلکیاں نذر قارئین ہیں۔

"بھٹو کے زمانہ میں ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی"۔ "جو جبر و استبداد بھٹو دور میں روا رکھا گیا اس کی مثال پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی"

"بھٹو قاتل' بے رحم' منتقم مزاج' آمر' فاشسٹ' سفاک اور درندہ تھا"

"اس کے دستِ ستم سے کوئی محفوظ نہ رہا نہ اپنے نہ بیگانے اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ تو صرف اور صرف اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا چاہتا تھا اس نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا

"میں کمزور سہی لیکن میری یہ کرسی کمزور نہیں جب اس نے یہ جملہ کہا تھا تو اس نے بڑے زور سے کرسی پر ہاتھ مارا تھا۔

"بھٹو کو اُس کا غرور و تکبر اور ظلم و جبر لے بیٹھا"

بھٹو کے اقتدار کو زوال آتے ہی پریس میں ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہو گیا۔ ہر کوئی بھٹو پر کیچڑ اچھالنے لگا نت نئی کہانیاں گھڑنے لگا۔ بھٹو کے بارے میں جو جس کے جی میں آیا اُس نے لکھ دیا اور چھاپنے والوں نے چھاپ کر خوب پیسے کمائے۔ وہ اخبار جن کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ بھٹو پر طرح طرح کی پھبتیاں کسنے اور سرخیاں باندھنے لگے۔ اخبار نویسوں نے بھٹو کے ماضی' اُس کے آباؤ اجداد' اس کے خاندان' اس کی بیوی' اس کی بیٹی' اس کے بیٹے' اس کے دوست' اس کے قریبی کسی کو بھی نہیں بخشا اور کیفیت یہ ہو گئی کہ۔

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ "مانیست"

www.bhutto.org

یہ کھیل بھٹو کا تختہ الٹتے ہی شروع ہو گیا اور پورے زور و شور سے جاری رہا۔ بھٹو جیل کی کوٹھڑی میں پہنچ گیا تب بھی بند نہ ہوا۔ اس کے خلاف عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا پھر بھی یہ کھیل رکا نہیں۔ جب اُسے ہائی کورٹ نے موت کی سزا سنائی تو اس کھیل میں اور جان پڑ گئی۔ معاملہ سپریم کورٹ میں پہنچا تو اس کھیل میں گرمی کی لہر دوڑ گئی۔ سپریم کورٹ نے بھٹو کی اپیل مسترد کرتے ہوئے سزائے موت کی توثیق کر دی۔ اُس وقت بھی یہ کھیل پوری سرگرمی سے جاری رہا۔ نظرثانی کی درخواست رد ہونے اور اس کے پھانسی پا جانے کے بعد بھی یہ کھیل پورے جوش و خروش سے جاری ہے اور نجانے کب تک جاری رہے گا۔ بھٹو کے نام پر "فیورٹ ڈش" بیچی اور کھائی جا رہی ہے۔ اسے کائنات کا بدترین انسان ثابت کرنے میں غلو اور مبالغہ سے کام لیا جا رہا ہے۔ بھٹو پر الزام تراشی کی مہم میں مردہ اخبار زندہ ہو گئے۔ برسوں سے سوئے ہوئے جرائد جاگے اور جنگِ زرگری میں شریک ہو گئے۔

اس مہم کے دوران اخلاق، آداب، شرافت اور انسانیت کے تمام اصولوں کو ملیامیٹ کر دیا گیا۔ بھٹو کا گوشت لفظوں کی صورت میں بیچا اور کھایا جانے لگا۔ اُس کی ذات، اُس کی زندگی اور اُس کی موت کے بارے میں کہانیاں بنائی اور گھڑی جانے لگیں۔ اس کے نام پر رُسوائی کا بازار گرم ہوا۔ کوئی تیر ایسا نہ تھا جو اس پر نہ چلایا گیا ہو، کوئی زخم ایسا نہ تھا جو اسے نہ لگایا گیا ہو۔ اسے رُسوائی کی کہانی کا عنوان بنا دیا گیا۔ جولائی 77ء سے لیکر اب تک ذرا دائیں بازو کے ان اخباروں اور ہفت روزوں پر ایک نظر ڈالیں تو ساری صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔

ان میں سے بھٹو کیلئے کسی کے دل میں رحم نہ تھا۔ انصاف نہ تھا، ان لوگوں کو اُس کی ذات میں کوئی خوبی دکھائی نہ دی۔ اُس کے تمام اوصاف عیوب میں بدل گئے۔ وہ مر گیا تو اُس کی لاش کو بھی نہیں بخشا گیا۔

وفاداری اور اُصول پرستی کی درخشاں مثال۔ راؤ عبدالرشید

سرکار کی سرپرستی میں کردار کشی اور بھٹو دشمنی کی اس مہم کے دوران حکومت کو بھٹو کے خلاف مقدمات میں گواہوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ جنس تو بازار میں فراواں اور ارزاں ملتی ہے۔ نوکر شاہی کا بر کل پرزہ اپنے سابق "باس" کے خلاف گواہی دینے اور اسے پھنسوانے پر تیار ہے۔ بعض دباؤ اور خوف سے اس کام میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئے۔ بعض معمولی ترغیب و تحریص سے رام ہو گئے۔ کچھ نے رضاکارانہ طور پر حکومت وقت کا ساتھ دینے پر کمر باندھ لی۔ سب نے اپنا ایمان بیچ دیا۔ بڑے بڑے پاٹے خان اور پھنے خان جو خود کو ہلاکو خان کہلاتے اور چنگیز خان بنتے تھے فوجی حکام کی ایک گھُرکی سے ڈھیر ہو گئے۔ معدودے چند ایسے تھے جنہوں نے ضمیر کی خلش کو محسوس کیا اصول پرستی کو شعار بنایا اور کسی دام تزویر میں نہیں پھنسے۔ ان میں سے ایک نمایاں نام راؤ عبدالرشید کا ہے۔ جو پولیس جیسی بدنام

www.bhutto.org

زمانہ فورس سے تعلق رکھتے تھے لیکن راجپوت ہونے کے ناطے قول کے دھنی نکلے۔ مارشل لاء حکومت نے انہیں بھٹو کے خلاف گواہی پر آمادہ کرنے کی غرض سے پہلے جبر اور ترہیب و تخویف سے کام لیا۔ انہیں پکڑ کر جیل میں ڈالا۔ اٹک کے قلعہ میں رکھ کر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ ان کے اہل خانہ کو بھی ہراساں کیا۔ اُن کی بیگم اور جوان بچیوں کو بھی قید و بند کے مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ جب یہ حربہ ناکام نظر آیا تو لالچ اور ترغیب کا جال پھیلایا۔ راؤ صاحب کو تمام مقدمات ختم کر کے کسی ملک میں سفیر بنانے کی پیشکش کی گئی۔ لیکن راؤ رشید کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور بدستور بھٹو سے وفاداری کا دم بھرتے رہے۔ انہوں نے اپنے عمل سے نہ صرف پولیس فورس کا وقار بلند کیا بلکہ راجپوت برادری کا سر بھی فخر سے بلند کر دیا۔ انہوں نے کم و بیش دو سال جیل کاٹی طرح طرح کی صعوبتیں سہیں لیکن اپنے ضمیر کو بیچا اور ایمان و اصول پرستی سے منہ کو ارا نہیں کیا۔ ان کی ثابت قدمی اور اصولوں سے وابستگی نے اس بات کی شہادت فراہم کر دی کہ وہ اپنی جان تو دے سکتے ہیں مگر آن پر دھبہ نہیں لگنے دیں گے۔ راؤ رشید کے اس مثالی کردار کا بھٹو نے کھل کر اعتراف کیا اور جیل سے بھیجے گئے پیغام میں راؤ صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

"میں نے راؤ رشید جیسے دلیر اور وفادار آدمی بہت کم دیکھے ہیں"

بے نظیر بھٹو نے اپنے دورِ حکومت میں ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں وفاقی سیکرٹری کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔

بھٹو کا اعزاز

منفی پروپیگنڈہ کے اس تمام تر طوفان بدتمیزی اور تذلیل و تحقیر کی اس ساری یک طرفہ مہم کے باوجود بھٹو سے کوئی اس کا یہ اعزاز نہیں چھین سکتا کہ

☆ وہ اس ملک کا پہلا منتخب وزیر اعظم اور ایک دانشور سیاست دان تھا۔ عوام نے اُسے اپنے اعتماد اور بے پناہ عقیدت و پیار سے نوازا تھا۔

☆ اُس نے قوم کو 1973ء کا متفقہ آئین دیا جسے تمام تر ردوبدل اور ترامیم کے باوجود آج بھی ملک کی سب سے مقدس دستاویز سمجھا جاتا ہے۔

☆ اُس نے اس ملک کے عوام کو نیا سیاسی تصور دیا اُن میں سیاسی شعور پیدا کیا۔

☆ اس نے ملک کو اس وقت سنبھالا دیا جب ملک دولخت ہو چکا تھا اور ہماری کشتی گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔

☆ اُس نے شملہ معاہدہ کر کے بھارت کی قید سے 90 ہزار جنگی قیدیوں کو رہائی دلائی اور اُس کے قبضہ سے پانچ ہزار مربع میل علاقہ خالی کرایا۔

☆ اُس نے ملک میں پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کرا کے عالمِ اسلام کے اتحاد و یکجہتی کیلئے عظیم

www.bhutto.org

کوششیں کیں۔

☆...... اُس نے مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دے کر ختمِ نبوّت کے سو سالہ پرانے مسئلہ کو ختم کرایا۔ اس کارنامہ پر اُس کے بدترین مخالف آغا شورش کاشمیری نے اُسے مبارک باد دی تھی اور اس موقع پر ایک پُرجوش نظم میں اُسے خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

معرکۂ ختمِ نبوت

جنابِ ذوالفقار علی بھٹو کی نذر

ناموسِ مصطفیٰؐ کے نگہدار، زندہ باد
میرِ اُمَمؐ کے غاشیہ بردار، زندہ باد

نوے برس کا ایک قضیّہ کیا ہے طے
بادہ گسارِ احمدِ مختارؐ، زندہ باد

سر کرلیا ہے ختمِ نبوّت کا معرکہ
زندہ دلانِ لشکرِ احرار، زندہ باد

جھکتا نہیں ہے پرچمِ دینِ ہُدیٰ کبھی
رکتی نہیں ہے دین کی للکار زندہ باد

پرچم ہے سرفراز رسالت مآبؐ کا
لایا ہے رنگ جذبۂ ایثار، زندہ باد

ازبسکہ ذوالفقارِ علی بے نیام ہے
خنجر بکف ہے قافلہ سالار، زندہ باد

برطانوی نژاد نبوّت کا ارتحال
نرغے میں آگئے ہیں سیہ کار، زندہ باد

بھٹو کا نام زندۂ جاوید ہو گیا
شورش شکست کھا گئے اشرار، زندہ باد

شورش کاشمیری
چٹان۔ ۱۰ تا ۱۶ ستمبر ۱۹۷۴ء

www.bhutto.org

☆..... بھٹو کے کردار کی اس خوبی اور عظمت سے تاریخ کا کوئی طالب علم انکار نہیں کر سکتا کہ اُس نے عالمی سیاست میں ایک بھرپور اور فعال کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ اسے فلسطینی عوام کی جدوجہدِ آزادی کا پرجوش باعمل اور سچا ترجمان تسلیم کیا گیا۔

☆..... اُس نے پاکستان کو عالمی برادری میں نیا مقام دلایا۔

☆..... اُس نے خارجہ پالیسی میں دُور رس اور دیرپا تبدیلیاں کیں اور پاکستان کیلئے ایسے مخلص دوست اور ہمدرد ممالک تلاش کئے جن کی دوستی پر ہمیشہ اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

☆..... اس نے بڑی بڑی طاقتوں کو بلاخوف وخطر جرأت و بیباکی سے للکارا۔ اپنے ملک کو ایٹمی طاقت بنانے کے سوال پر وہ امریکہ جیسی سپر پاور سے ٹکرا گیا اور ہنری کسنجر کی دھمکیوں کو پرِکاہ کے برابر وقعت نہیں دی۔

☆..... اُس نے ملکی معیشت میں پہلی بار انقلابی تبدیلیاں برپا کیں۔ صنعتوں اور کارخانوں کو قومی تحویل میں لینے کا سہرا اُسی کے سر بندھتا ہے۔

☆..... اُس نے تیسری دنیا کے ممالک اور عوام کیلئے عظیم اور شاندار خدمات انجام دیں۔

☆..... اُس نے جواء شراب، ریس اور نائٹ کلبوں پر پابندی لگائی اور ایک بار شراب خوری سے توبہ کرنے کے بعد مرتے دم تک منہ سے جام نہیں لگایا۔ اپنی تمام بشری خامیوں اور اخلاقی کمزوریوں کے باوجود بھٹو ایک لیجنڈ بن گیا ہے۔ ایک ایسی روایت جو زندہ و تابندہ رہے گی۔

جولائی 77ء سے مارچ 78ء تک کے بعض اہم واقعات

جولائی 77ء میں حکومت کے خاتمہ، ستمبر میں بھٹو کی گرفتاری و نظربندی اور مارچ 78ء میں سزایابی کے درمیانی عرصہ میں بعض اہم اور دور رس نتائج کے حامل واقعات رونما ہوئے۔ ان پر سرسری نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

20 ستمبر 77ء..... بیگم نصرت بھٹو نے اپنے شوہر کی گرفتاری کو غیر قانونی قرار دلوانے کیلئے سپریم کورٹ میں ہیبس کارپس کی درخواست پیش کی۔ جسے عدالت نے باقاعدہ سماعت کیلئے منظور کر لیا۔ حکومت نے اس درخواست کو اس بنیاد پر چیلنج کیا کہ عدالت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے کسی حکم کے خلاف سماعت کا اختیار نہیں رکھتی۔

22 ستمبر 77ء چیف جسٹس یعقوب علی خان ریٹائر کر دیئے گئے۔

23 ستمبر 77ء..... نئے چیف جسٹس شیخ انوار الحق نے سپریم کورٹ کے دیگر ججوں کے ساتھ مارشل لاء حکومت سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اس حلف سے یہ الفاظ حذف کر دیئے گئے کہ "وہ آئین کو برقرار رکھیں گے اور اس کی حفاظت کریں گے" اس کے بعد 1973ء کے آئین کے ساتھ سپریم کورٹ کے

ججوں کی کوئی مطابقت و ہم آہنگی باقی نہیں رہی۔

24 ستمبر 77ء..... بے نظیر بھٹو کو گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ نصرت بھٹو کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔

10 نومبر سپریم کورٹ نے بھٹو کی رہائی کی درخواست مسترد کر دی اور غیر آئینی عمل کے بارے میں معروضات بھی رد کر دیں۔ فیصلہ میں مارشل لاء کے نفاذ کو نظریۂ ضرورت کے تحت محدود مدت کیلئے جائز قرار دے دیا گیا۔ عدالت نے جنرل ضیاء کے اس وعدہ کو سامنے رکھا کہ مقدمات کے خاتمہ کے بعد جتنی جلد ممکن ہو گا انتخابات کرائے جائیں گے۔ سپریم کورٹ نے توقع ظاہر کی کہ اس وعدہ کو پورا کیا جائیگا۔

16 دسمبر 77ء..... قذافی سٹیڈیم میں کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے لاٹھی چارج سے بے نظیر اور نصرت بھٹو زخمی ہو گئیں۔

17 دسمبر 77ء..... عدالت میں ناخوشگوار تُو تکار۔ جس کے بعد چیف جسٹس نے بھٹو کو عدالتی کارروائی سے خارج کرا دیا۔ 13 نومبر سے 5 دسمبر تک بھٹو کی غیر حاضری میں سماعت ہوتی رہی۔

18 دسمبر..... نصرت بھٹو کو حراست میں لے لیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے قائدین اور کارکنوں کی اجتماعی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔

5 جنوری 78ء..... یومِ جمہوریت کے موقع پر ہنگامہ آرائی و ہلڑ بازی' جس کے دوران سینکڑوں افراد زخمی ہو گئے۔

9 جنوری انتقال مقدمہ کی بابت بھٹو کی درخواست چیمبرز میں ہی مسترد کر دی گئی۔

ان حالات و واقعات سے متاثر ہو کر بھٹو نے 10 جنوری 78ء کو اپنے وکلاء کے مختار نامے منسوخ کر دیئے اور عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس کے بعد نہ وہ خود عدالت میں پیش ہوئے۔ نہ کارروائی میں کوئی حصہ لیا۔ ہم یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ پیش آمدہ حالات میں بھٹو نے بائیکاٹ کا جو فیصلہ کیا وہ درست تھا یا غلط؟

www.bhutto.org

چھٹا باب

کیا سماعت منصفانہ تھی؟

جیسا کہ ہائی کورٹ کے فیصلہ سے ظاہر ہے، بھٹو کو نواب محمد احمد خان کے قتل کی سازش کا بانی، قاتل اور بنیادی و مرکزی بڑے ملزم کی حیثیت سے سزایاب کیا گیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا مقدمہ کی سماعت بغض و عناد سے پاک اور منصفانہ تھی یا یہ بہت سی خامیوں، غلطیوں اور فروگذاشتوں سے معمور سماعت تھی؟ اس سوال کا جواب دینے کیلئے ہمیں ذیل کے اہم واقعات و عوامل کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔

1۔ شک کا فائدہ ملزم کی بجائے استغاثہ کو دیا گیا

قانون و انصاف کی دنیا کا یہ ایک مسلّمہ اور بین الاقوامی اصول ہے کہ شک کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کیس اس لحاظ سے بڑا ہی انوکھا اور ناقابل یقین ہے کہ اس کے فیصلہ میں متعدد جگہ شک پیدا ہونے کی صورت میں شک کا فائدہ ملزم کو دینے کی بجائے استغاثہ کو دے کر اس کی ناقابل یقین بات کو قبول کر لیا گیا۔ مثال کے طور پر استغاثہ کا دعویٰ تھا کہ جائے واردات سے برآمد ہونے والے خالی کارتوسوں میں ردّوبدل کیا گیا تھا۔ صفائی نے جرح کر کے اس دعویٰ کو غلط اور مشکوک بنا دیا تو بینچ نے شک کا فائدہ دے، کر استغاثہ کی بات کو درست تسلیم کر لیا۔ اسی طرح وقوعہ میں استعمال ہونے والی جیپ کی لاگ بک کو صفائی نے بہت سے جائز اور قانونی اعتراضات کر کے شہادت میں ناقابل قبول بنا دیا۔ اس کے باوجود عدالت نے لاگ بک کے مندرجات کو شہادت میں قبول کر لیا۔ اس سلسلے میں یوں تو بہت سے فیصلوں کے حوالے دیئے جاسکتے ہیں کہ عدالت نے کس طرح معمولی شک پڑ جانے کی بناء پر ملزم کو چھوڑ

www.bhutto.org

دیا تاہم پاکستان کی سپریم کورٹ کے ممتاز جج جناب محمد منیر کے ایک فیصلہ کا حوالہ دینا کافی ہو گا جس کے حقائق کچھ یوں تھے کہ کافی عرصہ پہلے راولپنڈی میں محمد بخش نامی وکیل کو کسی نے قتل کروا دیا۔ کیس کی تحقیقات کی گئی تو قانون کے ہاتھ اصل ملزم تک پہنچ گئے۔ اس نے اعترافِ جرم کر لیا۔ اس کے اقبالِ جرم کے محرکات کی بناء پر اسے پھانسی کی سزا ہو گئی۔ معاملہ اپیل کی صورت میں سپریم کورٹ تک پہنچا ایک گواہ نے جسے پولیس والوں نے "چانس وٹنیس" قرار دیا تھا۔ عدالت کو بتایا کہ "میں صبح تین بجے میونسپل کمیٹی کے نلکا سے پانی بھر رہی تھی جب ایک کار آئی اس میں سے کچھ افراد اُترے اور وہ محمد بخش کو کار میں ڈال کر لے گئے اس کے بعد وہ واپس نہیں آیا کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ اُسے قتل کر دیا گیا ہے"

گواہ سے کار کے رنگ کے بابت سوال کیا گیا تو اس نے بتایا کہ کار کالے رنگ کی تھی جبکہ حقیقت میں اس کا رنگ "ڈارک براؤن" تھا۔ اس پر شک پیدا ہو گیا اور جسٹس منیر نے شک کا فائدہ دیتے ہوئے ملزم کو بری کر دیا۔ قانونی ذخیرہ ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے کہ شک کے فائدہ کا مستحق ہمیشہ ملزم کو سمجھا جاتا ہے۔ بھٹو کیس اس لحاظ سے منفرد اور اپنی مثال آپ تھا کہ اس میں کئی جگہ شک پیدا ہوا لیکن اس کا فائدہ ملزم کی بجائے استغاثہ کو دے دیا گیا۔

2۔ ملزم اور بینچ کے درمیان اعتماد کا فقدان

یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں کہ بھٹو کو شروع ہی سے بینچ پر اعتماد نہیں تھا خصوصاً بینچ کے سربراہ قائم مقام چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کو بھٹو سے ذاتی رنجش اور عناد تھا۔ جیسا کہ ہم چوتھے باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں مولوی مشتاق کو بھٹو سے یہ شکایت تھی کہ آخرالذکر نے اپنے دورِ حکومت میں دوبار اُن کے جونیئروں کو ان پر سبقت دے کر لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا اور مولوی صاحب کی حق تلفی کی۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران جسٹس موصوف نے قدم قدم پر بھٹو کی تذلیل و اہانت کی اور اُن کی توہین کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مقدمہ کی کارروائی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو جا بجا ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے بھٹو کے خلاف بینچ کے سربراہ کا بغض و عناد ٹپکتا ہے۔ مثال کے طور پر بھٹو کیلئے راتوں رات خصوصی کٹہرا کی تیاری' 17 دسمبر 77ء کا ناخوشگوار واقعہ اور بات بات پر بھٹو کو "شٹ اپ" اور سِٹ ڈاؤن" جیسے الفاظ سے نوازنا جن غیر ملکی ماہرین قانون نے عدالت کی کارروائی دیکھی۔ ریکارڈ پر ان کی یہ شہادت موجود ہے کہ جسٹس مشتاق حسین کا رویہ' بھٹو کے معاملہ میں بڑا ہی جارحانہ اور معاندانہ تھا۔ ظاہر ہے جو جج ملزم کی جائز بات بھی نہ سُنے اور معمولی معمولی باتوں پر طیش میں آ جائے اُس سے منصفانہ سماعت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان باتوں سے تنگ آ کر بھٹو نے اپنا مقدمہ کسی اور بینچ کو منتقل کرنے کی درخواست کی تو وہ بغیر سُنے چیمبر میں ہی مسترد کر دی گئی۔ ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ بھٹو کو بینچ پر قطعی اعتماد نہیں تھا۔

www.bhutto.org

3۔ بینچ اور وکلائے صفائی کے مابین عدم اعتماد

مقدمہ کے مرکزی کردار بھٹو کے علاوہ وکلائے صفائی کے ساتھ بھی لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا رویہ انتہائی جارحانہ تھا۔ خصوصاً بھٹو کے سینئر وکیل مسٹر ڈی ایم اعوان کو تو وہ بات بات پر جھڑکتے تھے۔ ابتداء ہی میں جبکہ مقدمہ کی کارروائی ہموار نہیں جا رہی تھی مسٹر اعوان ایک نکتہ پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"مائی لارڈ" کہہ کر انہوں نے بات شروع کی۔

"سِٹ ڈاؤن" چیف جسٹس نے چیختے ہوئے کہا۔ بینچ کے اس رویہ پر مسٹر اعوان نے صاف اور سنائی دینے والی آواز میں احتجاج کیا۔

"مائی لارڈ" ہم جانتے ہیں کہ تمام پابندیاں اور بندشیں صرف وکیلِ صفائی کیلئے ہیں"

مسٹر اعوان نے سپریم کورٹ کو بتایا کہ مولوی مشتاق حسین اس حد تک بڑھ گئے کہ ایک دن انہوں نے اپنے مؤکل کی طرف سے دائر کردہ درخواست کی نقل اُن کے منہ پر دے ماری۔

چیف جسٹس نے انہیں لاتعداد جھڑکیوں اور دھمکیوں کا نشانہ بنایا۔ اس کے برعکس وہ وکلائے استغاثہ اور شریک ملزمان کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور ان کی معروضات بڑی توجہ سے سنتے تھے۔ راؤ رشید تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "مولوی مشتاق حسین اور ایم انور بار ایٹ لاء کیس کے چلنے سے پہلے ہر قدم پر مشورہ کر کے تفتیشی افسران کو ہدایات دیتے تھے۔ ساری تفتیش مولوی مشتاق کے زیرِ ہدایت ہوئی۔ وہی بعد میں سماعت کنندہ بینچ کے سربراہ مقرر ہوئے۔ یہ اتنی بڑی سازش تھی کہ لوگوں نے اپنا ضمیر، اپنا ایمان بلکہ اپنی ہر چیز بیچ دی"۔

(جو میں نے دیکھا، راؤ عبدالرشید) صفحہ 259۔

4۔ بینچ سے دو ججوں کا اخراج

مارشل لاء حکومت اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین بھٹو سے اتنے الرجک تھے کہ انہوں نے قانون و انصاف کے بنیادی اصولوں کو پامال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ جسٹس ایم کے صمدانی کی سربراہی میں جس بینچ نے بھٹو کی ضمانت منظور کی تھی ۔ اس بینچ کے دونوں ججوں کو کیس کی سماعت کرنیوالے بینچ میں شامل نہیں کیا گیا۔ اسی پر بس نہیں پہلے جسٹس صمدانی کا ہائی کورٹ سے تبادلہ کیا گیا۔ بعد میں انہیں فارغ کر کے چلتا کر دیا گیا۔ وہ بے چارے کئی سال تک ولایت میں جلاوطنی کی زندگی گزارتے رہے اور مارشل لاء اُٹھنے کے بعد وطن لَوٹے۔

5۔ بند کمرے میں سماعت

عدل گستری کا بنیادی اصول ہے کہ مقدمہ کی سماعت کھلے کمرہ میں ہونی چاہئے لیکن بھٹو کے معاملہ

میں اس قاعدہ کلیہ کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا۔ ہائی کورٹ میں ہونیوالی 70 دنوں میں سے 18 دن کی سماعت بند کمرے میں ہوئی۔ فوجداری مقدمات میں یہ اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے۔ بھٹو کے وکلاء نے عدالت کو یاد دلایا کہ ضابطہ فوجداری میں بند کمرے میں سماعت کی کہیں گنجائش نہیں۔ ایسی سماعت صرف تین صورتوں میں کی جاسکتی ہے اولاً "بچوں سے متعلق معاملات میں' ثانیاً خانگی امور میں اور ثالثاً ایسے مقدمات میں جن کے دوران کمرہ عدالت میں ہلڑبازی کا اندیشہ ہو۔ لاہور ہائی کورٹ نے بند کمرے میں سماعت سے متعلق جو حکم جاری کیا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ 25 جنوری 78ء کو بھٹو کے حامیوں نے چیف جسٹس کے کمرہ کے باہر جو غل غپاڑہ کیا تھا اس سے ہلڑبازی اور نقص امن کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے آئندہ سماعت بند کمرے میں ہوگی وہ سراسر بدنیتی پر مبنی تھا۔ کیونکہ ہائی کورٹ کے اردگرد جس قسم کے حفاظتی انتظامات بروئے کار لائے جاتے تھے ان کی موجودگی میں ہلڑبازی قطعاً خطرہ نہیں تھا۔ اگر اس کا کچھ امکان تھا بھی تو مذکورہ بالا انتظامات کو مزید سخت کر کے صورتِ حال پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ بہرحال بند کمرے میں سماعت سراسر ناجائز اور بلاجواز تھی۔

6۔ ملزم کی غیر حاضری میں سماعت

بھٹو کے خلاف مقدمہ کی سماعت میں اس مسلمہ اصول کی خلاف ورزی بھی کی گئی کہ سماعت بہرصورت ملزم کی موجودگی میں ہونی چاہئے۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کارروائی کے دوران 13 نومبر 77ء کو بھٹو اچانک بیمار ہو گئے۔ ان کی طرف سے عدالت میں میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کیا گیا تو صرف دو دن کی غیر حاضری کی اجازت دی گئی لیکن ساتھ ہی وکیل صفائی کو خبردار کر دیا گیا کہ اگر ملزم 15 تاریخ کو عدالت میں حاضر نہ ہوا تو اس کی غیر موجودگی میں سماعت جاری رکھی جائیگی۔ 15 نومبر کو محکمہ صحت پنجاب کے ایک بڑے ڈاکٹر نے جیل میں بھٹو کا میڈیکل چیک اپ کرنے کے بعد تصدیق کی کہ واقعی وہ بخار' انفلوئنزا' گلے کی تکلیف اور سانس میں رکاوٹ کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اس کے باوجود عدالت نے ان کی واپسی کا انتظار کئے بغیر سماعت شروع کر دی۔ تقریباً تین ہفتے تک ملزم کی عدم موجودگی میں سماعت جاری رہی۔ اس دوران 15 گواہوں کی شہادتیں اور ان پر جرح ریکارڈ کی گئی۔ بھٹو ان گواہوں پر کوئی جرح نہ کر سکے۔ اس طرح انصاف کے ایک بنیادی حق سے محروم کر کے انہیں زبردست نقصان پہنچایا گیا۔

7۔ گواہوں کے بیانات میں اضافے' تناقضات' تضاد بیانیاں اور

گواہان استغاثہ کے ساتھ بینچ کے غیر معمولی ہمدردانہ رویہ اور شفقت آمیز سلوک کے بارے میں سماعت کا مشاہدہ کرنے والے ایک غیر ملکی قانون دان کا یہ تبصرہ ریکارڈ پر موجود ہے کہ:۔

"اکثر و بیشتر استغاثہ کے گواہوں کی شہادت کو سیاجاتا چمکایا جاتا اور چپکانے کیلئے سخت کیا جاتا تھا یعنی

www.bhutto.org

پوری طرح لکھا پڑھا کر گواہی دلوائی جاتی تھی۔ گواہ کی حمایت میں جانے والے بیان کے حصہ میں جس انداز میں مداخلت کی جاتی تھی اسے دیکھ کر میں حیرت زدہ ہو جاتا تھا۔ گواہ کو ترغیب دی جاتی اور موقع فراہم کیا جاتا کہ وہ اپنے بیان سے پھر جائے یا اس میں تبدیلی کرے۔ وکلائے صفائی بار بار گواہوں کے بیانات میں پائی جانیوالی تضاد بیانیوں اضافوں اور اصلاحوں کی نشان دہی کرتے تھے لیکن بینچ اُن کی معروضات کو سُنی اَن سُنی کر دیتا تھا۔ یوں سماعت میں بہت سی خامیاں 'فروگذاشتیں' بے قاعدگیاں اور بے ضابطگیاں روا رکھی گئیں۔ جن کی موجودگی میں فیصلہ کو منصفانہ کہنا انصاف کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔

8۔ بھٹو کے چال چلن پر بیجا نکتہ چینی

بینچ مسٹر بھٹو کے ساتھ اس قدر تعصب رکھتا تھا کہ مقدمہ کے پیراگراف نمبر 610 تا 616 میں اپنے ضابطہ اور معمول کے طریق کار سے ہٹ کر ملزم کے مذہبی عقائد اس کی سیرت و کردار اور چال چلن پر بیجا نکتہ چینی کی گئی۔ سپریم کورٹ نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے فیصلہ سے مذکورہ بالا پیراگراف حذف کرنے کا حکم دیا۔ سماعت کے دوران جسٹس مشتاق حسین نے بھٹو کو بار ہا یاد دلایا کہ وہ "عادی مجرم" ہیں۔ اُنہیں "نام کا مسلمان" اور بڑا ملزم کہا گیا۔ اُن کے چال چلن کو اسلامی طرز حیات کے منافی قرار دیا گیا۔ چیف جسٹس کا کہنا تھا کہ عادی مجرم ہونے کی بناء پر وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں جب بھٹو نے شکایت کی کہ ان کی کوٹھڑی کے قریب ہی پاگلوں کو رکھا گیا ہے جو دن رات چیختے چلاتے شور مچاتے اور ان کی نیند حرام کرتے ہیں تو چیف جسٹس نے جواب دیا "ہمیں معلوم ہے تم آرام دہ زندگی کے عادی ہو لیکن جیل میں ویسی سہولتوں کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا"۔ بھٹو کے ساتھ "خصوصی سلوک" کے طور پر راتوں رات ایک کٹہرا بنایا گیا اور اس میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ بھٹو نے احتجاج کرتے ہوئے بینچ کو یاد دلایا کہ اسی عدالت میں نواب آف کالاباغ کے بیٹے پر قتل کا مقدمہ چلایا گیا تھا لیکن انہیں کٹہرے میں نہیں بٹھایا گیا تھا۔ اس پر طنز کرتے ہوئے کہا گیا کہ "تمہیں آرام کرسی کی ضرورت ہے یہاں وہ نہیں مل سکتی"۔ ایک اسلامی ملک میں کسی شخص کیلئے جو صدر اور وزیر اعظم جیسے مناصب پر فائز رہ چکا ہو خود کو مسلمان ثابت کرنا بڑی ہی تکلیف دہ بات ہے عدالت عالیہ کے زیر غور یہ مسئلہ نہیں تھا کہ ملزم اچھا مسلمان ہے یا نام کا مسلمان بینچ کی طرف سے اس موضوع کو خواہ مخواہ زیر بحث لایا گیا۔ نیز طعن آمیز اشارات و کنایات استعمال کئے گئے۔ جو کسی لحاظ سے پسندیدہ بات نہیں تھی۔

9۔ وعدہ معاف گواہوں کی شہادت پر غیر ضروری انحصار

ایک اور وجہ جس کی بناء پر ہائی کورٹ کے فیصلہ کو قرین انصاف قرار نہیں دیا جا سکتا یہ ہے کہ بینچ نے وعدہ معاف گواہوں مسعود محمود اور غلام حسین کی گواہی پر غیر ضروری انحصار کیا حالانکہ وعدہ معاف گواہ

www.bhutto.org

کسی طور شریکِ جرم سے بہتر نہیں ہوتا اور اس کی گواہی اس وقت تک قبول نہیں کی جا سکتی جب تک اس کی قوی تائید میسّر نہ آ جائے۔ قانونِ شہادت کی دفعہ 114 کی تمثیل (ب) کے تحت عدالت کسی شریکِ جرم کو ناقابلِ اعتبار فرض کر سکتی ہے۔ اگر اہم کوائف میں اس کی گواہی کی تائید میسّر آ جائے تو اس کی شہادت قبول کی جا سکتی ہے اس قیاس کے پیشِ نظر عدالتوں نے یہ رہنماء اصول اپنا لیا ہے جسے اصولِ قانون کا درجہ حاصل ہو گیا ہے کہ شریکِ جرم کی شہادت چونکہ فاسد اور داغدار ہوتی ہے اس لئے عام طور سے اس کیلئے تائید کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اصولِ قانون کے مطابق وعدہ معاف گواہ کی شہادت کیلئے دوہرے ٹیسٹ پر پورا اترنا ضروری ہوتا ہے ایک طرف اس کی شہادت سے یہ ثابت ہونا چاہئے کہ وہ قابلِ اعتبار ہے دوسرے اس کی گواہی کو کافی اور قوی تائید میسّر آنی چاہئے۔

اس اصول کی روشنی میں مسعود محمود اور غلام حسین کی شہادتوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بہت سی خامیاں سقم اور خلاء پائے جاتے ہیں۔ جسٹس دراب پٹیل اور غلام صفدر شاہ نے اپنے تفصیلی فیصلوں میں وعدہ معاف گواہوں کی شہادت میں پائے جانے والے تضادات 'غلط بیانیوں 'اضافوں 'اور بے قاعدگیوں کی بڑی شرح وبسط سے نشان دہی کرنے کے بعد ان کی شہادت کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔ اندریں حالات وعدہ معاف گواہوں کی شہادت پر ضرورت سے زیادہ انحصار کرنے والے فیصلہ کو منصفانہ نہیں کہا جا سکتا۔

10۔ ہائی کورٹ کے فیصلہ پر بعض تبصرے

چونکہ اس کیس کو غیر معمولی اہمیت اور پبلسٹی حاصل ہوئی اس لئے مقدمہ کی سماعت کے دوران بعض غیر ملکی ماہرینِ قانون پاکستان آئے اور انہوں نے کچھ دن یہاں ٹھہر کر مقدمہ کی کارروائی سُنی۔ ان لوگوں نے سماعت کے متعلق جو کچھ کہا اور صدورِ فیصلہ کے بعد اندرون و بیرون ملک اس فیصلہ پر جو رائے زنی کی گئی وہ بڑی وقیع اور قابلِ مطالعہ ہے۔ چیدہ چیدہ آراء کا خلاصہ نذرِ قارئین ہے تاکہ وہ اندازہ لگا سکیں کہ سماعت کس حد تک منصفانہ تھی اور کس حد تک غیر منصفانہ۔

ا۔ ریمزے کلارک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل مسٹر ریمزے کلارک مقدمہ کی سماعت کے دنوں میں لاہور آئے۔ انہوں نے کئی دن تک کارروائی سُنی اور پھر حسبِ ذیل تجزیہ پیش کیا۔

"سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ جن دو ججوں نے بھٹو کی ضمانت منظور کی تھی انہیں ٹرائل بینچ سے کیوں خارج کر دیا گیا۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ چیف جسٹس نے خود کو بینچ میں شامل کر لیا جبکہ وہ بھٹو کے ساتھ اس لئے عناد رکھتا تھا کہ ترقی کے معاملہ میں بھٹو نے اس کی حق تلفی کی تھی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جو بڑے گواہ پیش کئے گئے ان کی شہادت بہت مشکوک تھی آخری بات یہ کہ بھٹو کے خلاف چیف جسٹس کا تعصب فیصلہ کے پورے 145 صفحات پر پھیلا ہوا ہے"

www.bhutto.org

ب..... جان میتھوز کیوسی

عظیم انگریز قانون دان جان میتھوز کیوسی بھی نومبر 77ء میں لاہور آئے۔ کارروائی سننے کے بعد ان کا تبصرہ کچھ یوں تھا:

"گواہ کی حمایت میں جانے والے بیان کے حصہ میں بینچ کی طرف سے جس انداز میں مداخلت کی جاتی تھی میں اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ گواہ کو یوں ترغیب دی جاتی اور موقع فراہم کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے بیان سے پھر جائے یا اس میں رَدّوبدل کر لے۔ پھر جو کچھ کیا جارہا تھا۔ ٹائپسٹ اسے ساتھ کے ساتھ ٹائپ نہیں کرتا تھا بلکہ عدالت اسے اصلی سوال اور اس کا حتمی جواب ڈکٹیٹ کراتی تھی۔ اکثراوقات ایسا ہوتا تھا کہ گواہ نے پہلے جو کچھ کہا ہوتا تھا عدالتی بیان اس سے ہم آہنگ نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے بینچ کے متکبرانہ انداز اور مخاصمانہ رویہ کا نوٹس لیتے ہوئے کہا کہ چیف جسٹس جلد طیش میں آجاتے تھے ان کے اشتعال اور رویہ میں اس حد تک شدت آگئی تھی کہ بھٹو نے مجبور ہو کر مقدمہ کو کسی دوسرے بینچ میں منتقل کرانے کی درخواست کی۔ جب ان کی وہ استدعا نامنظور کر دی گئی تو انہوں نے ناچار کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا"

ج..... جان میلویل ولیمز

ہائی کورٹ کی کارروائی ملاحظہ کرنے کے بعد ایک اور ممتاز ماہر قانون جان میلویل ولیمز نے اس رائے کا اظہار کیا تھا:

جب بی بی سی کے نمائندہ نے اُن سے گواہوں پر دباؤ اور جبر کی بابت سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا۔

تمام گواہوں کے بیانات میں ایک طرح کی مکمل یکسانیت اور مشابہت پائی جاتی تھی۔ جس سے اس شبہ کو تقویت ملتی تھی کہ وہ شدید دباؤ کے تحت تھے وہ کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچانا چاہتے تھے۔ ملک میں سیاسی پس منظر اس طرح کا تھا کہ گواہ اپنے آپ کو پوری طرح جبر اور دباؤ کے نیچے محسوس کرتے تھے"

د..... لندن ٹائمز کا اداریہ

فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور عالمی جریدہ ٹائمز (لندن) نے "وہ شہید بن جائیگا" کے زیرِ عنوان اداریہ میں لکھا:-

"یہ مقدمہ دراصل ایک سیاسی مقدمہ تھا۔ ہر عدالت شہادت کو کبھی اتنا حتمی اور ناقابلِ تغیر قرار نہیں دیتی جیسا کہ پنجاب ہائی کورٹ نے کیا۔ اخبار نے مقدمہ کے استحقاق پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا تاہم یہ فیصلہ دیا کہ اگر بھٹو کو رہا کر دیا گیا تو وہ زیادہ خطرناک سیاسی حریف ثابت ہوں گے۔ ہر شخص اچھی طرح جانتا تھا کہ نئی حکومت یہی چاہتی تھی کہ انہیں مجرم قرار دیا جائے اس دوران حکومت نے اپنے مخالفوں کو بڑی سختی اور مستعدی سے دبائے رکھا۔ یوں عدالت ایک سوچے سمجھے سیاسی دباؤ کے تحت تھی۔ ہو سکتا ہے

www.bhutto.org

انجام کار اس کے اچھے اثرات مرتب نہ ہوں لیکن یہ ناگزیر اور لازمی ہے کہ اس کے اثرات بھٹو کے حامیوں کے حق میں جو اس فیصلہ کو قبول نہیں کریں گے، مثبت نہیں ہوں گے۔

ہ...... جرمن اخبار کی رائے

جرمنی کے معروف اخبار "فرینکفرٹ رالیمگیئرز" نے پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے اداریہ میں لکھا:

"یہ کیسے ممکن ہوا کہ بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد اس کے سب سے بڑے سیاسی حریف پختون رہنماء خان عبدالولی خان کو رہا کر دیا گیا۔ حالانکہ پاکستان کی سپریم کورٹ نے اسے تخریب کاری اور سازش کا مجرم قرار دے کر طویل مدت کی سزائے قید دی تھی یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا تاہم ایسے شبہات موجود ہیں کہ پاکستانی جج برسر اقتدار آنے والے حکام کے منشا اور اُن کی خواہشات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ جس جج نے ٹرائل بینچ کی سربراہی کی اور سابق وزیر اعظم کو موت کی سزا سنائی اس نے کئی مواقع پر اپنے معاندانہ رویہ کا اظہار کیا۔ بھٹو نے جرم کا ارتکاب کیا تھا یا نہیں یہ ایک الگ معاملہ ہے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ بھٹو کے مقدمہ کی سماعت منصفانہ نہیں ہوئی تھی"۔

کچھ اور ناانصافیاں جو روا رکھی گئیں

مذکورہ بالا اہم زیادتیوں اور فرو گذاشتوں کے علاوہ ہائی کورٹ میں مقدمہ کی سماعت کے دوران اور فیصلہ میں درج ذیل چھوٹی موٹی ناانصافیاں بھی روا رکھی گئیں۔

1۔ مقدمہ کی براہِ راست ہائی کورٹ میں سماعت

بھٹو کے خلاف کیس بلاشبہ فوجداری نوعیت کا تھا۔ جس کے بارے میں قصوری نے ایڈیشنل سیشن جج لاہور کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا تھا۔ اصولی طور پر اس کی ابتدائی سماعت سیشن جج کی عدالت میں ہی ہونی چاہئے تھی لیکن اسکی سماعت ہائیکورٹ نے براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یوں بھٹو کو سیشن کورٹ کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کے حق سے محروم کر دیا گیا۔

2۔ اپیل کیلئے سات دن کی مہلت

کسی ہائی کورٹ کے صادر کردہ فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کیلئے عموماً 30 دن کی مدت دی جاتی ہے لیکن بھٹو کے ساتھ اس معاملہ میں بھی امتیازی سلوک روا رکھا گیا اور اپیل کیلئے 30 دن کی مدت کے بجائے فقط سات روز کی مہلت دی گئی۔ جو انصاف کی نگاہ میں سراسر زیادتی کے مترادف ہے۔

3۔ انتقالِ مقدمہ کی اجازت نہیں دی گئی

قانونِ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 527 کے تحت ملزم کو یہ حق دیتا ہے کہ اگر اسے کسی وجہ سے ٹرائل کورٹ یا بینچ پر اعتماد نہ ہو تو وہ انتقالِ مقدمہ کی درخواست دے سکتا ہے اور عموماً مقدمہ کسی دوسرے بینچ یا عدالت میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ بھٹو کے معاملہ میں اس کی اجازت نہیں دی گئی حالانکہ اس نے انتقالِ مقدمہ کی متعدد درخواستیں دیں اور ٹرائل بینچ کے سربراہ کو اس سے جو رنجش اور تعصب تھا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ بھٹو نے کارروائی کے شروع میں ہی بینچ پر عدمِ اعتماد کا اظہار کر دیا تھا لیکن انتقالِ مقدمہ کے سلسلہ میں اُس کی ہر درخواست مسترد کر دی گئی اور اُسے ایک جائز حق سے محروم کر دیا گیا۔

4۔ جیل میں بھٹو کے ساتھ امتیازی سلوک

ایک جج کے بقول قیدِ تنہائی کا ایک مہینہ ایک سال کی سادہ یا قید بامشقت کے برابر ہوتا ہے۔ بھٹو کو گرفتاری سے سزا یابی تک پورے آٹھ مہینے کوٹ لکھپت جیل میں قید تنہائی میں رکھا گیا۔ بھٹو کے عہدِ حکومت میں جن لوگوں نے ایسی سزا بھگتی اور فوجی حکومت کے دَور میں لوگوں نے جو مصائب جھیلے' ان کا موازنہ بھٹو کی قیدِ تنہائی سے کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسے برداشت کرنا آسان کام نہیں تھا۔ جہاں بھٹو کے حریف ان کے آلام و مصائب پر بغلیں بجا رہے تھے۔ وہاں بھٹو کے حامی' اپنے محبوب رہنماء کی تذلیل واہانت پر انتہائی رنجیدہ و دل برداشتہ تھے۔ بھٹو جیسے آدمی کیلئے جو ہر وقت لوگوں میں گھرے رہنے کے عادی تھے تنہائی کی اذیت بڑی جانگسل اور تکلیف دہ تھی اِن کے رنج و محن میں یہ بات اور اضافہ کر دیتی تھی کہ وہ خود کو بے گناہ سمجھتے تھے۔ بھٹو کو جن ناگفتہ بہ حالات میں رکھا جا رہا تھا بھٹو نے بڑی تلخی کے ساتھ اس کی شکایت کی لیکن سننے والا کون تھا۔ بھٹو کی نگرانی کیلئے جیل حکام کے علاوہ ایک کرنل کو بھی تعینات کیا گیا تھا۔ مبادا جیل کی انتظامیہ سابق وزیرِ اعظم کیلئے کہیں قواعد و ضوابط میں نرمی نہ کر دے اور کچھ مراعات نہ دیدے۔

بھٹو کو جن حالات میں رکھا گیا وہ انتہائی مضرِ صحت تھے۔ علاوہ ازیں اُن کے علاج معالجہ پر کبھی توجہ نہیں دی گئی جس کی انہیں اشد ضرورت تھی۔ اپنے وقار کو بحال رکھنے اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی جدّوجُہد میں وہ ٹوٹتے رہے۔ ان کے وکیل کی مسلسل درخواستوں کے بعد انہیں چند رعایتیں دی گئیں۔ کوٹ لکھپت جیل میں تین مہینے تک بھٹو کو عجیب طرح کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن کی کوٹھڑی سے متصل بیرک میں پچاس پاگلوں کو رکھا گیا تھا جو ساری رات شور مچاتے تھے اور بھٹو سو بھی نہیں سکتے تھے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد انہیں دوسری جگہ منتقل کیا گیا۔

سزائے موت سنانے کے بعد (19 مارچ) بھٹو کو موت کی کال کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ اس سے پہلے وہ قدرے کشادہ سیل میں نظر بند تھے جس کا رقبہ 7 × 10 فٹ تھا۔ سزائے موت کے بعد

www.bhutto.org

سے قیدیوں کو بڑی کوٹھڑیوں میں رہنے دیا جاتا ہے لیکن بھٹو کے معاملہ میں یہ سہولت پیش نظر نہیں رکھی گئی اس سے فوجی حکام کی جانبداری اور غیر ہمدردانہ رویہ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھٹو نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو تار بھیجا اور جیل سپرنٹنڈنٹ کے نام خط لکھا یہ دونوں دستاویزات پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کے نام تار

21 ستمبر 77ء کو جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس ہونے والا تھا بھٹو نے سیکرٹری جنرل کرٹ والڈہائم کے نام ایک تار بھیجا جس میں اُن حالات کی شکایت کی گئی تھی۔ جن میں وہ قید تھے۔ نیز عوام مارشل لاء حکومت کے تحت جن حالات سے گزر رہے تھے۔ ان کا ذکر کیا تھا جب سیکرٹری جنرل کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں آیا تو بھٹو نے یہ تصور کر لیا کہ اُن کا ٹیلی گرام سیکرٹری جنرل کو بھیجا ہی نہیں گیا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ کے نام خط

18 مارچ 78ء کو بھٹو نے لاہور کے جیل سپرنٹنڈنٹ کے نام ایک سخت خط لکھا جس میں ان اہانتوں کا ذکر کیا گیا تھا جو ستمبر 77ء میں ان کی گرفتاری کے وقت سے ان کے ساتھ روا رکھی گئی تھیں۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا۔

"اس پر ایک عرصہ بیت گیا ہے۔ میں 3 ستمبر 77ء سے آج تک شدید جسمانی و ذہنی تکلیف اور قید تنہائی بھگت رہا ہوں۔ آج (18 مارچ 78ء) سہ پہر کو مجھے موت کی کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا ہے مجھے 24 گھنٹوں میں سے ۲۲ گھنٹے زنجیروں میں رکھا گیا میں ان ناخوشگوار دنوں کی یادیں اپنے ناخنوں پر نشانوں کی صورت میں اب تک اٹھائے پھرتا ہوں۔"

اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے بھٹو نے لکھا۔

"موسم سرما میں مجھ پر ملیریا اور انفلوئنزا کے دو حملے ہوئے۔ میں اکثر معدہ کی تکلیف میں مبتلا رہتا ہوں اور سر میں سخت درد رہتا ہے۔ مزید یہ کہ میرے سینے میں بھی شدید درد ہونے لگا ہے۔ تین مواقع پر میں نے خون کی قے کی اور میری ناک سے بھی خون بہا۔ لیکن کسی نے پرواہ نہیں کی۔ مقصد یہ ہے کہ میں موت کی اس کوٹھڑی میں ختم ہو جاؤں۔ اگر میرے مناسب طبی علاج کا بندوبست نہیں کیا گیا تو حکومت اور اس کے ساتھ ملے ہوئے لوگوں کو جو ان حالات کے ذمہ دار ہیں۔ سنگین نتائج بھگتنے کیلئے تیار رہنا چاہئے۔" طبی علاج فراہم نہ ہونے پر وہ فرسٹریشن کا شکار ہو گئے تھے لیکن کسی بھی مرحلہ پر پست ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے خط کو ان الفاظ پر ختم کیا۔

"میرے حوصلے بلند ہیں میں اپنی ہمت بلند حوصلہ اور قوت ارادی کے بل پر زندہ ہوں۔ میں لکڑی کا بنا ہوا نہیں ہوں جو آسانی سے جل جاتی ہے"

www.bhutto.org

5۔ صفائی نے کوئی گواہ پیش نہیں کیا

یہ مقدمہ اس لحاظ سے منفرد تھا کہ اس میں بڑے ملزم بھٹو نے اپنی صفائی میں کوئی گواہ پیش نہیں کیا کیونکہ انہوں نے استغاثہ کے 30 گواہ پیش ہونے کے بعد 9 جنوری 78ء سے کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اُنہوں نے خود بھی کچھ سوالوں کے جواب دیئے اور کچھ کے نہیں۔ مقدمہ کی پوری کارروائی ٹیپ کی گئی۔ صفائی کو اپنا ٹیپ ریکارڈ استعمال میں لانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ استغاثہ کی جانب سے کُل 41 گواہ بھگتائے گئے۔ قصوری کے علاوہ سب کے سب سرکاری ملازم تھے۔ بھٹو کے حامی اس بات پر یقین رکھتے تھے جیسا کہ میاں عباس نے عدالت میں انحرافی بیان دیکر ثابت کیا۔ ترغیبات نے مقدمہ کی تیاری میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ گواہ اپنی نوکری اور جان بچانے کی خاطر جھوٹے اور جعلی بیانات دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ میاں محمد عباس نے اپنے دفاع میں چار گواہ پیش کئے۔ دیگر تین ملزموں نے صرف ایک گواہ بھگتانے پر اکتفا کیا۔

6۔ وکلائے صفائی کو بعض بیانات کی نقول فراہم نہیں کی گئیں

صفائی کے ساتھ یہ زیادتی بھی روا رکھی گئی کہ اسے قانونی تقاضا کے مطابق بعض اہم گواہوں کے بیانات کی نقول بار بار کے مطالبہ کے باوجود فراہم نہیں کی گئیں۔ اس ناانصافی سے صفائی کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی کسی مرحلہ پر بھی نہیں ہو سکی۔

7۔ کسی دوسرے ممکنہ محرک کو زیرِ غور نہیں لایا گیا

وکلائے صفائی نے اس نکتہ پر بہت زور دیا کہ ممکن ہے مسعود محمود قصوری کے قتل کا کوئی جداگانہ محرک رکھتا ہو اور اس نے ایف ایس ایف کے جوانوں سے قصوری کی کار پر حملہ کرایا ہو۔ کیونکہ یہ بات مسلمہ ہے کہ مسعود محمود کا تعلق احمدیہ برادری سے تھا۔ اور 1974ء کی ختم نبوت ﷺ تحریک کے زمانہ میں احمد رضا قصوری کے زیرِ قیادت قصور میں نکالے گئے ایک جلوس کے شرکاء نے اس کے بھائی مقبول محمود کے میڈیکل سٹور پر ہلہ بول کر اسے نذرِ آتش کر دیا تھا۔ اس طرح مسعود محمود کے دل میں قصوری کے خلاف رنجش پیدا ہو گئی۔ عین ممکن ہے اس رنجش کا بدلہ لینے کیلئے خود مسعود نے قصوری کے قتل کا پروگرام بنایا ہو۔ مسعود محمود کی معروف قادیانی بیوروکریٹ مسز این اے فاروقی تب سیکرٹری الیکشن کمیشن کے ساتھ قرابت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ این اے فاروقی کی بیوی مسعود کی کزن تھی۔ اُسے مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے فیصلہ سے زبردست دھچکا لگا تھا۔ وہ اس فیصلہ کے بعد بھٹو کے جانی دشمن بن گئے تھے۔ اس لئے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ مسعود محمود نے اپنے مذہبی جذبات سے مغلوب ہو کر بھٹو کے خلاف سازش بنائی ہو کہ قصوری کو قتل کرا کے بھٹو کے کھاتہ میں ڈال دیا جائے۔ بظاہر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ لیکن ٹرائل بینچ نے کسی دوسرے ممکنہ محرک کو زیرِ غور لانے پر توجہ نہیں دی۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

ساتواں باب

سپریم کورٹ میں اپیل

اپیلوں کے ابتدائی کوائف

18 مارچ 78ء کو ہائی کورٹ کی طرف سے صادر کردہ فیصلہ کے خلاف 25 مارچ 78ء کو سپریم کورٹ میں تین اپیلیں دائر کی گئیں۔ ایک بھٹو کی طرف سے دوسری میاں محمد عباس کی طرف سے اور تیسری غلام مصطفیٰ، ارشد اقبال اور افتخار راناکی طرف سے مشترکہ طور پر دائر کی گئی۔ ان اپیلوں کے ابتدائی کوائف حسب ذیل ہیں۔

مقدمہ کا حوالہ۔ پی ایل ڈی ۱۹۷۹ ایس سی۔ ۵۳

عنوان..... ذوالفقار علی بھٹو بنام سرکار

فوجداری اپیل نمبر ۱۱ لغایت ۷۸ ۱۹ء

ذوالفقار علی بھٹو.......... اپیلانٹ

بنام

سرکار.............. مسئول الیہ

وکلاء........... یحییٰ بختیار، سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ، غلام علی میمن، دوست محمد اعوان محمد شریف، عبدالحفیظ لاکھو، جن کی معاونت نور احمد نوری اور ایم اے صدیقی ایڈووکیٹ آن ریکارڈ نے کی۔

www.bhutto.org

فوجداری اپیل نمبر ۱۲ لغایت ۸ ے ۹ اء

میاں محمد عباس............... اپیلانٹ

بنام

سرکار............ مسول الیہ

وکلاء............ میاں قربان صادق اکرام ' محمد شفیع عباسی ' جن کی معاونت شیخ عبدالکریم ایڈووکیٹ آن ریکارڈ نے کی۔

فوجداری اپیل نمبر ۱۳ لغایت ۸ ے ۹ اء

غلام مصطفیٰ و دیگران........... اپیلانٹس

بنام

سرکار ..... مسؤل الیہ

وکلاء.......... ارشاد احمد قریشی ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

سرکار کی طرف سے پیش ہونے والے وکلاء

اعجاز حسین بٹالوی سینئر ایڈووکیٹ اور سپیشل پبلک پراسیکیوٹر جن کی معاونت ایم اے رحمان ایڈووکیٹ آن ریکارڈ 'محمود اے شیخ ایڈووکیٹ نیز ریاض احمد اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب نے کی۔

سماعت کنندہ بینچ

ابتداء میں درج ذیل نو ججوں پر مشتمل تھا۔

1۔ جسٹس انوار الحق ' چیف جسٹس 2۔ جسٹس قیصر علی خان '3۔ جسٹس وحید الدین احمد '4۔ جسٹس محمد اکرام '5۔ جسٹس دراب پٹیل 6۔ جسٹس محمد حلیم '7. جسٹس جی صفدر شاہ '8۔ جسٹس کرم الٰہی چوہان اور جسٹس نسیم حسن شاہ

مورخہ 78-7-30 کو جسٹس قیصر علی خان ریٹائر ہو گئے۔

اور 78-11-20 کو بوجہ علالت جسٹس وحید الدین احمد سماعت کے قابل نہ رہے تو بینچ سکڑ کر سات ججوں پر مشتمل رہ گیا۔ جس نے اپیل کی سماعت کی اور فیصلہ سنایا۔

www.bhutto.org

اپیل کی سماعت شروع ہونے کی تاریخ ۔یکم اپریل 78ء

صدورِ فیصلہ کی تاریخ..... 6فروری 79ء

نوٹ..... ابتدائی فیصلہ چیف جسٹس نے لکھا۔ دوسرے تین ججوں نے فیصلہ سے اتفاق کیا جبکہ دیگر تین ججوں نے اختلاف کیا۔ یوں یہ فیصلہ متفقہ نہیں بلکہ اکثریتی تھا۔

انوار الحق اور بھٹو کے مابین اختلافات

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس شیخ انوار الحق کے ساتھ بھی بھٹو کے اختلافات اپیل کی سماعت کے ابتدائی ایام میں ہی پیدا ہو گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ پہلے سے موجود تھے۔ شیخ صاحب کو ستمبر 77ء میں چودھری یعقوب علی خان کی جگہ عدالتِ عظمیٰ کا چیف جسٹس مقرر کیا گیا تھا۔ انہیں بھی بھٹو سے شکایت تھی کہ انہوں نے اپنے دورِ عروج واقتدار میں اٹارنی جنرل کے مشورہ پر اُن کو چیف جسٹس کے عہدہ پر ترقی دینے میں تاخیر کی تھی۔ جس کے نتیجہ میں ان کے دل میں شدید ناراضگی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ دونوں کے مابین یہ رنجش اس وقت اور بڑھ گئی جب 10 نومبر 77ء کو انوار الحق نے بھٹو کی رہائی کے بارے میں نصرت بھٹو کی درخواست مسترد کر دی اور نظریۂ ضرورت کے تحت مارشل لاء کے نفاذ کو سند جواز عطا کر دی۔

اندریں حالات اپیل کی سماعت کے ابتدائی ایام میں ہی یعنی 7 مئی 1978ء کو بھٹو نے ایک درخواست میں چیف جسٹس پر عدمِ اعتماد کا اظہار کر دیا۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا:

"چیف جسٹس میرے خلاف ذاتی تعصب رکھتے ہیں اس لئے وہ غیر جانبداری سے اپیل کا فیصلہ نہیں کر سکتے"

اس ضمن میں بھٹو کا موقف یہ تھا کہ :۔

"ماضی میں اٹارنی جنرل کے مشورہ پر میری حکومت نے بحیثیت چیف جسٹس ترقی دینے میں جان بوجھ کر تاخیر کی تھی۔ جس سے ان کے دل میں میرے خلاف رنجش پیدا ہو گئی۔"

چیف جسٹس نے مارشل لاء کے نفاذ کو چیلنج کرنے سے متعلق نصرت بھٹو کی درخواست رد کر دی تھی۔ انہوں نے سپریم کورٹ میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے وفاداری کا حلف خود بھی اٹھایا اور اپنے ماتحتوں سے بھی اٹھوایا۔ اس حلف میں آئین کی پاسداری سے متعلق پیرا حذف کر دیا گیا تھا۔ اُنہوں نے مجھ پر کھلے عام اشتعال انگیز تنقید کی تھی۔ جس وقت میں بطور وزیرِ اعظم پاکستان فرائض انجام دے رہا تھا۔

یہ کہ وہ صدر فضل الٰہی چودھری کی عدم موجودگی میں اُن کے قائم مقام کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ ایک شخص کا عدلیہ اور انتظامیہ کے عہدوں پر کام کرنا کسی لحاظ سے پسندیدہ نہیں"

www.bhutto.org

چیف جسٹس نے 10 مئی 78ء کے حکم نامہ کے ذریعے بھٹو کی درخواست کو نامنظور کر دیا۔ اس وقت انہوں نے عجیب طور سے بیک وقت ملزم اور منصف کا کردار ادا کرتے ہوئے لکھا:

چیف جسٹس کے منصب پر ترقی میں تاخیر سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ یہ کہ مارشل لاء کے جواز کا فیصلہ عدالت کے 9 ججوں پر مشتمل فل بینچ نے دیا تھا۔

یہ کہ ججوں سے حلف اٹھوانے کا مقصد ان کی آزادی میں رخنہ ڈالنا نہیں تھا۔

یہ کہ مسٹر بھٹو پر ان کی تنقید ذاتی بناء پر نہیں تھی اور اس کا اُن پر عائد کردہ الزامات سے کوئی تعلق نہیں۔"

اس سے بھی پہلے مسٹر بھٹو یہ شکایت درج کرا چکے تھے کہ انہیں اپیل کیلئے صرف 7 دن کی مہلت دی گئی ہے جبکہ رواج کے مطابق اس کیلئے عموماً 30 دن دیئے جاتے ہیں۔ اتنی محدود مدت میں پورے کاغذات اور دستاویزات کو یکجا کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ محض ایک ابتدائی اور سرسری اپیل ہی دائر کی جا سکتی تھی۔ لیکن جب اپیل کی سماعت کا مرحلہ آیا تو اسے ایک ہفتہ کیلئے ملتوی کر دیا گیا۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ سربراہِ مملکت کی غیر حاضری میں چیف جسٹس کو ان کا قائم مقام بنا دیا گیا تھا۔ بھٹو کو اس سے واضح اشارہ مل گیا کہ انوار الحق کا جھکاؤ کس طرف ہے۔ اگر وہ اپیل کی جلد سماعت کرنے میں اتنے ہی فکرمند ہوتے تو قائم مقام صدارت کے عہدہ سے لُطف اندوز ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ بھٹو کے حامی یقین رکھتے تھے بھٹو کی یہ سوچ درست ہے کہ انوار الحق کے دل میں ان کیلئے تعصب اور عناد ہے یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں تھی کہ انوار الحق کے مولوی مشتاق حسین کے ساتھ گہرے مراسم اور خانگی سطح کے تعلقات تھے۔ آخر الذکر نے شیخ انوار الحق کی بیوی کو "منہ بولی بہن" بنا رکھا تھا اور دونوں مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ خود ضیاء الحق اور جنرل فیض علی چشتی کا تعلق بھی اسی ضلع سے تھا۔ بھٹو ان کے باہمی اشتراک و تعلق کے بارے میں بڑے حساس تھے۔ بیک وقت عدالتی و انتظامی ذمہ داریاں نبھانے سے متعلق بھٹو نے جو اعتراض کیا۔ انوار الحق نے اس سلسلے میں یہ صفائی پیش کر دی کہ قائم مقام صدر کی ذمہ داریاں نبھانا معمول کا عمل ہے جو آئین سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ مگر بھٹو اس صفائی سے مطمئن نہ ہوئے۔ اپیل کی سماعت کے دوران جب انوار الحق نے ضیاء الحق کی قائم مقامی کی تب بھی بھٹو نے اپنا یہ اعتراض دہرایا بہرحال ہائی کورٹ کے مقابلہ میں سپریم کورٹ کا ماحول دوستانہ خوشگوار اور پُرسکون تھا۔

آغازِ کار میں ایسا تاثر دیا گیا کہ کام تیزی سے ہو گا اور لگ بھگ چھ ہفتوں میں اپیل کو نمٹا دیا جائیگا لیکن اسے ختم ہونے میں دس ماہ سے زیادہ عرصہ لگ گیا۔ اس میں کئی وقفے بھی آئے۔ اس طرح فوجی حکومت کو اپنے پاؤں مضبوط کرنے کا موقع مل گیا اور وہ ایک کے بعد دوسرے اعلان و حکم جاری کرتے چلے گئے۔ ضیاء کے بیانوں میں اتنا تضاد اور اس قدر تبدیلیاں ہوتی تھیں کہ لوگوں نے سی ایم ایل اے کے الفاظ سے Cancel My Last Announcement (میرا سابقہ اعلان منسوخ کر دو) کا مفہوم مراد لینا شروع کر دیا تھا۔ ملک میں رواں سیاسی حالات کو سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت اپیل سے کسی طرح علیحدہ کرنا ممکن

www.bhutto.org

نہیں تھا۔ نوے دن کیلئے آنیوالے ضیاء نے 365 دن گزار لئے تھے۔ ملک میں عام انتخابات کرانے کے وعدہ کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔ واضح طور پر محسوس ہونے لگا تھا کہ جب تک اپیل کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔ عام انتخابات منعقد ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ عوام کی بھاری اکثریت یہ یقین کر چکی تھی کہ سپریم کورٹ میں بھٹو کی اپیل کا جو بھی فیصلہ ہو گا پاکستان کے مستقبل پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

دو ماہ کے وقفہ کے بعد کورٹ کا سیشن دوبارہ شروع ہوا تو معاملات اس بات پر پہلے سے بھی بدتر ہو گئے جب ایک انڈونیشی اخبار میں چیف جسٹس آف پاکستان کا یہ بیان چھپا کہ "بھٹو کے مقدمہ کا پاکستان کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ جبکہ صفائی کے دلائل میں سے اہم ترین دلیل یہی تھی کہ یہ مقدمہ سیاسی بنیادوں پر بنایا گیا ہے۔ (یاد رہے کہ انوار الحق جیورسٹس کانفرنس میں شرکت کرنے انڈونیشیا گئے تھے)۔ بھٹو نے اس بیان پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے الزام لگایا کہ چیف جسٹس مارشل لاء حکومت اور اس کے مقاصد سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اب وہ تعصب کے بغیر غیر جانبداری سے کیس کا فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔ انوار الحق نے بڑے شیریں اور دھیمے لہجہ میں اپنی صفائی پیش کی کہ انہوں نے پریس کے سامنے جس رائے کا اظہار کیا تھا اس میں کوئی معاندانہ عنصر شامل نہیں تھا۔ انہوں نے تو انڈونیشیا کے صحافیوں کو محض یہ بتایا تھا کہ پاکستان میں عدلیہ آزاد ہے اور وہ اپیل کنندہ کے خلاف اپنے دل میں کوئی عناد نہیں رکھتے۔ اُن کا مقصد غیر ملکی صحافیوں کو یہ یقین دلانا تھا کہ اپیل کا فیصلہ غیر جانبداری سے قانون کے مطابق کیا جائیگا۔ بھٹو اس سے بالکل مطمئن نہ ہوئے وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ چیف جسٹس ضیاء حکومت کے ترجمان کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اپیل کس طریقے سے سُنی جائیگی۔ اُنہیں یقین ہو گیا تھا کہ سپریم کورٹ میں بھی اُن کے خلاف ویسا ہی عناد برقرار رکھا جا رہا ہے جو مقدمہ کی سماعت کے دوران ہائی کورٹ میں دیکھنے میں آیا تھا۔ انوار الحق اپنے آپ کو بینچ میں برقرار رکھنے کا مستحق سمجھتے تھے اس لئے یہ معاملہ ختم ہو گیا۔

ابتداء میں اپیل کی سماعت نو ججوں پر مشتمل فل بینچ کر رہا تھا اس سے لوگوں کو آس بندھی کہ اس طرح بھٹو کو زیادہ سے زیادہ انصاف کے حصول میں مدد ملے گی۔ تاہم خود بھٹو کو سپریم کورٹ پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں تھا۔ لاہور ہائی کورٹ میں انہیں جو تجربہ ہوا اس کی بناء پر وہ غیر متاثر اور شکی مزاج بنے رہے۔ لاہور میں انہیں بے گناہ قرار نہیں دیا گیا تھا اور یہاں بھی وہ اس کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ بھٹو کی سوچ میں یہ تبدیلی اسی وقت آ گئی تھی جب راتوں رات یعقوب علی خان کو سبکدوش کر کے انوار الحق کو چیف جسٹس بنایا گیا تھا اور یہ منصب سنبھالتے ہی اُنہوں نے نصرت بھٹو کی اپیل مسترد کرتے ہوئے بھٹو کی رہائی سے انکار اور مارشل لاء کے نفاذ کو جائز قرار دیدیا تھا۔ بھٹو کی بے یقینی میں اُس وقت اور اضافہ ہو گیا جب چیف جسٹس نے بھٹو کے احتجاج کے باوجود اپیل سننے والے بینچ میں رہنے کا فیصلہ کیا اگر وہ بھٹو کی اس شکایت کو درخورِ اعتنا سمجھتے کہ مقدمہ کی سماعت غیر منصفانہ ہوئی تھی تو وہ خود کو سماعت کنندہ بینچ سے الگ کر سکتے تھے۔

www.bhutto.org

وائٹ پیپرز اور اُن کا جواب

عین اس وقت جبکہ بھٹو کی اپیل سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت تھی مارشل لاء گورنمنٹ نے بھٹو دور حکومت کی خامیوں اور بدعنوانیوں اور اختیارات کے ناجائز استعمال جیسے الزامات کی تشہیر و پبلسٹی کیلئے یکے بعد دیگرے کئی وائٹ پیپر شائع کئے۔ جو ہزارہا صفحات پر مشتمل تھے۔ ان میں سے پہلا وائٹ پیپر 25 جولائی کو منظرِ عام پر آیا لندن کی ٹیلی فون ڈائریکٹری سے بھی بڑا تھا۔ اس کے 405 صفحے تو الزامات کی تفصیل پر مشتمل تھے اور ان کے ساتھ 1043 صفحات کے ضمیمے منسلک تھے۔ جن میں انتخابات کے دوران کی گئی دھاندلیوں کو بے نقاب کیا گیا اور بھٹو کو بے مثال دھاندلی باز کے روپ میں دکھایا گیا تھا بھٹو کی رائے میں اس وائٹ پیپر کا مقصد یہ تھا کہ اُن کے سیاسی وقار کو تباہ کر دیا جائے اور ان کے ساتھ وابستہ لوگوں کی ہمدردیوں پر اثر انداز ہو کر انہیں مخالفت میں بدل دیا جائے۔ یہ دستاویز اُن کی کردار کشی کا ایک حصہ تھی اس سے بھی زیادہ اہم اس کی غرض و غایت سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت ان کی اپیل کو متاثر کرنا تھا۔ تاکہ لوگوں اور ممکن ہو تو ججوں کے ذہن کو بھی زہر آلود کیا جا سکے۔ وائٹ پیپرز میں دھاندلی اور بدعنوانی کے سارے الزام پی پی پر لگائے گئے تھے۔ قومی اتحاد کا کہیں ذکر نہیں تھا وائٹ پیپر کا ایک پورا باب یحییٰ بختیار کے حلقہ کیلئے وقف کیا گیا تھا۔ بھٹو کے نزدیک ایسا کرنے میں چیف الیکشن کمشنر مولوی مشتاق کی یحییٰ بختیار کے ساتھ رنجش کارفرما تھی۔ مزید برآں اس دستاویز کا گہرا تعلق خود اپیل کے ساتھ جوڑا گیا۔ چونکہ استغاثہ یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ بھٹو نے قصوری کے والد کو ایف ایس ایف کے ذریعے ہلاک کرایا تھا اس لئے یہ بات استغاثہ کے مفاد میں تھی کہ جس حد تک ممکن ہو۔ ایف ایس ایف کی ایک گھناؤنی اور بدترین تصویر پیش کی جائے۔ اس فرض کو بھی وائٹ پیپر نے خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ انتخابات میں ایف ایس ایف کا کردار بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ میاں محمد عباس نے ایک سکواڈ تیار کر رکھا تھا جس کا کام اپوزیشن کے جلسوں میں رکاوٹ ڈالنا' انہیں درہم برہم کرنا تھا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ انٹیلی جنس بیورو کے چیف براؤر شید نے فورس کے دوسرے افسروں کے تعاون سے بم چلانے والوں' نشانہ بازوں اور خنجر پھینکنے والوں کا ایک خصوصی دستہ بنا رکھا تھا جو دہشت گردی کی وارداتیں کرتا تھا۔

بھٹو کو یقین ہو گیا کہ قتل کے مقدمہ میں ایف ایس ایف پر جو الزامات لگائے گئے ہیں وائٹ پیپر اُن سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ جس سے عیاں ہو جاتا ہے کہ حکام انہیں پہلے ہی مجرم قرار دے چکے ہیں اور ایف ایس ایف کو اس طرح پیش کر کے ان کے ساتھ تعصب برتا گیا ہے براؤر شید کو ملوث کرنے کا در پردہ مقصد یہ ہے کہ اُنہوں نے بھٹو کی حمایت میں سپریم کورٹ میں جو بیان حلفی داخل کیا ہے اسے ناقابلِ یقین اور مشکوک بنا دیا جائے وائٹ پیپر میں براؤر شید کو جگہ جگہ بھٹو کا دست راست دکھایا گیا تھا۔ جس سے ان کی غیر جانبداری اور راست گوئی پر پانی پھیرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

جواب دعویٰ

اس لئے بھٹو نے مناسب سمجھا کہ وہ ریکارڈ کیلئے جوابِ دعویٰ (Rejoinder.

www.bhutto.org

) لکھیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر اسے ایک عدالتی دستاویز کی صورت میں نہ لکھا جاتا تو پھر اسے غیر قانونی قرار دیدیا جاتا کیونکہ بھٹو کو عدالت سے متعلق مواد کے علاوہ کوئی اور چیز لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

جیل کی کوٹھڑی میں بھٹو نے وائٹ پیپر کا مطالعہ بڑی تیزی اور توجہ کے ساتھ کیا۔ وائٹ پیپر میں بہت سے الزامات جھوٹے تھے جسے فوجی حکومت اندرون وبیرون ملک چار زبانوں میں ترجمہ کرا کے تقسیم کر رہی تھی۔ ان میں سے ایک زبان عربی تھی۔ دنیائے عرب میں سفارت خانوں کے ذریعے اس دستاویز کی تقسیم وتشہیر کا مقصد عربوں کو بھٹو سے برگشتہ کرنا تھا۔ سب سے پہلے بھٹو نے اہم نکات نوٹ کئے جن کا جواب دینا تھا۔

جیل میں بہت سے لوگوں نے اپنی یادداشتیں لکھی ہیں جہاں وہ تنہا بھی تھے اور اُن کے پاس وقت بھی تھا۔ تنہائی تو بھٹو کو بھی حاصل تھی لیکن زیادہ مہلت میسر نہیں تھی۔ وہ جلد از جلد اس کا جواب لکھنا چاہتے تھے۔ اسے مکمل کرنے میں انہیں دو مہینے لگے۔ دھاندلی اور بدعنوانی کے الزامات کی تردید کیلئے متعلقہ فائلوں اور دستاویزات کی ضرورت تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے مناسب روشنی کے بغیر گھٹنے پر کاغذ رکھ کر محض اپنے حافظے اور یادداشت کی مدد سے جواب دعویٰ لکھا۔ اگست میں شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ اوپر سے بھٹو روزے رکھ رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کی یادداشت قابلِ داد ہے۔ اس جواب دعویٰ میں بھٹو کا جینئس ظہور کرتا ہے اس کا اعتراف دشمنوں کو بھی کرنا پڑا۔ یہ ایک پُر ذکاوت معلوماتی اور شاعرانہ دستاویز ہے۔ جو لوگ اسے سرسری کا مرتبہ دیتے ہیں وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ یہ دستاویز ایک روشن اور ہوادار کمرے میں سیکرٹریوں کی ٹیم کے ساتھ مرتب نہیں کی گئی۔ بھٹو کو ایسی کوئی سہولت حاصل نہ تھی۔ اپنی مصروفیت کے باعث بھٹو کے وکلاء بھی ان کی کوئی مدد نہیں کر رہے تھے۔ یہ جواب دعویٰ ٹائپ کئے ہوئے 300 سے زائد فل سکیپ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اسے ماضی کی چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور یادوں سے سجایا گیا ہے۔ بھٹو نے طنزیہ انداز میں ضیاء حکومت کا مضحکہ اڑایا۔ اُسے جنتا (جتھہ) اور ٹامی گن ڈکٹیٹرشپ کے نام سے پکارا۔ عدلیہ کو مارشل لاء کی وگ اور ضیاء الحق کی بناوٹی مسکراہٹ کو نقلی دانت قرار دیا۔ عالمی امور کے بارے میں بھٹو کا علم اور ان کا ذہن جو ایک کتب خانے کی طرح ہے۔ اس کا ثبوت اس دستاویز سے ملتا ہے یوں لگتا ہے جیسے اس جواب دعویٰ کے لکھنے میں انہوں نے کراچی میں اپنی شاندار لائبریری سے مدد حاصل کی ہو۔ اس کتاب کا اختتام پنڈت نہرو کی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" کے اختتامیہ پر کیا۔

"انسان کی سب سے قیمتی متاع اس کی زندگی ہے اور چونکہ یہ اُسے صرف ایک بار ملی ہے اس لئے اُسے اس طرح زندہ رہنا چاہئے کہ ندامت، بزدلی اور بُرے ماضی کا احساس نہ ہو، بغیر مقصد کے زندہ رہنے کا عذاب انسان کو نہیں جھیلنا چاہئے اور جب وہ مرے تو یہ کہہ سکے کہ میں نے اپنی ساری زندگی اور تمام توانائی دنیا کے اولین نصب العین، بنی نوع انسان کی آزادی کیلئے وقف کر دی تھی"

www.bhutto.org

جواب دعویٰ کو عدالت میں پیش کرنے سے پہلے بھٹو کے وکلاء نے اُس پر قانونی نظر ڈالی۔ بھٹو نے مولوی مشتاق کے بطور چیف الیکشن کمشنر کردار پر ایک پورا باب لکھا تھا جس میں بڑے طنزیہ اور چبھتے ہوئے جملے تھے۔ وکلاء نے اس بات کا احساس کرتے ہوئے کہ مولوی مشتاق کے بھائی سپریم کورٹ کے فاضل جج ایسے ریمارکس سے ناراض ہو سکتے ہیں ——— بھٹو کو ضروری تبدیلیوں کا مشورہ دیا جو انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ جس دن وکلاء اسے عدالت میں پیش کرنا چاہتے تھے پتہ چلا کہ لاہور میں اس کی ایک ہزار کاپیاں طبع کر کے تقسیم کر دی گئی ہیں اور بھٹو کے حامی اخبار "مساوات" میں اس کے اقتباسات شائع ہوئے ہیں۔ جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو چیف جسٹس نے عدالتی ریکارڈ کیلئے قبول کرنے کے بعد اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔

اس پابندی کے باوجود یہ جواب دعویٰ بہت سے لوگوں تک پہنچ گیا۔ اسے سمگل کر کے دہلی، نیویارک اور بانگ کانگ پہنچا دیا گیا۔ لندن میں یہ ایک بڑے پمفلٹ کی صورت میں فروخت ہوا۔ اس کے بعد ایک بھارتی ناشر (وکاس پبلشنگ کمپنی نئی دہلی) نے اسے "اگر مجھے قتل کیا گیا؟" کے زیر عنوان کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ جس کا تعارف مشہور صحافی پران چوپڑہ نے لکھا متن کے لحاظ سے کتاب کا نام بڑا موزوں ہے۔ بھٹو اس وقت شاعرانہ انداز میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے لیکن ذہنی پختگی کے حوالے سے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایک مجرم قیدی کی حیثیت سے اُن کی موت شاید اب زیادہ دور نہیں ہے۔

یحییٰ بختیار کے خلاف مقدمہ

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ان وائٹ پیپروں کی اشاعت کا مقصد بھٹو کے ساتھ لوگوں کی ہمدردیاں ختم کرنا اور اپیل کی سماعت میں رخنہ اندازیاں کرنا تھا۔ بھٹو کے ساتھ ساتھ اُن کے سینئر وکیل مسٹر یحییٰ بختیار کو بطورِ خاص نشانہ بنایا گیا۔ انتخابات میں دھاندلیوں سے متعلق پہلے وائٹ پیپر میں اُن کیلئے ایک پورا باب وقف کیا گیا تھا۔ 24 مارچ 78ء کو یحییٰ بختیار نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی اور 25 مارچ کو اُن کے خلاف الیکشن میں دھاندلی کے الزام میں مقدمہ درج کر لیا گیا۔ جب وہ بھٹو کی اپیل کے سلسلہ میں مصروف تھے اُن کی خفیہ نگرانی شروع کر دی گئی۔ پولیس نے دوبار اُن کے ہوٹل کے کمرہ میں چھاپہ مارا اُن کے دو معاون گرفتار کر لئے گئے جو کئی ماہ تک نظر بند رہے اور جرم کا کوئی ثبوت نہ ملنے پر بعد میں رہا کر گئے۔ 25 جون 78ء کو جبکہ مسٹر یحییٰ بختیار اپیل کے سلسلہ میں دلائل پیش کر رہے تھے۔ اُن سے پانچ چھ گھنٹے پوچھ گچھ کی گئی اس ساری کارروائی کا بنیادی مقصد وکیل صفائی کو ہراساں کرنا اور اپیل کی پیروی سے باز رکھنا تھا۔

یہ مقدمہ کئی سال چلتا رہا اور 31 مارچ 81ء کو مسٹر بختیار کو پانچ سال قید بامشقت اور پانچ ہزار

www.bhutto.org

پونڈ جرمانہ کی سزا دی گئی۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ایک سال قید بھگتنا ہوگی۔ اکتوبر 80ء میں حکومت نے مارشل لاء کے تحت بھی مسٹر بختیار کے خلاف کارروائی کی تھی۔ جسے بلوچستان ہائی کورٹ نے امتیازی اور بدنیتی پر مبنی قرار دیا۔ اس مقدمہ کی سماعت کرنے والے دونوں ججوں چیف جسٹس خدا بخش مری اور جسٹس رشید کو مارچ 81ء میں پی سی او کے تحت حلف نہ اٹھانے پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔

ہائی کورٹ کے فیصلہ پر صفائی کی نکتہ چینی

سپریم کورٹ میں اپیل کا بیشتر حصہ جما جمایا تھا اس میں مقدمہ کا عمل تھا نہ حرکت' نہ ہی ملزمان پیش ہوئے تھے وہاں محض شہادتوں کو پڑھا جاتا اور ان پر بحث ہوتی تھی یحییٰ بختیار کبھی کبھی اپنے مخصوص لہجہ میں زور زور سے شہادت کو پڑھتے۔ سوال وجواب کے حوالہ سے سماعت میں جو گرما گرمی اور رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اپیل میں اُس کا فقدان تھا۔ چائے کے وقفہ (گیارہ تا ساڑھے گیارہ) میں ایک دوسرے سے ملنے کا موقع میسر آتا پریس کے ساتھ استغاثہ کے وکیلوں کا رویہ بے نیازی پر مبنی ہوتا۔ وہ سوال جواب کیلئے مشکل سے ہاتھ آتے تھے جبکہ صفائی کے وکلاء صحافیوں سے بات چیت کرتے اور معلومات فراہم کرنے پر آمادہ رہتے۔ بعض اوقات عدالتی کارروائی کے بعد ماحول خاصا بوجھل ہوتا۔ بعض لوگ اسے محض تھکن کا سبب بتاتے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اُس وقت پانچ آدمیوں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔

سب سے پہلے یحییٰ بختیار نے پوڈیم سنبھالا۔ انہوں نے مفصل اور جامع دلائل کے دوران جو قریباً دو مہینے تک جاری رہے عدالت عالیہ کے فیصلہ کو تین اہم وجوہات کی بناء پر تنقید کا نشانہ بنایا یعنی

(الف) ..... یہ ایک جھوٹا' من گھڑت اور سیاسی بنیادوں پر بنایا گیا مقدمہ ہے۔ جس کے پیچھے ایک بین الاقوامی سازش کارفرما ہے۔ اس مقدمہ بازی کا اصل مقصد اپیل کنندہ کو سیاسی وجسمانی ہر دو لحاظ سے ختم کرنا ہے۔

(ب) ..... یہ کہ مقدمہ کی کارروائی اس بناء پر باطل اور کالعدم ٹھہرتی ہے کہ ٹرائل بینچ کے سربراہ مولوی مشتاق حسین اپیلانٹ سے ذاتی عناد رکھتے تھے۔ کیس کی سماعت دیانت داری اور غیر جانبداری سے نہیں کی گئی۔ یہاں تک کہ شہادتیں گواہوں کے بیانات کے مطابق قلمبند نہیں کی گئیں۔ وکیل صفائی کی طرف سے شہادتوں کے قابلِ ادخال ہونے کی بابت اکثر اعتراضات نظر انداز اور غیر قانونی طور پر مسترد کر دیئے گئے۔ اس طرح کے متعصبانہ احکام کے باعث اپیلانٹ کارروائی کے بائیکاٹ پر مجبور ہو گیا اور اس نے 10 جنوری 78ء کے بعد سماعت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

(ج) ..... یہ کہ میرٹ پر استغاثہ معقول شک وشبہ سے بالاتر اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا ہے یہ کہ ناقابلِ ادخال شہادتیں ریکارڈ پر لائی گئیں اور انہیں قانونی تقاضوں کے برعکس اپیلانٹ کے

www.bhutto.org

خلاف استعمال کیا گیا۔ یہ کہ اپیلانٹ کو نقصان پہنچانے کی غرض سے قابل غور اور متعلقہ گواہی غیر قانونی طور پر ترک کر دی گئی۔ یہ کہ استغاثہ کے گواہ خصوصاً دونوں وعدہ معاف گواہ قابلِ اعتبار نہیں تھے اور یہ کہ ضروری اور قانوناً مطلوب تائید ریکارڈ پر موجود نہیں تھی۔

ان وجوہات کی بناء پر اپیلانٹ بریت کا مستحق تھا یا کم از کم اس مقدمے کی کسی غیر جانبدار بینچ یا عدالت کے ذریعے از سرِ نو سماعت کا حکم صادر ہونا چاہئے تھا۔

مسٹر بھٹو کی تین درخواستیں جو خارج کر دی گئیں

8 جولائی 1978ء کو فاضل وکیل صفائی مسٹر یحییٰ بختیار نے تین متفرق درخواستیں پیش کیں۔ حوالہ کی آسانی کیلئے ان پر فوجداری متفرق درخواست ہائے نمبر 7، 8، 9 لغایت 1978ء لگائے گئے۔

پہلی درخواست میں استغاثہ کے گواہ نمبر 4 ایم آر ویلچ کو دوبارہ طلب کرنے کی استدعا کی گئی تھی تاکہ اُس سے اُس کے مذہبی عقیدہ اور بعض دوسرے ایسے امور کی بابت سوالات دریافت کئے جاسکیں جو عدالت میں اپیلانٹ کی غیر حاضری کے باعث جرح کے دوران نہیں پوچھے جاسکے تھے۔

ایڈووکیٹ آن ریکارڈ ایم اے رحمان نے درخواست کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ صفائی کو پیشگی بتادیا گیا تھا کہ 16 نومبر 77ء کو ایم آر ویلچ کو پیش کیا جائیگا۔ اس دن جب گواہ کو پیش کیا گیا تو بھٹو کی غیر حاضری میں ان کے وکیل احسان قادر شاہ نے اُس پر جرح کی تھی۔ عدالت نے وکیلِ استغاثہ کے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے بھٹو کی درخواست خارج کر دی۔

دوسری درخواست میں استدعا کی گئی تھی کہ ڈی ایس پی آغا محمد صفدر اور سنٹرل آرڈیننس ڈپو حویلیاں کے کرنل وزیر محمد خان کو بطور عدالتی گواہ طلب کیا جائے تاکہ اول الذکر احمد رضا قصوری کے اس بیان کو ثابت کر سکے جو اُس نے زیرِ دفعہ 161 ضابطہ فوجداری اگست 74ء میں پیش آنیوالے وقوعۂ اسلام آباد کے متعلق دیا تھا اور آخر الذکر اس اسلحہ کے منبع اور مارکنگ کے بارے میں بتاسکے جو آرمی اور پیرا ملٹری فورسز مثلاً ایف ایس ایف کی مختلف یونٹوں کو سپلائی کیا جاتا تھا۔

وکیلِ سرکار نے درخواست ہٰذا سے خلاف تحریری اعتراضات میں یہ موقف اختیار کیا کہ اپیلانٹ مذکورہ بالا دونوں گواہوں کو نہ صرف جانتا تھا بلکہ وہ دستیاب بھی تھے۔ ہائی کورٹ نے اپیلانٹ سے پوچھا تھا کہ آیا وہ اپنی صفائی میں کوئی گواہ پیش کرنا چاہتا ہے لیکن اُس نے نفی میں جواب دیا۔ اس لئے اس مرحلہ پر مطلوبہ گواہوں کو طلب نہیں کیا جانا چاہئے۔

وکلائے فریقین کے دلائل سننے کے بعد بینچ نے استغاثہ کی رائے قبول کرتے ہوئے اپیلانٹ کی درخواست خارج کر دی۔

تیسری درخواست میں صفائی کے 10 گواہوں کو طلب کرنے کی گزارش کی گئی تھی۔ جن میں جنرل

www.bhutto.org

نکاخان' مسٹر عزیز احمد' راؤ عبدالرشید' جام صادق علی' غلام مصطفیٰ کھر' اور پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نیز سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ کے بعض حکام شامل تھے۔

یہ درخواست بھی اس بناء پر خارج کر دی گئی کہ اپیلانٹ نے از خود عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور بینچ کی طرف سے موقع دیئے جانے کے باوجود اُس نے صفائی پیش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے اس مرحلہ پر وہ صفائی کے گواہ طلب نہیں کر سکتا۔

مقدمہ سے سیاسی عوامل کا کوئی تعلق نہیں

بھٹو کے وکلاء نے ہائی کورٹ کی طرح سپریم کورٹ میں بھی یہ دعویٰ بڑی شدومد سے کیا اور اس بات پر بڑا زور دیا کہ بھٹو کے خلاف قتل کا کیس سیاسی بنیادوں پر ایک بین الاقوامی سازش کے تحت بنایا گیا ہے جس کا مقصد اپیلانٹ کو سیاسی و جسمانی طور پر ختم کرنا ہے۔ تاہم سپریم کورٹ نے اُن کے اس ادعا کو مسترد کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ ایسی باتیں مقدمہ کے ریکارڈ اور اس کے عدالتی فیصلہ سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ اور یہ کہ اپیل کے فیصلہ کا انحصار سیاسی محرکات پر ہرگز نہیں ہو گا اگر مطلوبہ شہادت اس قسم کے فوجداری مقدمات پر اطلاق پذیر قانونی اور عدالتی معیار پر پوری اترتی ہے اور معقول شک وشبہ سے بالاتر رہتے ہوئے ملزم کے قصور کو ثابت کرتی ہے تو عدالت کو لازماً اپنا فرض منصبی ادا کرنا پڑے گا۔ اگر اپیلانٹ کو دی گئی سزا بحال رکھنے کیلئے ایسی شہادت موجود نہیں تو سیاسی ملاحظات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ سزا کالعدم کر دی جائے گی۔ کیس کے اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اُس مبینہ بین الاقوامی سازش کی تفصیلات میں جانا ضروری نہیں سمجھتے جس کی طرف مسٹر یحییٰ بختیار نے اشارہ کیا ہے۔

(دیکھئے اپیل کے فیصلہ کا پیرا نمبر 32۔ پی ایل ڈی 1979ء ایس سی 53)

صفائی کی طرف سے فیصلہ پر کئے گئے اعتراضات

بھٹو کے فاضل وکیل مسٹر یحییٰ بختیار نے ہائی کورٹ کی کارروائی پر حسب ذیل تفصیلی اعتراضات کئے۔

1..... مقدمہ کی کارروائی اس تعصب کی بناء پر کالعدم ٹھہرتی ہے جو اپیلانٹ کے خلاف مقدمہ سیشن کورٹ کی بجائے براہ راست ہائی کورٹ میں چلایا گیا۔ یوں وہ اپیل کے ایک حق سے محروم ہو گیا۔

2..... شہادت کا بڑا حصہ جس کی تفصیل انہوں نے بتائی قانون شہادت کی دفعہ 10' 30 اور 32 کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عدالتی تحقیقات میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اب اُس حصہ کو لازماً خارج کیا جائے۔

3..... (الف) ..... دونوں سلطانی گواہوں نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ 337 کے مطابق مکمل اور صحیح حالات کا انکشاف نہیں کیا اس لئے قانون کی رو سے انہیں وعدہ معاف گواہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اُن

www.bhutto.org

کی گواہی قانونِ شہادت کی دفعہ 10 کے دائرۂ اثر میں نہیں آتی۔

3 (ب) جملہ اقبالی بیانات ضابطہ فوجداری کی دفعہ 164 کی ذیلی دفعہ (1) - (الف) کے احکام کو پامال کرتے ہوئے قلمبند کئے گئے کیونکہ اپیلانٹ موقع پر موجود نہیں تھا۔ نیز اپیلانٹ کو جرح کا موقع نہیں دیا گیا۔ جس سے اُس کو زبردست نقصان پہنچا۔

4 اپیلانٹ پر الزام ہے کہ اُس نے ابتداء میں ایف ایس ایف کے آفیسر ڈی جی حق نواز نواز کے ساتھ سازباز کی تھی جبکہ فردِ جرم میں اس سلسلے میں کوئی الزام نہیں لگایا گیا اور استغاثہ کو ایسی بنیادی شہادت پیش کرنے سے بری الذمہ کر دیا۔ جس سے سازش ثابت ہوتی۔

5..... چونکہ مبینہ سازش قصوری کے والد کی ہلاکت کے ساتھ ختم ہو گئی تھی اس لئے اپیلانٹ یا اس کے ماتحتوں اور شرکائے سازش کے مابعد رویہ کی بابت شہادت نہ صرف ناقابلِ ادخال ہو گئی بلکہ غیر متعلق بھی بصورت دیگر بھی مذکورہ افعال ملزم کو ملوث نہیں کرتے اور ان سے سازشوں کی بابت استنباط نہیں کیا جا سکتا۔

6 ..... ملزم کو پھنسانے والی شہادت کے متعدد اہم اجزاء سے جن پر عدالت نے انحصار کیا اپیلانٹ کو زیرِ دفعہ 342 ضابطہ فوجداری آگاہ نہیں کیا گیا۔ اس لئے موجودہ عدالت کو ان پر غور نہیں کرنا چاہئے۔

7 عدالت عالیہ نے ملزم کی غیر حاضری 77-11-16 تا 77-12-5 نیز 77-12-14 تا 77-12-17 کے ایام میں مقدمہ کی سماعت جاری رکھ کر ضابطہ فوجداری کی دفعہ 540 الف کے احکام سے انحراف کیا۔ اس لئے ان تاریخوں کو جن گواہوں کی شہادت قلمبند کی گئی وہ قانونی طور پر اپیلانٹ کے خلاف استعمال نہیں کی جا سکتی۔

8 مسعود محمود، غلام حسین اور عبدالحئی نیازی جیسے اہم گواہوں کے زیرِ دفعہ 161 ضابطہ فوجداری قلمبند کئے گئے بیانات کی نقول صفائی کو فراہم نہیں کی گئیں۔ اس طرح صفائی کو اُن پر جرح کرنے کے قیمتی حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس لئے ان گواہوں کی پوری شہادت کو زیرِ غور نہ لایا جائے۔

9 ہائی کورٹ نے صفائی کو استغاثہ کے اہم گواہوں پر ان کے سابق بیانات میں موجود فروگذاشتوں پر حسبِ ضابطہ گرفت کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے غلطی سے یہ موقف اختیار کر لیا تھا کہ فروگزاشتیں یا حافظہ کی کمزوریاں قانونِ شہادت کی دفعہ 145 کے مفہوم میں تضادات کے ضمن میں نہیں آتیں۔ اپیلانٹ کو یہ ثابت کرنے کا موقع نہیں دیا گیا کہ گواہ قابلِ اعتبار نہیں تھے۔

10 ..... وکیل صفائی کو استغاثہ کے گواہ محمد امیر کی جیپ کی لاگ بک ثابت کرنے سے غیر قانونی طور پر روک دیا گیا حالانکہ یہ معاملہ پوری طرح قانونِ شہادت کی دفعہ 35 پڑھے بشمول دفعہ 114 تمثیل (ای) کے تحت آتا ہے۔ نتیجتاً صفائی کو یہ ثابت نہیں کرنے دیا گیا کہ وقوعہ کے روز جیپ کی کارکردگی کیا تھی

www.bhutto.org

میں غلام حسین کی کہانی کی دستاویزی شہادت سے تردید ہوتی ہے۔

11..... صفائی کے طلب کردہ بعض گواہوں کو مثلاً متعلقہ دور کے وزیر اعلیٰ پنجاب محمد حنیف رامے، خالی کارتوسوں کی فردِ برآمدگی کے گواہ راؤ عبدالرشید (تب آئی جی پنجاب) و دیگران کو جن کی فہرست پیش کی گئی تھی طلب نہیں کیا گیا تھا انہیں اس عدالت میں بلایا جائے یا استغاثہ کے خلاف معکوس نتیجہ اخذ کیا جائے۔

12..... اگر مذکورہ بالا اعتراضات پر ضروری توجہ دی جائے تو کوئی بھی شہادت چاہے وہ جس قسم کی ہو ریکارڈ پر باقی نہیں رہتی نہ ہی عدالت عالیہ کی طرف سے دی گئی سزائیں بحال رہتی ہیں۔ بصورت دیگر بھی قصوری، مسعود محمود، سعید احمد خان، ایم آر ویلیچ اور غلام حسین جیسے اہم گواہوں کی شہادت جن پر عدالت نے بہت زیادہ انحصار کیا ہے تضاد بیانیوں اضافوں غلط بیانیوں اور ناقابل یقین باتوں سے پُر ہے۔ یہاں تک کہ قصوری کی کار پر جس طریقہ سے فائرنگ کی گئی تسلی بخش طور پر اس کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی سازش کی نوعیت اور اس پر عملدرآمد کے ذمہ دار افراد خصوصاً غلام حسین کی وقوعہ کے روز لاہور میں موجودگی کی بابت کوئی حتمی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

13..... دونوں وعدہ معاف گواہ اور سعید احمد خان جن پر استغاثہ کے کیس کا زیادہ دارومدار ہے مشکوک کردار اور مشتبہ ماضی کے حامل ہیں ان کی گواہی بنیادی طور پر ناقابل یقین ہے۔ جو غلط بیانیوں اور تضادات سے بھری ہوئی ہے اس لئے اس کی تائید میسر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی گواہی صرف اس صورت میں قابل قبول ہو سکتی تھی جبکہ اس کی قوی تائید میسر آتی موجودہ صورت حال میں صرف شریک ملزمان کی یا ایسے افراد کی تائیدی شہادت دستیاب ہے جو ان سے کسی طور بہتر نہیں۔ پس یہ شہادت اپیلانٹ کی سزایابی کو بحال رکھنے کیلئے کافی نہیں۔

14..... اپیلانٹ قصوری کے قتل کا کوئی محرک نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ سیاسی لحاظ سے کوئی اہم شخصیت نہیں تھی۔ اپیلانٹ کے اس سے کہیں بڑے اور سخت نکتہ چین موجود تھے مثلاً خان عبدالولی خان وائیر مارشل اصغر خان۔ قصوری نے اپنے دوسرے ممکنہ دشمنوں کا خود اعتراف کیا تھا۔ نیز یہ کہ محرک سے کسی صورت میں سازش کے الزام کی تائید نہیں ہوتی۔

15..... ہائی کورٹ نے غلطی سے انٹیلی جنس رپورٹوں پر انحصار کر کے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ اپیلانٹ نے قصوری کو دوبارہ پی پی میں شامل ہونے کی ترغیب دی تھی۔

16..... استغاثہ معقول شہادت کے ذریعے یہ ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا ہے کہ جائے واردات سے جو خول ملے وہ ایف ایس ایف کی تھرڈ بٹالین کی 25 گنوں میں سے کونسی گن سے فائر کئے گئے تھے یہ بٹالین متعلقہ وقت پر والٹن میں مقیم تھی۔ کھوکھوں میں ردوبدل کی بابت 75-1974ء میں ابتدائی طور پر کیس کی تفتیش کرنے والے پولیس افسروں کے مختلف نظریات بالکل ناموافق اور نظرثانی کردہ

www.bhutto.org

نوعیت کے تھے۔ ان نظریات کو اس وقت منظر عام پر لایا گیا جب ماہر اسلحہ کی رپورٹ منفی پائی گئی۔
یہ رپورٹ غلام حسین کی اور اسے اسلحہ فراہم کرنے والے گواہوں کی شہادت کیلئے ہلاکت خیز ہے۔
17........ شریک ملزمان کے اقبالی بیانوں میں کوئی وزن نہیں' نہ ہی وعدہ معاف گواہوں نیز سعید احمد خان' ایم آر ویلچ یا لاہور کے پولیس افسروں کی شہادت میں کوئی وزن ہے کیونکہ وہ سب سرکاری ملازم تھے اور مارشل لاء کے دباؤ تلے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے دباؤ میں آکر یا اپنی جانیں بچانے کی غرض سے ترغیبات و تحریصات کی بناء پر جھوٹی گواہی دی تھی۔
18........ بینچ نے سماعت کے دوران کھلے تعصب کا مظاہرہ کیا نیز بند کمرے میں سماعت کر کے ضابطہ فوجداری کی دفعہ 352 کے احکام کی صریح خلاف ورزی کی جس سے پوری کارروائی کالعدم ٹھہرتی ہے اور اپیلانٹ بریت کا مستحق ہے۔
19........ اگر استغاثہ کے مبینہ حقائق کو ثابت شدہ مان لیا جائے تب بھی جرم سازش کا ایک اہم عنصر یعنی سازشیوں کے مابین سمجھوتہ غائب ہے۔ ایف ایس ایف کے جملہ افسران' ڈائریکٹر جنرل سے لیکر اے ایس آئی تک سبھی دباؤ کے تحت کام کر رہے تھے اور افسرانِ بالا کے احکام کی بجا آوری کیلئے سرگرم عمل تھے اور
20........ آخری بات یہ ہے کہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 111 کا اس مقدمہ پر اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ مقتول کی موت کو اپیلانٹ اور مسعود محمود کے مابین ہونے والی سازش کا اغلب نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کی مجرمانہ ذمہ داری تمام تر ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو عملاً اس کا موجب بنے۔ بہرحال اپیلانٹ کو اس دفعہ کے تحت ملزم نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔
(دیکھئے اپیل کا فیصلہ۔ پیرا نمبر 33 بھٹو بنام سرکار' پی ایل ڈی 1978ء۔ ایس سی ۔ 53)

www.bhutto.org

آٹھواں باب

صفائی کی طرف سے شہادتوں کا تجزیہ و محاکمہ

بھٹو کے دفاع میں ان کے وکیل نے اپنا کیس پیش کرنے میں 57 دن لئے۔ یحییٰ بختیار نے اس کا آغاز 20 مئی کو کیا۔ پہلے انہوں نے استغاثہ کے کیس کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جسے ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں من و عن قبول کر لیا تھا۔ بعد ازاں وہ ان بنیادی امور پر آئے جن پر اپیل کو استوار کیا جانا تھا۔

"میں بنیادی نکات بہت اختصار سے پیش کروں گا" یحییٰ بختیار نے آغاز کیا۔" استغاثہ نے اپنا کیس مسٹر بھٹو کے خلاف تین نکات پر استوار کیا ہے۔ یہ ایک جعلی گھڑا گھڑایا اور خود ساختہ کیس ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی سازش کا نتیجہ ہے جس میں مسٹر بھٹو کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ انہیں ملک کے منتخب وزیر اعظم کے عہدے سے جبراً ہٹایا گیا تاکہ ان کا سیاسی و جسمانی طور پر صفایا کیا جا سکے۔

میری بحث کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان پر ایک ایسے بینچ سے مقدمہ چلوایا گیا جو کلیتاً اُن کے خلاف تھا اور عناد رکھتا تھا۔ یہ کارروائی عناد و تعصب سے بھری ہوئی تھی۔ اس کی سماعت منصفانہ انداز میں نہیں کی گئی۔ اس لئے دو تین ماہ تک اپنی صفائی پیش کرنے کی پوری کوشش کرنے کے باوجود بھٹو کو مجبوراً کارروائی کا بائیکاٹ کرنا پڑا۔ بینچ نے اُن کیلئے یہ ناممکن بنا دیا تھا کہ اپنا دفاع کر سکیں۔ گواہوں کے بیانات میں جو تضادات، عدم استحکام اور بے یقینی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس کی بناء پر استغاثہ کے کیس میں نہ کوئی وزن ہے نہ جان۔ مقدمہ جس انداز سے چلایا گیا اس سے بھی قطع نظر بھٹو کے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا۔ معقول اور ٹھوس شکوک و شبہات سے بالاتر بھٹو کو کسی طرح بھی مجرم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔"

بختیار کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ 41 گواہوں کی شہادتیں پڑھیں۔ اس میں انہیں 35 دن لگے۔

www.bhutto.org

درمیان میں ججوں کی طرف سے کثرت سے مداخلت ہوئی۔ استغاثہ نے بھی وضاحتیں طلب کیں اور ان میں خود بختیار کی اپنی معروضات و گزارشات بھی شامل تھیں۔

پہلی شہادت جس کے بخیئے ادھیڑنے مقصود تھے وہ قصوری کی تھی۔ جو دعویٰ کرتا تھا کہ "میں بھٹو کا سیاسی حریف تھا" اس کے اس دعویٰ کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ اُس سے کہیں زیادہ مضبوط اور طاقتور کئی دوسرے حریف موجود تھے مثلاً راؤ خورشید علی خان ولی خان اور اصغر خان وغیرہ۔ مبینہ طور پر قتل کا محرک اور جواز اس باہمی توتکار کو قرار دیا گیا تھا جو 3 جون 1974ء کو بھٹو اور قصوری کے مابین اسمبلی میں ہوئی تھی۔ ایک سیاسی رہنماء پر تنقید و تعریض تو سیاسی زندگی کا حصہ ہوتی ہے۔ صفائی نے وضاحت سے بتایا کہ بھٹو ایسی نکتہ چینی کے عادی ہو چکے تھے۔ قصوری کا سیاسی کیریر ظاہر کرتا ہے کہ جب سے اس نے پی پی پی کی رکنیت ترک کی اس نے سیاسی منظر میں کوئی ترقی نہیں کی۔ وہ کئی برس تک بھٹو کی مخالفت کرتا رہا۔ پھر ایک موقع پر ست انسان کی حیثیت سے اُس نے مخالفت ختم کر کے دوبارہ بھٹو کی اطاعت قبول کر لی۔ اس نے بڑی تگ و دو اور تابعداری کا یقین دلانے کے بعد پی پی پی میں شرکت اختیار کی۔ دستاویزیں شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ اس سلسلہ میں پہل اس کی طرف سے ہوئی تھی اگر بھٹو مجرم ہوتے تو اسے اس انداز میں نہ دھتکارتے۔ نہ ہی اس کی منت سماجت سے بھری ہوئی درخواستوں کو ٹھکراتے۔ فروری 76ء میں اسے دوبارہ قبول کر لیا گیا تو پھر اس نے کبھی مخالفت نہیں کی بلکہ بھٹو کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ جون 76ء میں میکسیکو کے دورہ کے بعد بھٹو کی شان میں قصیدہ پر مشتمل ایک رپورٹ لکھی۔ اپنا سیاسی کیریر بنانے کیلئے اُس نے باپ کے خون کو بھی فراموش کر دیا۔ اگر اسے جان کا خوف ہوتا تو سیاست سے ہی ریٹائر ہو جاتا۔ اگر اُس کے دل میں نفرت ہوتی تو انتخابات کے دنوں میں بھٹو کو بے نقاب کرتا۔ اُسے قاتل اور ڈکٹیٹر ثابت کرتا۔ اس کے برعکس اس نے قومی اسمبلی کا ٹکٹ حاصل کرنے کیلئے بڑی منتیں کیں لیکن بھٹو نے ٹکٹ نہ دے کر ثابت کر دیا کہ وہ مجرم نہیں تھے۔ راؤ خورشید بھی اسمبلی میں بھٹو پر زبردست تنقید کیا کرتے تھے۔ لیکن 1977ء کے انتخابات میں انہیں پارٹی کا ٹکٹ دیا گیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصوری کو قتل کرانے کا محرک سابق وزیراعظم کے ساتھ محض اس لئے منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ قصوری پارلیمنٹ میں اُن پر نکتہ چینی کرتا رہتا تھا۔ بھٹو پر اس کی تنقید اس سطح کی تھی جو ہر سیاست دان پر لازماً کی جاتی ہے۔ قتل کا یہ کوئی معقول محرک نہیں تھا۔ قصوری نے اپنی اس گواہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جو اس نے شفیع الرحمٰن ٹریبونل میں دی تھی جس میں اُس نے ایسے چار گروپوں کا ذکر کیا تھا جو ممکنہ طور پر اُسے قتل کرنے کا محرک رکھتے تھے۔ اُس نے بھٹو پر تنقید و تعریض کر کے خود کو پارٹی کے کارکنوں میں ناپسندیدہ بنا لیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں اُس پر 15 قاتلانہ حملے ہوئے۔ پھر قصوری نے وقوعہ اسلام آباد کی ابتدائی رپورٹ میں بھٹو کا نام تک نہیں لیا تھا۔ صفائی نے ان تمام پہلوؤں کو زیر بحث لا کر یہ ثابت کیا کہ بھٹو کو کسی طرح بھی جرم میں ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ ہائی کورٹ

www.bhutto.org

نے شفیع الرحمٰن رپورٹ کو ریکارڈ پر لانے سے انکار کر دیا تھا جبکہ سپریم کورٹ اسے ریکارڈ پر لے آئی جس میں قصوری نے ان چار گروپوں کے نام لئے تھے جو اسے قتل کرنے کا ممکنہ محرک رکھتے تھے۔ محرک کو مشکوک بنا دینے کے بعد سازش کے متعلق استغاثہ کی بنائی گئی کہانی پر حملہ کی باری آ گئی۔

صفائی نے اس بات پر بھی اعتراض کیا کہ قصوری کی وہ ذاتی شکایت جو اس نے 31 جولائی 77ء کو دائر کی تھی اس پر پہلے عمل نہیں ہوا اس درخواست میں قصوری نے نہ صرف بھٹو بلکہ سعید احمد خانؒ مسعود محمود اور راؤ رشید پر بھی الزام لگایا تھا۔ قصوری کا بیان پہلے ہی قلمبند ہو چکا تھا اور دو جج اس معاملہ کو نمٹا رہے تھے۔ اگر ان چاروں سینئر افراد پر مقدمہ چلایا جاتا تو ایک بہت ہی مختلف تصویر سامنے آتی۔ صفائی کے مطابق یہ حکومت کی چال تھی کہ بھٹو کا صفایا وکیل استغاثہ کے ذریعے کرایا جائے حالانکہ یہ کیس قصوری کو خود لڑنا چاہئے تھا اگر ایسا ہوتا تو منجمد دیگر امور کے یہ کیس قصوری کو کنگال کر دیتا۔

دوسرا گواہ مسعود محمود تھا جس کی شہادت پر سازش کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ جو چالاکی اور ہوشیاری برتی گئی وہ شہادت سے ظاہر ہو رہی تھی کہ اس آدمی کے پاس جس کے ساتھ مبینہ طور پر بھٹو نے سازش کی، وعدہ معاف گواہ بننے کا قوی جواز تھا بشرطیکہ اس کی جان بخشی کر دی جائے۔ مزید برآں وہ مقدمہ کی کارروائی کے دوران نظر بند رہا اور اسے ایف ایس ایف کے ڈی جی کے برابر اوایس ڈی کی تنخواہ ملتی رہی۔ یحییٰ بختیار کے بقول حکومت نے اُسے گرم رضائی میں رکھا ہوا تھا۔ بھٹو کو پھنسانے کیلئے اس کا اپنا جواز قطعی طور پر عیاں تھا۔ اس لئے اس نے اپنی گواہی کو ہر لحاظ سے پائیدار اور قابلِ اعتبار بنانے کی کوشش کی۔

صفائی نے نکتہ اٹھایا کہ مسعود کے اپنے بیان کے مطابق اُسے چونکہ مجبوری کے تحت یہ ہدایات دینی پڑیں کہ قصوری کو قتل کر دیا جائے اسلیے وہ سازش میں ایک فریق نہیں بن سکتا کیونکہ سمجھوتہ کیلئے فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔

استغاثہ کے مطابق سازش کا منصوبہ اسمبلی میں 3 جون 74ء کی توتکار کے بعد بنایا گیا تھا لیکن جب اس کی توجہ اسلام آباد والے حملہ کی طرف مبذول کرائی گئی تو اُس نے جواب دیا "مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں"۔ وکیل صفائی نے پھر سوال کیا کہ اگر وہ قصوری کے قتل کی سازش میں شریک سازشی تھا تو پھر اسے اُس حملے کا علم بھی ہونا چاہئے جو غلام حسین نے منظم کیا تھا۔ مزید برآں وہ اپنی گواہی میں سازش کے صحیح وقت کو بدلتا رہا۔ مجسٹریٹ کے سامنے زیرِ دفعہ 161 بیان میں اس نے کہا کہ سازش نے اس کے ڈائریکٹر جنرل بننے کے بعد یا دو ماہ بعد جنم لیا۔ اُسے 23 اپریل 74ء کو مذکورہ بالا منصب سونپا گیا تھا لیکن ٹرائل بینچ کے سامنے اس نے کہا یہ سازش 3 جون کی توتکار کے ایک یا دو دن بعد تیار کی گئی تاکہ اس طرح وہ استغاثہ کے کیس کے ساتھ زیادہ مطابقت پیدا کر سکے۔ یہ اُن چند بڑی تبدیلیوں اور اصلاحات میں سے ایک تھی جنہیں صفائی منظرِ عام پر لانا چاہتی تھی اور یحییٰ بختیار کی معروضات کے دوران انہیں ریکارڈ پر لے آئی۔

www.bhutto.org

صفائی نے متعدد حقائق سے ثابت کیا کہ مسعود کو سازش میں ایسا کردار دیا گیا تھا جو حقیقتاً گوئی کردار نہیں تھا۔ اس کی اپنی شہادت کے مطابق بھٹو تو قصوری کے قتل کا حکم ٹوانہ کے زمانہ میں ہی دے چکے تھے۔ ایسی صورت میں کیا یہ بات منطق پر پوری اترتی ہے کہ بھٹو نے ایک اور شخص کو سازش میں شریک کرنا چاہا جس کا اپنا دعویٰ ہے کہ "میں سازشی بننے کیلئے تیار نہیں تھا۔" اس سے استغاثہ کے کیس کا ایک اور تضاد سامنے آیا یعنی ایک طرف تو بھٹو نے جون 74ء میں سازش تیار کی دوسری طرف وہ اس سے پہلے ٹوانہ کو ساتھ ملا کر پہلے ہی سازش تیار کر چکے تھے۔ ٹوانہ فوت ہو چکا تھا اس لئے وہ مسعود کے بیان کی تائید یا تردید نہیں کر سکتا تھا۔

مسعود کے بیان کے مطابق اس سازش کو ٹیلی فون پر بروئے کار لایا گیا تاکہ پورا معاملہ لوگوں کے علم میں آسکے۔ اُس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے فون پر دیلیج کو کوئٹہ میں ہدایات دیں کہ جب قصوری وہاں آئے تو "اس پر کڑی نظر رکھی جائے"۔ اس زمانہ میں راولپنڈی و کوئٹہ کے مابین ڈائریکٹ ڈائلنگ نہیں تھی۔ اس لئے آپریٹر بڑی آسانی سے مسعود کی ہدایات کو سن سکتا تھا۔ اس طرح کا غیر ذمہ دارانہ عمل اور وہ بھی ایک شریک سازش کی طرف سے کس طرح سچا تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ جب صفائی نے فون کے استعمال کو قطعاً بے معنی اور جھوٹ قرار دیا تو بعد کے بیانات میں اُس نے فون کا ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ ایسے کتنے ہی واقعات تھے جن میں تبدیلی اور تصحیح کی گئی۔ جن میں تناقضات، تضادات اور عدم مطابقتیں تھیں۔ ان کی بناء پر صفائی نے ثابت کیا کہ وہ ایک جھوٹا اور ناقابل اعتبار گواہ ہے۔ اگر قتل کا الزام کسی وعدہ معاف گواہ کی طرف سے لگایا جائے تو قانون تقاضا کرتا ہے کہ اس کی گواہی دوہرے ٹیسٹ پر پوری اترے۔ اولاً یہ کہ وہ خود قابل اعتماد ہو، دوسرے اہم کوائف میں اس کی شہادت کو تائید و مطابقت میسر آئے۔ صفائی کا کہنا تھا کہ وہ خود قابل اعتماد نہیں ایسی صورت میں الزام برقرار نہیں رہتا۔ صفائی نے یہ بھی ثابت کیا کہ اس کی گواہی کسی آزاد گواہ کی شہادت کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتی، اُس کی تائید نہیں ہوتی۔ اس لئے بھٹو کو وعدہ معاف گواہ کے الفاظ پر پھانسی دینا سراسر خلافِ قانون و انصاف ہو گا۔ اسلامی قانون میں بھی اس کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔

اب بختیار نے آزاد گواہ سعید احمد خان کو لیا۔ انہوں نے ہر ممکنہ قوت کے ساتھ اس کی گواہی کو ہدفِ تنقید بنایا تاکہ اسے بے بنیاد اور جھوٹا ثابت کیا جاسکے۔ بھٹو کا یہ چیف سیکورٹی افسر اپنی ہی شہادت کے مطابق کئی جگہ خود سازشی بن جاتا تھا۔ کبھی تحقیقات کا رخ بدلنے والا کبھی مقدمے کو دبانے والا کبھی قصوری کو پی پی میں دوبارہ شرکت کی ترغیب دینے والا اور قصوری کی ذاتی فائل رکھنے والا۔ اگر اس کی گواہی کو صحیح مان لیا جائے تب بھی وہ ایک آزاد گواہ کی حیثیت میں رہتا ورنہ واضح طور پر اپنی سازش کے حصہ کو چھپانے کیلئے بھٹو کو ملزم قرار دینے کا جواز رکھتا تھا۔

مسعود اور سعید احمد خان کا کہنا تھا کہ بھٹو ہم دونوں کا دشمن تھا اور صفائی ان کے اس بیان کو تسلیم کرتی

www.bhutto.org

تھی کہ یہی وہ سبب تھا جس کے تحت وہ بھٹو کو پھنسا رہے تھے۔ اسی واسطے اُنکی شہادتیں قابلِ اعتراض اور غلط تھیں۔ مزید برآں سعید نے جرح میں کہا تھا کہ اسے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ دوسری طرف اس نے اعتراف کیا کہ "میں نے 1972ء میں بھٹو کو ایسے خطوط لکھے تھے اور انہیں شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا میں خود کو آپ اور آپ کے نصب العین کیلئے وقف کر چکا ہوں میں آپ کیلئے جان دے سکتا ہوں لیکن میں آپ سے تھوڑی سی حوصلہ افزائی چاہتا ہوں اور جواب میں داد کا ایک لفظ براہ کرم میری بات پر یقین کریں کہ میں اپنی کشتیاں جلا چکا ہوں اور آپ کے ساتھ ہی ڈوبوں گا یا پار اتروں گا۔"

جہاں تک پرسنل فائل کا تعلق جسے استغاثہ نے بہت زیادہ اچھالا اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ بھٹو قصوری کو ختم کرانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ جو سعید کے اپنے بیان کے مطابق سیاسی زندگی میں معمول کا ایک واقعہ تھا کیونکہ پی پی کے بہت سے ناراض اور اپوزیشن کے تمام رہنماؤں کی فائلیں رکھی جاتی تھیں۔

بختیار نے بڑی ہوشیاری اور ذہانت سے سعید احمد کے بیان کے اس حصہ کو پیش اور نمایاں کیا جس میں اس نے بتایا تھا کہ بھٹو نے اُسے کہا تھا کہ وہ محمود کو اس کام کی یاددہانی کرادے جو اسے قصوری کے بارے میں سونپا گیا ہے اگر اس کی اپنی شہادت کو سامنے رکھا جائے کہ اُس کا وزیراعظم سے اکثر رابطہ رہتا تھا تو کیا بھٹو اس قابل نہیں تھے کہ مسعود کو اس کام کی یاددہانی کراتے' نہ کہ سعید سے یوں کہتے ہوئے ایک اور آدمی کو سازش میں شریک کرتے؟

صفائی کو یقین اور اس کا موقف تھا کہ سعید احمد اور باجوہ بہت مصروف لوگ تھے وہ بلاوجہ ہر کام میں ٹانگ اڑاتے تھے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ جو کچھ کرتے تھے اس کا حکم بھٹو کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ پہلے ظاہر کیا جا چکا ہے وہ تمام نوٹ اور خطوط جو بطور دستاویزات مقدمہ میں پیش کئے گئے نشان دہی کرتے ہیں کہ خود قصوری یہ چاہتا تھا کہ اُسے دوبارہ پی پی میں شامل کر لیا جائے۔ سعید احمد اور باجوہ اس معاملے میں بچولئے کا کردار ادا کر رہے تھے۔

گواہوں کی شہادتوں سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ قتل کے بعد انہیں انکوائری کرنے سے روکا گیا یا ثبوت اکٹھے کرنے سے منع کیا گیا ہو۔ وہ محض اس قدر کہتے ہیں کہ انہیں ہدایات دی گئی تھیں لیکن اگر سعید احمد' محمد اصغر اور وکیل خان کی شہادت کو سامنے رکھا جائے کہ وہ حقیقی مجرموں تک پہنچنے کا رُخ تبدیل کر رہے تھے تو اغلب قیاس یہ ہے کہ سعید احمد خود اس میں ملوث تھا اور اس کی شہادت کو مسعود کی گواہی کی تائید و مطابقت میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ایک طرف وہ داغ دار اور ملوث نظر آتا ہے دوسری طرف وہ ایک معصوم فرشتہ بن جاتا ہے صفائی نے یہ نکتہ بھی پیش کیا کہ اس کا معاون باجوہ 1976ء کے اوائل میں فوت ہو گیا تھا۔ وہ اس قابل نہیں کہ سعید کی شہادت کی تائید کر سکے۔ صفائی کو اس بات پر یقین تھا کہ سعید آزاد گواہ نہیں ہے کہ وہ مسعود کی گواہی کی تائید کر کے اسے قابل قبول بنا سکے۔

www.bhutto.org

استغاثہ کے چوتھے گواہ ایم آر ویلچ کے بیان سے بھی مسعود کی گواہی کی تائید نہیں ہوتی۔ اس نے بیان دیا تھا کہ قصوری کا صفایا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ بھٹو کے خلاف انتہائی بے ہودہ شر انگیز اور زہریلی تقریریں کرتا تھا لیکن مسعود نے اپنی گواہی میں یہ ثبوت بہم نہیں پہنچایا اُس لئے قانونی لحاظ سے اسے مطابقت اور تائید قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ویلچ بھی اس لحاظ سے شریک جرم لگتا ہے کہ اسے علم تھا کہ قصوری کے قتل کی کوشش ہو رہی ہے اور اس نے خود اس میں فریق بننے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس کی شہادت بھی اس راز کے انکشاف میں کوئی مدد نہیں کرتی کیونکہ اُس نے شہادت دینے کیلئے حلف نہیں اٹھایا تھا۔ صفائی کے پاس یہ ثبوت موجود تھا کہ وہ عملی عیسائی ہے۔ اس لئے اُس سے بائبل پر حلف اٹھوا کر شہادت ریکارڈ کرنی چاہئے تھی۔ اپنے عقیدہ کو چھپانے کی کوشش ظاہر کرتی ہے کہ وہ ہمیشہ سچ نہیں بولتا تھا۔ استغاثہ نے اس پر ریمارک دیا تھا کہ اس بات کا انکشاف "قدرے تاخیر" سے ہوا ہے تاہم اس کی شہادت جیسی بھی ہے اس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ کوئٹہ میں قصوری کی نگرانی کرنے یا اسے ٹھکانے لگانے کا حکم بھٹو نے دیا تھا بلکہ یہ مسعود تھا جس نے ایسے احکام دیئے تھے۔ اگر اس کے بیان کا محاکمہ کیا جائے تو اس کے بہت سے اجزاء صفائی کیلئے ضرر رساں ثابت نہیں ہوتے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ ایف ایس ایف اپنے چارٹر کے تحت کونسے فرائض انجام دیتی تھی؟ تو اس نے جواب دیا۔

"ہم ایسے تمام احکامات کی تعمیل کرتے تھے جو مجرمانہ نہیں ہوتے تھے" وکیل صفائی نے اعتراف کرنے والے ایک شریک ملزم کے حوالے سے کہا کہ چھوٹے ماتحت افسروں کو بعض غیر قانونی افعال کی تکمیل کیلئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ویلچ نے اس کی تردید کرتے ہوئے اصرار کیا

"ہم صرف ایسے احکام بجالاتے تھے جن کی نوعیت مجرمانہ نہیں ہوتی تھی"

اس بیان سے استغاثہ کے اس دعویٰ کی تردید ہوتی ہے کہ فورس کو مجرمانہ سرگرمیوں کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔

استغاثہ کے ان چار بنیادی اور اہم گواہوں کی شہادتیں قلمبند کرنے میں پورے بیس دن لگے تھے جبکہ بقیہ 37 گواہوں کی گواہیاں 28 دن میں ریکارڈ کی گئی تھیں۔ صفائی کی نظر میں یہ سب گواہیاں مشکوک اور ناقابل یقین تھیں۔

بختیار نے ان گواہوں کی شہادتوں کا جزئیات سے بغور محاکمہ کیا ان میں موجود تناقضات، تضادات اصلاحات اور تبدیلیوں کی کھل کر نشاندہی کی۔ باقی ماندہ گواہوں کی شہادتیں ان کے مقابلہ میں بہت مختصر تھیں۔

استغاثہ کی بڑی شکایات میں سے ایک شکایت وہ دباؤ تھا جو 1974ء میں تفتیش کنندگان پر ڈالا گیا لیکن کوئی بھی گواہ کسی خاص قسم کے دباؤ کی صحیح نوعیت کو بیان نہیں کر سکا۔ بجز سعید احمد اور باجوہ کے وہ بھی استغاثہ کا انکل پچو قیاس تھا جو ان دونوں کی بھٹو کے ساتھ سرگرمیوں کی بناء پر چسپاں کر دیا گیا تھا۔ اگر انہوں نے خود کسی مقصد کے تحت مناسب تفتیش و تحقیقات نہیں کی تو وہ خود بھی قتل کو چھپانے کے شریک

www.bhutto.org

مجرم تھے۔

استغاثہ کے ایسے ہی گواہوں میں سے ایک محمد اصغر خان نے بیان دیا تھا کہ اس پر دباؤ ڈالا گیا تھا لیکن جب اس سے دباؤ کی نوعیت پوچھی گئی تو اس نے قدرے جھینپتے ہوئے جواب دیا

"میں بیان کر چکا ہوں کہ مجھ پر دباؤ ڈالا گیا تھا لیکن میں نے یہ نہیں کہا کہ میں نے وہ دباؤ قبول کر لیا تھا۔ واحد دباؤ یہ تھا کہ میں مسٹر بھٹو سے پوچھ گچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا" یہ اعتراف ظاہر کرتا ہے کہ وہ مسٹر بھٹو سے پوچھ گچھ کرنے میں خود ہچکچاہٹ محسوس کرتا تھا۔ اس لئے تفتیش کو مکمل نہ کر سکا اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ 1977ء کے گرما میں جونہی اس مقدمہ کو دوبارہ شروع کیا گیا تو اس کی تحقیقات استغاثہ کے اطمینان کے عین مطابق تھی اور اس تحقیقات میں وزیر اعظم کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ جنہیں بڑی عجلت میں ستمبر 77ء میں حراست میں لیا گیا۔

استغاثہ کے 14 ویں گواہ وکیل خان نے اگرچہ سعید احمد اور باجوہ کی مداخلت کی شکایت کی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تصدیق کی کہ خود اُس نے نہ تو تحقیقات پر دباؤ ڈالا نہ اس پر اثر انداز ہوا نہ ہی تفتیشی افسروں کو خاص ہدایات دیں کہ مقدمہ صحیح خطوط کے بجائے کسی دوسری سمت میں ڈالا جائے۔

مزید برآں اس کی خبر ظاہر کرتی ہے کہ وہ اصغر خان کی فراہم کردہ تھی۔ استغاثہ کا الزام تھا کہ تحقیقات کے آغاز سے ہی اس میں مداخلت شروع ہو گئی تھی' اور کہا تھا کہ اسی لئے تحقیقات ایف ایس ایف کی طرف نہ جا سکیں لیکن وکیل خان نے خود تسلیم کیا کہ ایف ایس ایف کے خلاف تحقیقات کرنے کی کوئی ہدایت نہیں تھی کیونکہ وہ اس وقت تک ایسا نہیں کر سکتا تھا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ خالی کارتوس اسی کیلیبر کے تھے جو ایف ایس ایف استعمال کرتی ہے اور یہ تحقیقات ماہر اسلحہ کی رپورٹ کے بعد ہوئی۔ اس وقت وہ کیس کی تفتیش نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود صفائی کا موقف یہ تھا کہ کئی دوسرے فوجی یونٹ بھی اسی کیلیبر کا اسلحہ استعمال کرتے تھے۔

پندرہویں گواہ ملک محمد وارث نے بھی جس نے آخری مراحل میں تحقیقات کی نگرانی کی' مداخلت کی شکایت کی لیکن وہ بھی دباؤ کی اصل نوعیت کو واضح نہیں کر سکا۔ جس وقت اسے تفتیش سونپی گئی اس وقت تک جائے واردات کا معائنہ کیا جا چکا تھا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا خول برآمد کر لئے گئے تھے اور قرب وجوار میں رہنے والوں سے پوچھ گچھ کر لی گئی تھی اُس لئے اُس نے کہا۔

"میں یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اس کیس میں تحقیقات مناسب طریقہ سے کی گئی تھیں"

جب وکیل صفائی نے پوچھا "وہ کونسا خوف تھا جس کی بناء پر تم نے سعید احمد کا دباؤ قبول کر لیا؟" اُس کا جواب تھا "سارا خوف اس بات کا تھا کہ بھٹو حکومت کا کہہ چلتا تھا" اس کی یہ توضیح بھی کی جا سکتی ہے کہ مبینہ دباؤ بھٹو کی بجائے خود ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل کی طرف سے ڈالا گیا ہو۔

صفائی کو یقین تھا کہ 11 نومبر 74ء کو راؤ رشید کے گھر ہونے والی جس میٹنگ کا ذکر کیا جاتا ہے وہ

www.bhutto.org

استغاثہ کی گھڑی ہوئی کہانی ہے کیونکہ گواہوں میں سے کسی نے بھی اپنے ابتدائی بیان میں اس میٹنگ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ یہ کہانی اس تھیوری کو تقویت پہنچانے کیلئے گھڑی گئی تھی کہ خونوں میں ردوبدل کیا گیا تھا۔ صفائی کے نزدیک یہ امر انتہائی مشکوک تھا کہ استغاثہ نے راؤ رشید کو بطور گواہ طلب نہیں کیا۔ فریق صفائی نے مقدمہ کا بائیکاٹ کر دیا تھا اس لئے وہ بھی اپنی طرف سے انہیں نہیں بلا سکا صرف اس کی شہادت سے میٹنگ کی تصدیق ہو سکتی تھی۔

استغاثہ کے گواہوں کی شہادتوں میں تضاد بیانیاں اور تناقضات ثابت کرنے کیلئے بختیار نے مسعود محمود کے ڈرائیور منظور حسین کی شہادت کو نشانہ بنایا۔ مسعود کے بیان میں تھا کہ قتل کے بعد بھٹو نے صبح سویرے اُسے فون کیا اور اسے جھاڑ پلائی کہ سارا معاملہ چوپٹ کر دیا گیا ہے۔ بھٹو نے اسے صادق حسین قریشی کے گھر طلب کیا جب ڈرائیور سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا "میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ 11 نومبر کی صبح کو ملتان سے روانگی سے قبل مسعود محمود کہیں اور گئے تھے جہاں تک مجھے یاد ہے وہ 11 نومبر 74ء کی صبح کو ملتان میں کہیں نہیں گئے۔ میں انہیں کینال ریسٹ ہاؤس سے ڈرائیو کرتا ہوا ایئرپورٹ لے گیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ملتان میں وڈی جی جہاں کہیں جانا چاہتے تھے میں ہی انہیں کار ڈرائیو کر کے لے جاتا تھا"

اس سے مسعود کے اس بیان کی تکذیب ہوتی ہے کہ اُس دن کی صبح اسے بھٹو کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا تھا۔ صادق حسین قریشی بھٹو کے دوست کو بھی عدالت میں طلب نہیں کیا گیا کہ وہ یہ تصدیق کر سکتے آیا مسعود اُن کے گھر آیا تھا یا نہیں۔

اسلحہ اور ہتھیاروں کی سپلائی کے سلسلہ میں گواہان استغاثہ کے بیانات میں عدم مطابقت اور تضاد بیانی کو ظاہر کرنے کیلئے بختیار نے امیر بادشاہ اور فضل علی کو نکتہ چینی کا ہدف بنایا اور ثابت کیا کہ یہ کہانی غیر مستحکم ہے کیونکہ چلے ہوئے کارتوس استعمال میں آنے والی گنوں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اور ایسا کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کیا گیا کہ انہیں تبدیل کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ محض استغاثہ کا گھڑا گھڑایا قصہ ہے۔ جس کی تردید بہت سے شواہد سے ہوتی ہے۔

اس کے بعد غلام حسین کی شہادت سامنے آئی صفائی کو اُس کی گواہی پر جرح کرنے کا موقع اس لئے نہیں مل سکا تھا کہ بھٹو نے کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ قاتلانہ حملے کی بابت استغاثہ کے کیس کا تمام تر انحصار اُسی کی شہادت پر تھا۔ اعترافِ جرم سے پہلے وہ 14 دن تک پولیس کی تحویل میں رہا تھا اور مرضی کا بیان حاصل کرنے کیلئے اُس پر شدید دباؤ ڈالا گیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اصل موضوع سے ہٹانے کیلئے بار بار "مجھے یاد نہیں مجھے یاد نہیں" کا سہارا لیا۔ بختیار کا استدلال تھا یہ امر بہت ہی اہم ہے کہ اس نے مجسٹریٹ کے سامنے چند ماہ پہلے اگست 77ء میں جو بیان قلمبند کرایا اُس کے بارے میں بار بار کہتا ہے کہ مجھے یاد نہیں جبکہ دوسری طرف ساڑھے چار سال قبل رونما ہونے والے سانحہ کے متعلق پوری تفصیل سے

www.bhutto.org

ایک ایک بات بتاتا ہے لیکن ابتدائی بیان کی بابت اس کا حافظہ یکسر ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ عدالت میں جب اس سے سوال کیا گیا کہ اُس نے جرم کے منظر میں خود بھی کوئی گولی چلائی تھی۔ اُس نے پہلے کہا " مجھے یاد نہیں کہ میں نے پستول چلایا تھا" چند منٹ بعد سوال بدل کر پوچھا گیا کیا اُس وقت تم گلی میں ٹہل رہے تھے اور سٹین گنوں کی گولیوں کے برسٹ کی آواز سنی ' آیا اس سے پہلے تم نے پستول چلایا تھا تو اُس نے جواب نہیں دیا یہ جواب ارشد اقبال اور افتخار رانا کے اعتراف سے تضاد رکھتا ہے جنہوں نے کہا تھا کہ پہلا فائر اسی نے کیا تھا اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وُہ جرم کے منظر میں موجود تھا جبکہ اس کا اصرار تھا کہ " میں بیس گز دور ایک تنگ گلی میں ٹہل رہا تھا۔ میں ظہیر اور لیاقت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور کبھی کبھی ان سے باتیں کرنے کیلئے ان کے پاس جاتا تھا" گویا وہ بھی جرم کے منظر میں موجود تھے لیکن ان کا سراغ لگانے کیلئے کوئی تحقیقات نہیں کی گئی۔ اپنے اعترافی بیان میں اس نے یہ ذکر کیا تھا کہ لاہور آپریشن کی نگرانی اُسی نے کی تھی لیکن سماعت کے دوران کسی طرح استغاثہ کو یہ ٹیپ مل گئی کہ وہ تو وقوعہ کے دس دن پہلے اور بعد میں لاہور میں موجود ہی نہیں تھا بلکہ کراچی گیا ہوا تھا اور اس کا ثبوت وہ ٹی اے بل تھا جو اس نے ایف ایس ایف کے دفتر میں پیش کیا تھا۔ جب صفائی نے یہ درخواست دی کہ یہ دستاویز ریکارڈ پر لائی جائے کیونکہ اسے گواہ استغاثہ نمبر 31 کے بیان سے ایک نئی بات ملی تھی تو استغاثہ کی طرف سے گواہی میں یہ اضافہ کیا گیا کہ اس نے یہ ٹی اے بل غلطی سے میاں عباس کے حکم پر پیش کیا تھا تاکہ یہ ثابت نہ ہو سکے کہ وقوعہ کے وقت وہ لاہور میں موجود تھا۔ صفائی کے نزدیک یہ ایک اور ترمیم اور اصلاح تھی جو ٹی اے بل کے بارے میں بتائی گئی جو شہادت کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اس طرح ایک جعلی اندراج کیا گیا۔ اس سے اس کے رویہ کا پول اس طرح بھی کھُل جاتا ہے کہ اس نے سرکاری گواہ بننا قبول کیا اور اسے معافی دی گئی۔

بختیار نے کئی چارٹس پیش کئے جن میں غلام حسین کو جھوٹا گواہ ثابت کرنے کیلئے اُس کے بیانات میں جعل سازی ترامیم ' تصحیح اور فریب دہی کی نشان دہی کی گئی تھی۔ بلاشبہ یہ بڑا مشکل اور تھکا دینے والا کام تھا۔ بختیار نے غلام حسین کی اس رائے کو بطور خاص نمایاں کیا۔

" قصوری پر حملہ کرنے کیلئے مجھ پر میاں عباس کی طرف سے غیر معمولی دباؤ ڈالا گیا تھا"

صفائی کا موقف تھا کہ پہلی کوشش میں ناکامی کے بعد اُسے پھر وہی کام تفویض کرنا غیر منطقی بات تھی۔ حالانکہ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ وہ اس کام کے کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ صفائی کے نزدیک غلام حسین کا یہ کہنا بھی قرین قیاس نہیں تھا کہ وہ اکثر قومی اسمبلی جاتا تھا لیکن قصوری کو نہیں پہچانتا تھا وُہ شخص جسے وزیر اعظم کا دشمن سمجھا جاتا تھا گولہ بارود کے معاملہ میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی جا سکی کہ اس نے 9 مئی 74ء کو ایف ایس ایف کے اسلحہ خانہ سے کسی اندراج کے بغیر 1500 روند کیسے حاصل کر لئے یہ اس سلسلے میں غلام حسین اور فضل علی نے جو کچھ بتایا وہ سچ پر مبنی نہیں تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ 9 مئی کو اسلحہ خانہ کے سٹاک رجسٹر سے 1500 روند کے اجراء کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

www.bhutto.org

اس کے بعد نادر حسین عابدی کی شہادت زیر بحث آئی جس نے رائے دی تھی کہ چلے ہوئے کارتوس گنوں کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ عابدی کی رائے کو جھٹلانے کیلئے عبدالحئی نیازی نے ایک ماہرِ اسلحہ کی رائے کا اضافہ کیا جو پوری سماعت کے دوران سامنے نہیں آیا۔

اس کے علاوہ جو گولہ بارود استعمال کیا گیا اس کی تعداد کے بارے میں بھی شک وشبہ پایا جاتا تھا۔ فضل علی انچارج اسلحہ خانہ نے جو ڈچر پیش کیا اس میں اتنی تعداد کا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا جو مبینہ طور پر استعمال ہوئی تھی بلکہ اس میں سرے سے کوئی تعداد درج ہی نہیں تھی۔ استغاثہ نے عذر پیش کیا کہ اس میمو میں غلط اندراج کیا گیا تھا تاکہ صورت حال کو ابتر بنایا جاسکے۔ لیکن وہ عام شہری جو اندراج کے وقت موجود تھے انہیں گواہی دینے کیلئے کبھی نہیں بلایا گیا۔ صفائی کا یہ بھی اصرار تھا کہ کرنل زوار حسین کا جو خط پیش کیا گیا اُسے ثابت کرنے کیلئے کرنل کو خود طلب کرنا چاہئے تھا۔

صفائی نے اس بات پر بھی زور دیا کہ واردات میں جو کارتوس استعمال کئے گئے وہ 62ء7 ایم ایم کیلیبر کے تھے جنہیں دوسرے یونٹ بھی استعمال کرتے تھے۔ یہ نکتہ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جب گنوں اور چلے ہوئے کارتوسوں کے بارے میں یہ ماہرانہ رائے مل گئی کہ ان میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی تو انہیں معائنہ کیلئے ماہرِ اسلحہ کے پاس بھیجا گیا۔ اُسی کے بعد استغاثہ نے یہ کہانی گھڑی کہ کارتوس بدل دیئے گئے تھے۔ استغاثہ نے یہ تھیوری اس وقت بھی دہرائی جب اُسے اپنے کیس کی وکالت کرنے کا موقع ملا۔

جائے واردات کے دو نقشے تیار کئے گئے تھے جو باہم مختلف تھے لیکن یکساں دُشنائی سے بنائے گئے تھے خالی کارتوس چار جگہ سے ملے تھے۔ گیارہ چوک کے پاس سے پانچ ایک اور جگہ سے اور چھ دوسری جگہ سے برآمد ہوئے۔ ان کے مابین لگ بھگ دس قدم کا فاصلہ تھا۔ تیرہ چوک کے باہر ملے تھے سات ایک مقام پر اور چھ دوسری جگہ۔ ان کے درمیان قریباً 190 فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس سے نتائج اخذ کرتے ہوئے صفائی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ حملہ آور دو نہیں بلکہ چار تھے۔ ملزموں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اپنی اپنی جگہ سے ہلے تھے سوائے ایک کے جس کا کہنا تھا کہ اس نے رُخ بدلا تھا۔ جس میں 190 فٹ کا خاصا وسیع فاصلہ بکھرے ہوئے کارتوسوں سمیت کور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ملزموں نے یہ بیان دیا کہ انہوں نے گولیاں ہوا میں چلائی تھیں جبکہ قصوری کا بیان تھا کہ پہلے برسٹ نے اس کی کار کو ہٹ کیا تھا۔

انٹیلی جنس کی رپورٹوں میں سے ایک میں جو دراصل باجوہ کی تیار کردہ تھی، قصوری نے 28 نومبر 74ء کو خود یہ بتایا تھا کہ اُس کے قتل پر چار آدمی مامور کئے گئے تھے اور حملے کے بعد اُس کے کچھ دوستوں نے خول جمع کئے تھے۔ جنہیں وہ مناسب وقت پر پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن بعد میں نہ تو خالی کارتوسوں کی بابت کچھ سننے میں آیا نہ ہی قصوری نے اُن چار قاتلوں کا ذکر کیا۔

کئی دیگر تضادات میں سے ایک تھا کہ جو جیپ (ایل ای جے/7048) حملے میں استعمال کی گئی

www.bhutto.org

اس کی بابت لاگ بک ظاہر کرتی تھی کہ متعلقہ وقت پر وہ ایف ایس ایف کے ایک دوسرے افسر کے استعمال میں تھی چونکہ غلام حسین کا ڈرائیور ان پڑھ تھا۔ وہ لاگ بک میں اندراج نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے صرف غلام حسین کی شہادت پر انحصار کیا جاسکتا تھا کہ اُس نے وہ جیپ کب استعمال کی۔

غلام حسین کی طرح میاں عباس کی شہادت میں بھی کئی تضادات موجود تھے۔ اُس کے ٹریول اکاؤنٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وقوعہ کے وقت وہ پشاور میں تھا۔ اُس نے اپنی شہادت میں بتایا کہ وہ 12 نومبر کو چھ بجے شام بذریعہ ہوائی جہاز راولپنڈی پہنچ گیا تھا۔ غلام حسین کا کہنا تھا کہ خود وہ بھی 12 تاریخ کو لاہور سے اڑھائی بجے دن ـــــــ راولپنڈی پہنچا اور سیدھا میاں عباس کے پاس گیا جبکہ وہ یقیناً ایسا نہیں کر سکتا تھا اگر میاں عباس اس وقت پشاور میں موجود ہوتا صفائی نے ایسے کئی تضادات کی نشان دہی کی اس سے استغاثہ کا کیس بہت کم معقول نظر آنے لگا۔ شہادتوں اور گواہوں کو اس حد تک مشکوک و مشتبہ بنا دیا گیا تھا کہ بہت سے لوگ یہ یقین کرنے لگے تھے کہ اگر بھٹو کو بری نہ کیا گیا تو بھی بہرحال مقدمہ دوبارہ شروع کیا جائیگا۔ شاید ایک حد تک بڑھی ہوئی اس خود اعتمادی کی بناء پر ہی صفائی نے سزا کی تخفیف پر دلائل کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

سب سے آخر میں 41 ویں گواہ عبدالخالق کی شہادت پڑھی گئی اس کیس کی از سرِ نو تمام تحقیقات اس کے ماتحت افسروں نے براہ راست اس کی نگرانی میں کی تھیں اُسی نے تمام ملزموں کو حراست میں لیا تھا۔ اس کے ماتحت تفتیش کرنیوالوں میں سے ایک اسلم ساہی اے ایس آئی نے اپنے بیان میں کہا تھا "مجھے تحقیقات کیلئے جو احکام دیئے گئے میں نے ہمیشہ ان کی پیروی کی" یہ بیان مشکوک تشریح و تعبیر کا محل تھا۔ اُن پولیس افسروں کے بیانوں کی طرح جو کہتے تھے کہ انہوں نے سعید احمد اور باجوہ کی ہدایات کے مطابق تحقیقات کی تھی۔ قصوری کے علاوہ سب کے سب گواہ سرکاری ملازم تھے اکثر محکمہ پولیس سے تعلق رکھنے والے بھٹو کے حامیوں کے اس خیال میں بڑا وزن تھا جیسا کہ میاں عباس نے عدالت میں بتایا۔ ترغیبات نے مقدمہ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنی نوکریاں بچانے کیلئے وہ جھوٹے اور جعلی بیانات دینے پر ترغیب و تحریص کا شکار ہو گئے۔

اس بات کی توثیق اپیل کے آخری مرحلہ میں اس وقت ہوئی جب وکیل صفائی کے قبضہ میں خالق کا ایک خط آگیا۔ جس میں اس نے ریاض احمد نامی ایک شخص کی ایف آئی اے میں تقرری کی سفارش کی تھی۔ وہ شریک ملزم افتخار احمد کا بھائی تھا۔ خالق نے سفارشی خط میں لکھا تھا "ریاض کے باپ اور خود اس نے افتخار احمد کی اعترافی شہادت حاصل کرنے میں اہم کام دکھایا ہے۔ باپ نے بڑے اخلاص سے نہ صرف اپنے بیٹے سے اقبالی بیان دلایا بلکہ دوسرے ملزمان پر بھی اثر انداز ہوا"

اس خط کی روشنی میں ریاض احمد کی تقرری کنفرم کر دی گئی حالانکہ اس کی عمر مقررہ حد سے کہیں زیادہ تھی۔ جب شہادت کا یہ ٹکڑا خالق کے سامنے رکھا گیا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "ہاں

www.bhutto.org

لالچ اور ترغیبات سے کام لیا گیا تھا لیکن اس سے بھی بڑی ترغیبات کی پیشکش دوسری طرف سے کی گئی تھی" صفائی نے اس کی تردید میں کہا کہ ایسی کسی بات کا ثبوت نہیں ملتا۔ بہرحال صفائی کے نقطہ نظر سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ جو آدمی تحقیقات کا انچارج تھا اس نے ناجائز ذرائع استعمال کئے تھے۔

ابتداء میں یوں لگتا تھا جیسے جج بھٹو کی قسمت کا جلد فیصلہ کرنے والے ہیں لیکن 15 جون کو بے نظیر کی رہائی کے بعد ایک بار پھر اچانک التوا ہوا کیونکہ چیف جسٹس ایشین جیورسٹس کانفرنس میں شرکت کرنے دو ہفتے کیلئے بنکاک چلے گئے تھے۔ اسے لوگوں نے تاخیری حربہ سے تعبیر کیا۔ تین ہفتوں کے وقفہ نے اپیل کو موسم خزاں میں پہنچا دیا۔

اعتراف کرنے والے ملزموں کی شہادتیں اُردو میں تھیں۔ انہیں اعوان نے پڑھا۔ بھٹو نے جو بیان بند کمرے میں دیا تھا۔ سپریم کورٹ نے اسے کھلے اجلاس میں پڑھنے کی اجازت دیدی۔ اُس کے کچھ فقرے یوں تھے۔

"آپ اسے انصاف کہتے ہیں آپ اسے مقدمہ کہتے ہیں" وہ بڑی توجہ سے سنے گئے۔ ہال سامعین اور صحافیوں سے کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ بختیار نے اس متعصبانہ رویہ کی نشاندہی کی جس کے تحت بھٹو کے سامنے 67 سوال اس طرح تیار کر کے رکھے گئے تھے کہ بھٹو کیلئے ان کا جواب دینا مشکل تھا۔ "ہر جملے اور ہر سوال سے عناد ٹپکتا تھا" بختیار کے بقول ججوں نے بڑی توجہ سے اس بیان کو سنا۔ بعض اس پر حیران ہوئے کہ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس کی بناء پر مقدمہ کی سماعت بند کمرے اور خفیہ طریقہ سے کی جاتی۔ دریں اثناء میاں عباس نے پہلے اپنے بیان سے انحراف کیا پھر اسے واپس لے لیا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا یہ بھی ایک راز ہے۔ اپنے جس اعترافی بیان کو میاں عباس نے ستمبر 77ء میں یہ کہہ کر واپس لے لیا تھا کہ اس سے شدید دباؤ اور تشدد کے ذریعے اعتراف جرم کرایا گیا تھا۔ ہائیکورٹ نے اس کے بارے میں کوئی کارروائی نہیں کی۔ استغاثہ کے کیس کو اس طرح مدد ملی کہ میاں عباس کا وکیل عدالت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور کہا کہ وہ اپنے مؤکل کی طرف سے یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ اس کا مؤکل استغاثہ کے کیس کو صحیح سمجھتا ہے۔ اس کے بعد وہ بیٹھ گیا۔

پریس نے میاں عباس کے آخری بیان کو شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ اُسے ریڈیو اور ٹی وی سے بھی نشر کیا گیا۔ صفائی کیلئے اس میں تسکین کا یہ پہلو موجود تھا کہ جس شخص نے تین بار اپنا بیان بدلا اور کئی "قلابازیاں" کھائی ہوں اسے کسی طرح بھی لائق اعتماد نہیں سمجھا جا سکتا۔ میاں عباس کے وکیل نے نجی طور پر اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ اس کے موکل پر کم سے 9 جولائی تک شدید دباؤ ڈالا گیا تھا اور یہ بیان 10 جولائی کو عدالت میں پڑھا گیا تھا بھٹو کو یقین تھا کہ حکام نے شدید دباؤ ڈال کر اس کا بیان تبدیل کرایا ہے۔ وہ اب بھی اپیل میں مداخلت کر کے انصاف کی راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے۔ بختیار کے دلائل اگست میں اختتام کو پہنچ گئے۔

www.bhutto.org

استغاثہ کا کیس

استغاثہ کے فاضل وکیل نے جو تھوڑے تھوڑے گنجے ہو رہے تھے اور ان کی ناک طوطے کی طرح تھی 16 ستمبر کو اپنے دلائل کا آغاز کیا۔ اُسی روز ضیاء نے منصبِ صدارت کا حلف بھی اٹھایا۔ ضیاء کا منصب صدارت کو سنبھالنا بہت معنی خیز واقعہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر اپیل میں سزا کا فیصلہ برقرار رہتا ہے تو چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے وہ فردِ واحد ہو گا جو اس میں تبدیلی کر سکے گا۔ ایک ایسے شخص کو صدر کے عہدہ سے ہٹا دیا گیا جس کی تقرری بھٹو کے دور میں ہوئی تھی اور اس کی جگہ ایسے شخص نے لے لی جو اپنی تقرری آپ کر رہا تھا اور بھٹو کے ساتھ اُس کی دشمنی سب پر عیاں ہو چکی تھی۔

ابتداء میں خیال تھا کہ بٹالوی اپنا کیس دو ہفتے میں مکمل کر لیں گے لیکن جلد ہی نظر آنے لگا کہ وہ اسے طول دیں گے۔ اُنہوں نے اس پر دو ماہ لگائے جس سے اپیل مزید طوالت پکڑ گئی۔ اپنے افتتاحی بیان میں انہوں نے صفائی کے خلاف طنزیہ رویہ اختیار کیا۔ وہ بختیار کے مقابلہ میں مشاق اور بہتر مقرر تھے اس لئے انہوں نے اپنے دلائل بڑے زوردار لہجے اور انداز میں پیش کئے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ تین ہفتوں کی تعطیلات کے دوران اُنہوں نے شب و روز محنت کی تھی۔

عدالت میں حاضرین کی تعداد کم ہوتی چلی گئی لوگوں کو اس کے دلائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پولیس والے سفید کپڑوں میں استغاثہ کی طرف بیٹھے رہتے۔

بٹالوی نے استغاثہ کا کیس اُسی شدت اور انداز سے پیش کیا جس طرح ہائی کورٹ میں کیا تھا۔ قتل کے محرک کو قطعی اور واضح قرار دینے کیلئے اُس نے بتایا کہ قصوری نے اثبات اور شدت سے اصرار کیا تھا کہ ایف آئی آر میں بھٹو کا نام درج کیا جائے۔

"کیس یہ ہے کہ قصوری وزیر اعظم کی شہرت کیلئے ایک مستقل کانٹا بن گیا تھا ایک تیز کانٹا جو سوشلسٹ کی حیثیت سے بھٹو کی شہرت کو نقصان پہنچا رہا تھا" بٹالوی نے پر اعتماد لہجہ میں کہا وہ اس قسم کی سخت اور تلخ تقریریں کرتا تھا جن میں کہا جاتا "تم نے پاکستان کو تباہ کیا ہے" پھر ہٹلر کے ساتھ بھٹو کا موازنہ اپیل کنندہ کیلئے ناقابل برداشت بن گیا۔

ایک جج نے سوال کیا "قصوری کو خاموش کرنے میں کیا راز تھا؟" بٹالوی نے جواب دیا اس کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ قصوری کی زبان بند کی جائے۔ دوسرے یہ کہ اس سے دوسروں کو بھی سبق مل جائیگا۔ ججوں کے خیال میں یہ معقول وجہ نہیں تھی۔ جی صفدر شاہ نے لقمہ دیا "لوگوں کو کیسے پتہ چلتا کہ اسے کس بناء پر قتل کیا گیا ہے؟" اس کا جواب بٹالوی نے اندازے اور قیاس سے دیا "لوگوں کی چھٹی حس انہیں خبردار کر دیتی ہے" یہاں چیف جسٹس بھی کچھ شک کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انہوں نے کہا "اگر کیس کا انحصار محض ایک محرک پر ہے تو پھر سرے سے آپ کا کوئی کیس نہیں بنتا" بٹالوی نے اصرار سے کہا "سازش کے مقدمات میں محرک اور جواز کو لازماً زیر غور لایا جاتا ہے۔ اپیل کنندہ اپنے ذاتی امیج کے

www.bhutto.org

بارے میں بہت حساس تھا۔ صفدر شاہ نے رائے دی اپنے امیج کا خیال رکھنا کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔"

جہاں تک سازش کا تعلق تھا بٹالوی نے واضح کیا کہ 3 جون کے واقعہ کی حیثیت "آخری تنکے" کی تھی۔ بیانات اور شہادتوں میں جو تضاد اور عدم مطابقت پائی جاتی تھی۔ بٹالوی نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ سازش کی اصل تعریف و تعیین کے بارے میں بٹالوی نے بختیار کے اس نکتہ کو مسترد کرتے ہوئے کہ سرے سے کوئی سازش نہیں ہوئی تھی۔ اس بات پر زور دیا کہ سازش کا منصوبہ وجود رکھتا تھا کیونکہ چاروں شریک ملزمان نے اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ افسران بالا کے دباؤ کا نتیجہ ہے بٹالوی نے ہائی کورٹ میں دیئے گئے دلائل پر انحصار کرتے ہوئے اصرار کیا کہ سازش کا معاہدہ ایک ہی وقت میں مکمل نہیں ہو گیا تھا بلکہ مختلف مراحل میں تکمیل کو پہنچا۔

فاضل وکیل سرکار نے بڑی شدومد سے صفائی کے اس استدلال سے عدم اتفاق کیا کہ وعدہ معاف گواہ کی شہادت کا دوہرے ٹیسٹ پر پورا اترنا ضروری ہوتا ہے۔ انہوں نے وعدہ معاف گواہوں کو قابل اعتماد قرار دیا اور کہا کہ ان کی گواہی کی تائید موجود ہے۔ اس کے کردار کو مستحکم قرار دیتے ہوئے انہوں نے زور دیکر کہا "اس سے بھی بدتر گواہوں کی شہادتوں پر یقین کیا گیا ہے۔" صفدر شدہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "اگر جج سارے جھوٹ نگل جائیں تو اس کا مطلب ہے وہ اپنا کام نہیں جانتے۔" بٹالوی کسی صورت میں ججوں کو اشتعال نہیں دلانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہے جسے وہ کوئی نکتہ بنا کر پیش کرنا چاہتے ہوں۔"

سعید احمد کے بارے میں استغاثہ نے موقف اختیار کیا کہ وہ ایک "بے قصور ایجنٹ" تھا۔ اس طرح وہ قاتلوں کیلئے ایک ڈھال بن گیا تھا۔ وہ کسی طرح بھی جرم میں شریک نہیں تھا بلکہ آزاد و خود مختار گواہ تھا۔ اس لئے مسعود کی تائید کر سکتا تھا۔ بھٹو سے قریبی رابطہ کی بناء پر وہی تمام تحقیقات کو کنٹرول کر رہا تھا اور وہ براہ راست وزیر اعظم کے احکام و ہدایات کے تحت کام کر رہا تھا دوسرے تینوں ملزم بھٹو کے بغیر ایسی سازش تیار نہیں کر سکتے تھے ان کے دلوں میں فضویٰ کے خلاف کوئی عناد نہیں تھا۔ سعید احمد نے تحقیقات کو بھٹو کو بچانے کی غرض سے کنٹرول کیا۔ باقی ملزموں کے ساتھ اس کا کوئی اشتراک و رابطہ نہیں تھا۔ وزیر اعظم نے تحقیقات میں جو غیر معمولی دلچسپی لی۔ بٹالوی نے اس کی نشان دہی بھی کی۔ سعید احمد بیچ کے آدمی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اسی نے تحقیقات کو ایف ایس ایف کی طرف جانے سے روکا۔

بٹالوی نے بھٹو کو کیس میں ملوث کرنے کیلئے دلیل دی کہ سعید احمد یا ایف ایس ایف کے مابین کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر وہ ایف ایس ایف کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا تو اس کا اصل مقصد کسی اور کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ سعید احمد اور ایف ایس ایف کے درمیان واحد رابطہ بھٹو ہی تھا۔

استغاثہ کے کیس میں یہ نکتہ بڑا اہم تھا کہ قتل کی تفتیش مناسب طریقے سے نہیں ہوئی۔ پھر شفیع

www.bhutto.org

الرحمٰن ٹریبونل میں صرف پسندیدہ مواد پیش کیا گیا۔ یہ کردار بھی سعید احمد نے انجام دیا تھا تاکہ بھٹو کو بچایا جاسکے۔ چلے ہوئے کارتوس 62ء7 ایم ایم کیلیبر کے تھے اور ماہرِ اسلحہ نے یہی رپورٹ دی تھی۔ سپریم کورٹ میں شفیع الرحمٰن رپورٹ کو ماہرِ اسلحہ کے حوالہ سے ریکارڈ پر لایا گیا۔ بٹالوی نے اس کے اخذ کردہ نتائج کا خلاصہ پیش کیا۔

اولاً..... حملہ قصوری پر کیا گیا تھا۔ غلطی سے اُس کا باپ مارا گیا۔

ثانیاً..... واردات میں استعمال ہونے والے ایمونیشن کی شناخت کی گئی تین ماہ پہلے اسلام آباد کے وقوعہ میں بھی ویسا ہی اسلحہ استعمال کیا گیا تھا۔

ثالثاً..... واردات کی وجہ سیاسی تھی۔

رابعاً..... حملہ آور منظم اور خوب مسلح تھے۔ وہ وسائل رکھنے والے اور قصوری کی زندگی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ بٹالوی نے شکایت کی کہ اس رپورٹ کو شائع نہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بھٹو کچھ چھپانا چاہتے تھے حالانکہ رپورٹ میں انہیں ملوث نہیں کیا گیا تھا حتیٰ کہ اس کے پیرا نمبر 15 میں ان چار گروپوں کا ذکر موجود تھا جو قصوری کو ممکنہ طور پر قتل کر سکتے تھے۔ ایف ایس ایف کے خلاف سرے سے تحقیقات نہیں کی گئی حالانکہ واردات میں استعمال ہونے والا اسلحہ اس کے زیرِ استعمال بھی تھا۔

استغاثہ کیلئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ خول اُن گنوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے تھے جو استعمال کی گئی تھیں اس کا حل بٹالوی نے یہ پیش کیا کہ جس وقت خول جمع کئے گئے انہیں اسی وقت سربمہر نہیں کیا گیا اس لئے ان کی اصل حیثیت مشکوک ہوگئی پس وہ تبدیل کر دیئے گئے تھے۔

"میں پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ ان کے تبدیل کئے جانے کا یقینی ثبوت موجود ہے تاہم بیک وقت بہت سے گواہوں نے شہادت دی ہے کہ ان میں ردوبدل کیا گیا تھا اس لئے ان کی اصلیت مشکوک ٹھہرتی ہے"۔ انہوں نے بڑے وثوق سے کہا۔ "قوی امکان پایا جاتا ہے کہ خول تبدیل کئے گئے تھے"۔ استغاثہ کے کیس میں ایک کھلا تضاد موجود تھا۔ بعض ججوں نے اسے تسلیم بھی کیا۔ اسی تضاد کو بنیاد بنا کر صفائی نے استغاثہ کی خامیوں کی نشاندہی کی تھی۔

غلام حسین کی شہادت کو ناقابلِ اعتبار ثابت کرنے کیلئے بختیار نے نو چارٹ پیش کئے تھے۔ استغاثہ نے جواب میں چار چارٹ پیش کئے صفائی کا دعویٰ تھا کہ غلام حسین کا ٹی اے بل جعلی تھا۔ بٹالوی نے اسے تسلیم کرتے ہوئے وضاحت پیش کی۔ ایسا جان بوجھ کر کیا گیا تھا کہ متعلقہ وقت پر اس کی لاہور میں موجودگی کو چھپایا جاسکے۔ استغاثہ نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ جیپ کی لاگ بک کے اندراجات کو اس نے قبول نہیں کیا تھا جس نے خود درج کئے تھے' نہ ہی کسی ایسے شخص نے جو سوادِ تحریر کی شناخت کر سکتا ہو۔ اسلئے انہیں بطور شہادت و ثبوت قبول کیا جاسکتا۔

استغاثہ کے مطابق دیگر تمام گواہوں کی شہادتیں بھی درست تھیں یہ حقیقت کہ بہت سے گواہوں کو

www.bhutto.org

واقعہ کی تفصیلات یاد نہیں رہی تھیں اور انہوں نے غلط تاریخیں بتائیں تھیں، کوئی نتیجہ خیز بات نہیں تھی۔ نہ ہی یہ بات درست ہے کہ ان پر تشدد کیا گیا

تعصب کے موضوع پر بات کرتے ہوئے بٹالوی نے کہا چیف جسٹس کے خلاف اپیل کنندہ کے ریمارکس الزامات زہر بھری نفرت پر مبنی اور قطعاً بے بنیاد تھے۔ جو الزام لگائے گئے اور ان کی تشہیر کی گئی ان سے زیادہ رسوا کن اور پست الزام نہیں ہو سکتے تھے۔ ملزم کے ذہن کو بنچ کے خلاف تعصب کے زہر سے بھرا گیا جس کا اظہار اُس نے بار بار کیا۔

تعصب اور عناد کی بابت بٹالوی نے خود بھٹو کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ بھٹو نے بنچ پر جو عدم اطمینان ظاہر کیا تھا۔ اس کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ دنیا میں کسی شخص کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ اپنے لئے ٹریبونل کا خود چناؤ کر سکے" (حالانکہ بھٹو نے صرف انتقالِ مقدمہ کی درخواست دی تھی ججوں کا انتخاب کرنے کی اجازت نہیں مانگی تھی) بھٹو کیلئے بنائے گئے کٹہرا کا بٹالوی نے یہ جواز پیش کیا کہ ملزم کو کھلا چھوڑ دیا جاتا تو وہ غیر ملکی نامہ نگاروں کو انٹرویو دیتا رہتا، جیسا کہ وہ ایک دو بار کر چکا تھا۔

چیف جسٹس نے اس الزام کو بہت سنگین قرار دیا کہ ریکارڈ میں جوڑ توڑ کی گئی تھی " یہ جوڑ توڑ کون کر رہا تھا؟" انہوں نے پوچھا بٹالوی نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے استفسارات شروع کر دیئے "اگر ہم یہ قبول کر لیتے کہ عدلیہ مشکوک و مشتبہ ہے، تو ہم کہاں کھڑے ہوتے؟" کیا ٹرائل بنچ کے پانچوں ججوں کے خلاف ملزم کے الفاظ کو قبول کر لیا جائے؟ انہوں نے خود ہی جواب دیا "ہمیں ہر طرح سے عدلیہ کے ادارہ کا تحفظ کرنا ہو گا۔ اگر ایسے الزامات لگانے کی اجازت دیں گے تو پھر جنگل کا قانون رائج ہو جائے گا"۔ بھٹو کو ہمیشہ سے عدلیہ پر اعتماد نہیں تھا اور وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ چیف جسٹس کی میعادِ ملازمت میں جو ترامیم کی گئیں اس سے اس کا ثبوت ملتا ہے انہوں نے پہلے ہی عدلیہ کو مشکوک اور داغ دار کر دیا تھا تاکہ بعد میں کہہ سکیں۔ "میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے انصاف نہیں ملے گا" انتظامیہ کے خلاف الزامات بھی سب بے بنیاد ہیں" بٹالوی نے اصرار کے ساتھ کہا۔ ضیاء کے یہ کہنے کے باوجود کہ بھٹو قاتل ہے بینچ نے اپنا وقار ملحوظ رکھا اور اس پر کوئی متعصبانہ اثر نہیں ہوا۔ جو مواد ریکارڈ پر نہیں تھا۔ اس سے قطعاً کوئی اثر قبول نہیں کیا گیا۔

کئی ہفتوں پر پھیلے ہوئے اپنے دلائل کے ذریعے بٹالوی نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ اپیل کنندگان کو دی گئی سزائیں درست ہیں اور اُن کی اپیلیں خارج کر دی جائیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے قانون کی کتابوں سے بہت کچھ پڑھ کر سنایا اور بھارتی و پاکستانی عدالتوں کے بہت سے فیصلوں کے حوالے دیئے۔

بٹالوی نے استغاثہ کے کیس کو ترتیب و تفصیل سے حقائق اور میرٹس پر دہرایا۔ جسٹس صفدر شاہ بطور خاص ان کے بعض دلائل پر حیرت و تعجب کا اظہار کرتے رہے، دوسرے ججوں نے بھی واضح طور پر اپنی ناپسندیدگی کے اشارے دیئے۔ فاضل وکیل استغاثہ نے اپنے دلائل کا اختتام یہ کہتے ہوئے کیا کہ جو فیصلہ

www.bhutto.org

دیا جاچکا ہے۔ یہی فیصلہ ہے جسے عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ "ہر کوئی قانون کے سامنے مساوی ہے۔" اُنہوں نے وسط نومبر میں عید کی چھٹیوں سے پہلے اپنے دلائل ختم کر لئے۔

صفائی نے یہ یقین کر کے مزید اعتماد محسوس کیا کہ بٹالوی استغاثہ کے مقدمہ کو ثابت نہیں کر سکے۔ انہوں نے مقدمہ میں کوئی خاص نقص نمایاں نہیں کی اور جو معروضات پیش کیں' وہ ہر لحاظ سے ناقابل قبول تھیں۔ استغاثہ کے کیس کا انحصار سنی سنائی شہادتوں پر تھا۔ اس میں تضادات پائے جاتے تھے۔ وہ بھٹو کو شک وشبہ کے بغیر مجرم ثابت نہیں کر سکے تھے۔ بہت کم لوگ یقین رکھتے تھے کہ استغاثہ کی کہانی کو مشکوک بنا دیا گیا ہے اس لئے اب بھٹو کو دوبارہ سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

صفائی کا حق جواب

عید کی تعطیلات میں مزید اضافہ اس طرح ہوا کہ ضیاء بیرون ملک دورے پر چلے گئے اور انوار الحق ایک بار پھر اُن کے قائم مقام بن گئے۔ بھٹو نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے چیف جسٹس کو خط لکھا کہ انتظامیہ اور عدلیہ کو یکجا کرنا قرینِ انصاف نہیں۔ اب محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اپیل کرسمس کی تعطیلات کے بعد مکمل ہو گی۔ یوں صفائی کو اپنا جواب پیش کرنے کا موقع مل جائیگا۔ اُس کے بعد فیصلہ لکھا جائیگا۔

عید کی تعطیلات کے بعد عدالت کا اجلاس شروع ہوا تو بختیار پوڈیم پر پھر نمودار ہوئے۔ اس دفعہ سامعین میں نصرت بھٹو بھی شامل تھیں۔ جو 11 ماہ کے بعد رہا ہوئی تھیں۔ اچانک جسٹس وحید الدین بیمار ہو گئے۔ عدالت کی کارروائی چند دنوں کیلئے ملتوی کر دی گئی۔ اُن کی علالت نے نازک اور تشویشناک صورت اختیار کر لی۔ کراچی' لاہور اور راولپنڈی کے ڈاکٹروں پر مشتمل ایک بورڈ نے اُن کا معائنہ کرنے کے بعد رپورٹ دی جس کی روشنی میں اُن کی صحت یابی کا انتظار کئے بغیر سماعت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جسٹس وحید الدین نے بسترِ علالت سے خط لکھا کہ وہ صحت یابی کے بعد سماعت میں شرکت کرنا پسند کریں گے لیکن ججوں نے ان کی واپسی کا انتظار نہ کرنے کو ترجیح دی۔ بختیار نے چیف جسٹس کے اس فیصلہ پر شدید نکتہ چینی کی اور کہا کہ یہ اقدام فاضل جج کو بینچ سے ہٹائے جانے کے مترادف ہے۔ ان کی واپسی کا لازماً انتظار کیا جائے مگر انوار الحق نے ان کی کوئی بات نہ سُنی۔ یوں قیصر خان کی ریٹائرمنٹ کے بعد ایک اور جج کے نکل جانے سے بینچ سات ججوں کا رہ گیا۔ فریقین اس بات سے باخبر تھے کہ وحید الدین کے چلے جانے سے ووٹنگ کا توازن بگڑ جائیگا۔ بھٹو کے حامیوں کو یقین ہو گیا کہ ابتداء میں انہیں چار کے مقابلے میں پانچ کی جو اکثریت حاصل تھی اب باقی نہیں رہے گی بلکہ اب چار کے مقابلہ میں ان کے تین ووٹ رہ گئے ہیں۔ اُس وقت یہ سب باتیں اندازوں پر مبنی تھیں اور لوگوں کے حوصلے شدت سے پست ہونے لگے۔ کاش اپیل کی سماعت پہلے مکمل ہو جاتی۔ وحید الدین کے بینچ سے نکل جانے کو بھٹو نے بھی بُری طرح محسوس کیا۔ انہوں نے درخواست دی کہ اُنہیں اپنی صفائی میں بولنے کا موقع دیا جائے۔ ایک دوسرے خط میں انہوں نے چیف

www.bhutto.org

جسٹس پر پوری قوت سے عدم اطمینان کا اظہار کیا۔

اس دوران بھٹو کے وکلائے صفائی شدید کشیدگی اور دباؤ کا شکار رہے۔ بختیار نے بے دلی سے اپنے دلائل پیش کئے۔ جج حضرات بیزار ہو رہے تھے۔ وہ ہر روز بختیار سے پوچھتے تھے کہ وہ کتنا وقت اور لیں گے۔ اپنی محنت اور مستعدی کے باعث بختیار کسی حد تک اختتامی دلائل ختم کرنے میں تیز رفتار ہو گئے۔ بختیار نے اپنی بحث میں اس بات پر زور دیا کہ اُن کے موکل کا جرم ثابت نہیں کیا جا سکا۔ اس لئے استغاثہ کا کیس خارج کیا جائے۔ بختیار نے اپنی اختتامی تقریر 17 دسمبر کو کی۔ اس سے پہلے 16 دسمبر کو اعلان کیا گیا کہ بھٹو 18 دسمبر کو چائے کے وقفہ کے بعد عدالت سے خطاب کریں گے۔ بختیار نے اپنے مباحث کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا۔

"یہ ایک جھوٹا اور گھڑا گھڑایا کیس ہے۔ جس کا مقصد قوم کے سب سے مقبول رہنماء کا صفایا کرنا ہے۔ استغاثہ مسٹر بھٹو کو ختم کرنے کی سفاکانہ کوشش میں ناکام ہو چکا ہے اور یہ سازش پوری دنیا پر عیاں ہو گئی ہے"۔ اُنہوں نے آخر میں کہا

"یہ ایک اہم ترین فیصلہ ہے جو ہر لارڈ شپس صادر کرنے والے ہیں" اس پر ایک جج نے کہا

"غالباً ہماری زندگیوں کا"

اپیل کی سماعت میں کل 104 دن لگے۔ یحییٰ بختیار نے اپنے دلائل پیش کرنے میں 57 دن لگائے۔ بٹالوی نے 38 دن اور جوابی دلائل میں صرف 9 دن صرف ہوئے۔ اپیلوں کی باقاعدہ سماعت 20 مئی سے شروع ہوئی تھی۔

www.bhutto.org

نواں باب

بھٹو کی سپریم کورٹ میں حاضری اور آخری بیان

اپیل کے شروع نیز دلائل کے اختتام پر بھٹو کی طرف سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ انہیں ضابطۂ فوجداری کی دفعہ 342 کے تحت عدالت میں مکمل بیان دینے کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ ٹرائل بنچ نے اس کی اجازت نہیں دی تھی۔

بعد ازاں پیلانٹ نے ایک تحریری درخواست بھی پیش کی کہ اسے مقدمہ کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کیلئے اصالتاً پیش ہونے کی اجازت دی جائے۔ اُن کی یہ استدعا منظور کر لی گئی۔ چنانچہ 18 سے 21 دسمبر (1978ء) تک وہ مختصر طور پر عدالت میں پیش ہوئے اور خطاب کیا۔

سپریم کورٹ میں سابق وزیر اعظم کی آمد نے ایک سنسنی پیدا کر دی۔ جب وہ اپنے وکیل کے ساتھ عدالت کے کھچا کھچ بھرے ہوئے اور ہلکی آوازوں سے گونجتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے تو یکدم خاموشی چھا گئی۔ اُن کے وفادار اور حامی اُن کے احترام کیلئے کھڑے ہو گئے۔ لوگ صبح سات بجے سے عدالت میں داخل ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ جن لوگوں کو نشستیں نہیں ملیں وہ ایزلز پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ بہت سے طویل انتظار کے باوجود اندر نہیں جا سکے۔ کیونکہ کچھ نشستوں پر انٹیلی جنس والوں نے پہلے ہی قبضہ کر لیا تھا۔ ججوں کے رشتہ داروں کو ترجیحی بنیادوں پر داخلہ پاس جاری کئے گئے تھے جس پر بہت سے لوگ باہر کھڑے طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

بھٹو 9 ماہ کی قید تنہائی کے بعد پہلی بار موت کی کوٹھڑی سے نکل کر دنیا دیکھنے آئے تھے۔ وہ اب بھی ایک بھرپور اور شاندار شخصیت کے حامل لگ رہے تھے۔ انہوں نے خوبصورت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔

www.bhutto.org

ان کا لباس اُن کے جسم پر لٹک رہا تھا جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ خاصے کمزور ہو گئے ہیں بلاشبہ ان کا وزن چالیس پاؤنڈ کم ہو گیا تھا۔ چائے کے وقفہ کے بعد جج صاحبان ہال میں داخل ہوئے تو ہر شخص ان کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چیف جسٹس نے بھٹو پر لمبی نگاہ ڈالی اور مزید تاخیر کے بغیر ان سے کہا کہ خطاب کا آغاز کریں۔ بھٹو اپنی سیٹ سے اٹھے ہلکے سے لرزے، پوڈیم پر آئے اور پوری روانی سے بولنا شروع کر دیا۔

اپنے چار روزہ مفصّل خطاب میں جو قریباً بارہ گھنٹوں پر محیط تھا، بھٹو نے اپنی صفائی پیش کرنے کے علاوہ

بہت سے موضوعات پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے جس انداز میں اپنی صفائی پیش کی وہ اپنی جگہ جاہ و عظمت کا مظہر تھا۔ بھٹو کا یہ آخری بیان اُن کے خلاف چلائے گئے مقدمہ اور اس کے فیصلہ کو سمجھنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ بیان تاریخی اہمیت کی دستاویز ہے اور اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ یہ بھٹو کے آخری الفاظ ہیں جو عدالت کی وساطت سے لوگوں تک پہنچے۔ ہم یہاں اس یادگار خطاب سے اہم اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

عدالت کا شکریہ

"مائی لارڈز" میں جانتا ہوں کہ عدالت کے آداب و اخلاقیات کی رُو سے میرے لئے یہ ضروری نہیں کہ میں اس معزز عدالت کا شکریہ ادا کروں کہ مجھے یہاں پیش ہونے اور اپنا ما فی الضمیر بیان کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، تاہم ملک کے معاشرتی حالات اور جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق میں آپ کا بیحد شکر گزار ہوں کہ مجھے یہ موقع فراہم کیا گیا ہے۔

پاکستان کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے

یور لارڈ شپس کے نام اپنی 4 دسمبر کی درخواست میں، میں نے استدعا کی تھی کہ میں اس معزز عدالت کے سامنے پیش ہونا چاہتا ہوں۔ اس مقدمہ میں میرے نقطۂ نظر سے نہ صرف میری زندگی، انفرادی زندگی کی حیثیت سے ملوث ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ معروضی حالات بھی داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ میری شہرت، میرے خاندان کا وقار، میرا سیاسی مستقبل اور ان سب سے بڑھ کر پاکستان کا مستقبل بھی داؤ پر لگا ہوا ہے۔ یہ نقطۂ نظر غلط بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ ایک مخلصانہ اور دیانتدارانہ نقطۂ نگاہ ہے۔ میں اسے ڈرامائی صورت دینا چاہتا ہوں نہ کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام لینا چاہتا ہوں۔

اپنی حالتِ زار کا تذکرہ

میں یور لارڈ شپس کو قطعی انداز میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اُن نکات پر بات نہیں کروں گا جو اس سے پہلے زیرِ بحث آ چکے ہیں۔ اگر میں کہیں بھٹک جاؤں تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ میں اُن تمام امور اور

www.bhutto.org

باتوں سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ جو اس عدالت میں کہی جا چکی ہیں۔ میں ایک سال سے زیادہ عرصہ سے موت کی کوٹھڑی میں بند ہوں۔ جس کا رقبہ 7 × 10 فٹ ہے۔ میں غیر ملکی افراد کے سامنے اس حقیقت کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو مجھ پر بیت چکی ہے۔ میں اپنے جسم پر نشانات یا ایسی چیزیں ان لوگوں کے سامنے دکھانا پسند نہیں کروں گا۔ تاہم میں اپنی اُن مجبوریوں اور جبر کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جس کا نشانہ مجھے اپنی کوٹھڑی میں بننا پڑا۔

جیل میں مجھے سونے نہیں دیا جاتا تھا۔ پچاس پاگل قیدیوں کو میری کوٹھڑی سے ملحق بیرک میں رکھا گیا تھا جو رات بھر شور مچاتے رہتے۔ راولپنڈی میں مجھے پریشان کرنے کے لئے یہ ترکیب نکالی گئی کہ میری کوٹھڑی کی چھت پر پتھر پھینکے جاتے تھے تاکہ شور ہوتا رہے اور میں سو نہ سکوں۔ اس طرح مجھے بے پناہ ذہنی و جسمانی اذیت پہنچائی گئی۔

اپنے ساتھ "پلازما 66" (جیل کی کوٹھڑی) میں روا رکھی گئی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ جذبات سے مغلوب ہو گئے۔ آنسو ان کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔ اگرچہ رخساروں تک نہیں پہنچے۔ آنسوں نے عدالت کو بتایا۔

"میں کوئی بے بنیاد اور بے جڑ مظہر نہیں ہوں۔ میں نے ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس کی خدمت کی ہے۔ میرے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیا گیا' حالانکہ میں مجرم نہیں ہوں۔ پندرہ اکتوبر سے مجھے موت کی کوٹھڑی میں مقفل کر دیا گیا۔ اور دس روز تک اسی حالت میں رکھا گیا کیونکہ جیل سے دو قیدی فرار ہو گئے تھے بھلا اُن کے فرار ہونے سے میرا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ میں اپنے ملک سے بھاگ نہیں رہا' میں اپنی جڑوں سے' اپنی سرزمین سے تعلق نہیں توڑ رہا۔ میں ایسا کیوں کروں گا۔ میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ سراسر بدنیتی پر مبنی ہے۔ صرف ایک بیمار ذہنیت والی قابل نفرت حکومت ہی ایسا برتاؤ کر سکتی ہے۔ بائیکورٹ میں مجھے عادی جھوٹا کہا گیا وہ جھوٹ کہاں ہیں جو میں نے بولے' مجھے تو عدالت میں بولنے اگر آج چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا نام کسی مقدمۂ قتل میں ملوث کیا جائے تو پہلا ردِ عمل یہ ہو گا کہ ماتحت افسران اسے درج نہیں کریں گے وہ اپنے سینئر افسران سے لازماً مشورہ کریں گے اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ مجھے براہ راست ملوث نہیں کیا گیا یہ ایک جعلی مقدمہ ہے۔ میرے خلاف مکمل سازش تیار کی گئی ہے۔ استغاثہ اپنا کیس شک و شبہ سے بالاتر ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ اگر اس مقدمہ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ اگر کسی وجہ سے سراغ نہیں لگایا جا سکا تو اس بناء پر مجھے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ آخر دوسروں کی غلطیوں اور غفلتوں کا ذمہ دار مجھے کیوں ٹھہرایا جائے۔ موجودہ حکومت کے 18 مہینوں میں کئی مقدموں کا سراغ نہیں مل سکا۔ سراغ نہ ملنے والا یہ پہلا کیس نہیں ہے۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کو یہیں راولپنڈی میں دن دیہاڑے گولی مار کر شہید کر دیا گیا اس کیس کا آج تک پتہ نہیں چلا۔ میرے کئی اور مخالف اور نکتہ چین موجود تھے۔ اصغر خان تھے' ولی خان تھے اور راؤ خورشید تھے۔ میں ان سے خوفزدہ نہیں ہوا۔ میں نے ان کو کچھ نہیں کہا تو بھلا قصوری کے پیچھے ایف ایس ایف کیوں لگاتا۔ میری لڑائی بڑے لوگوں اور اہم مسائل سے تھی میں اس آدمی کو قتل

www.bhutto.org

کرنے یا کروانے کا کوئی محرک نہیں رکھتا تھا۔ جب قصوری سے پوچھا گیا کہ تم نے مسٹر بھٹو کو ایف آئی آر میں کیسے پھنسایا تو اُس نے جواب دیا "یہ میرا سٹائل ہے"۔

مجھ پر اکثر یہ الزام لگایا گیا کہ میں نے ٹرائل جج کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ یہ بالکل غلط ہے میری زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی مجھ میں اتنا شعور یقیناً تھا کہ عدالت کے ساتھ تعاون کرتا اور شائستہ طریقے سے پیش آتا۔ لیکن جج چاہتا تھا کہ میں اُن کے سامنے گڑگڑاؤں اور جھکوں 'جج خصوصاً چیف جسٹس ہمیشہ غرور سے میری تذلیل و توہین کرتے تھے جبکہ دیگر شریک ملزمان پر وہ مہربان تھے۔ وہ اُن کیلئے مسکراتے تھے' جب وہ سمجھتے کہ ملزم انگریزی میں بات نہیں سمجھ رہے تو اس کا اردو بلکہ پنجابی میں ترجمہ کر دیتے تھے۔ ڈانٹ ڈپٹ 'جھڑکیں اور گھرکیاں صرف میرے لئے تھیں مجھے اکثر "شٹ اپ' سٹ ڈاؤن' کھڑے ہو جاؤ' اس آدمی کو باہر نکال دو" جیسے الفاظ سے نوازا جاتا تھا۔ ان حالات میں کسی سے تعاون کا مطالبہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی سے ولی کی قوتِ برداشت و تحمل کی توقع کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے ساتھ بہت ہی بُرا رویہ اختیار کیا گیا۔ میں مجرم نہیں ہوں لیکن میرے ساتھ مجرموں سے بدتر سلوک روا رکھا گیا۔ نوے دنوں تک میں نے دھوپ دیکھی نہ روشنی۔ مائی لارڈ' میں رحم کا نہیں' انصاف کا طلب گار ہوں۔ میرے لئے راتوں رات ایک کٹہرا بنوایا گیا حالانکہ اس سے قبل انگریزی دور میں بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ نواب آف کالاباغ کے بیٹے پر اسی ہائیکورٹ میں قتل کا مقدمہ چلا لیکن اس کے لئے کوئی کٹہرا نہیں بنوایا گیا تھا۔ نورمبرگ میں جرمن جرنیلوں کے ساتھ بھی مجھ سے بہتر سلوک کیا گیا تھا۔ عدالت میں انہیں عمدہ نشستوں پر وقار سے بٹھایا جاتا تھا۔ ان کیلئے کٹہرے نہیں بنائے گئے تھے۔ میں بیمار ہوا تو علاج کیلئے عدالت سے اجازت لینے کو کہا گیا میں نے عدالت سے درخواست کی تو اُسے نامنظور کر دیا گیا۔

میں نام کا مسلمان نہیں ہوں

ہائیکورٹ میں میری ہر طرح کردار کشی کی گئی۔ مجھے بڑا ملزم کہا گیا عادی جھوٹا کہا گیا اور محض نام کا مسلمان قرار دیا گیا۔ جس کا کردار مسلمانوں جیسا نہیں۔ مائی لارڈز خوب جانتے ہیں کہ میں محض نام کا مسلمان نہیں ہوں' میرے دورِ حکومت میں ختمِ نبوت کا 90 سالہ پرانا مسئلہ حل کیا گیا۔ مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔ لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پاسبان حرم شاہ فیصل شہید کی تجویز پر دنیائے اسلام کے نمائندوں نے مجھے کانفرنس کا چیئرمین منتخب کیا۔ یہ اعزاز آج بھی مجھے حاصل ہے۔ ریڈ کریسنٹ کا نام بدل کر ہلال احمر رکھا گیا۔ جوئے' شراب اور ریس پر پابندی لگائی گئی۔ یہ اقدامات کیا ظاہر کرتے ہیں۔ کیا میں محض نام کا مسلمان ہوں یا میں نے مسلمانوں کی اپنی عوام کی اور دنیائے اسلام کے انسانوں کی خدمت کی ہے؟ میں ہرگز بڑا ملزم نہیں ہوں۔ بڑے ملزم وہ ہیں جنہوں نے فائرنگ میں عملاً حصہ لیا۔ یہ محض عدالت کا ذہنی عناد ہے۔ میرے مذہبی عقیدہ کی جو توہین کی گئی ہے وہ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ انہوں نے چیف جسٹس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "مائی لارڈ آپ میری جگہ نہیں ہیں۔

www.bhutto.org

آپ نہیں جانتے کہ عدالت کے ان ریمارکس نے مجھے کتنا دکھ پہنچایا ہے۔ ایسی توہین سے تو کہیں بہتر ہوتا مجھے پھانسی دے دی جاتی یا کسی فوجی ٹریبونل کے ذریعے ختم کر دیا جاتا۔ 1970ء کے انتخابات میں مسلمانوں نے مجھے ووٹوں سے اپنا رہنما منتخب کیا تھا۔ ہائیکورٹ نے یہ قرار دے کر مسلمانوں کی توہین کی ہے کہ میں ان کی قیادت کا اہل نہیں تھا۔

ایف ایس ایف اپوزیشن کو کچلنے اور سیاسی حریفوں کو ختم کرنے کی غرض سے نہیں بنائی گئی تھی ایسی فورس ہر وفاقی ملک میں ہوتی ہے۔ یہ وفاقی فورس اسمبلی میں قانون سازی کے ذریعے وجود میں آئی تھی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی جرائم ہوتے ہیں لیکن ہر جرم کیلئے چیف ایگزیکٹو کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاتا۔ اگر میں بڑا ملزم تھا تو میری حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد سب سے پہلے مجھ سے پوچھ گچھ کرنا لازمی تھا۔ لیکن جہاں دوسرے ملزموں سے پوچھ گچھ کی گئی وہاں مجھ سے کچھ نہیں پوچھا گیا۔ بس گرفتار کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ گواہوں پر شدید دباؤ ڈالا گیا' استغاثہ نے میرے خلاف بہت سارے گواہ

کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔

اس موقع پر انہوں نے اختصار سے ہائیکورٹ کی کارروائی کا ذکر کیا۔ خفیہ اور بند کمرے میں سماعت کے دوران چیف جسٹس نے جو ریمارکس پاس کئے اُن میں علاقائی عناد تھا۔ اگر میں اُن کا انکشاف کروں تو عوام پر اس کے تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔ (جب وزیر قانون اے کے بروہی کے بارے میں بھٹو نے کہا کہ وہ چیف جسٹس کے دوست ہیں' تو انوار الحق نے فوراً کہا "وہ میرے دوست کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ان کا تعلق پنجاب سے نہیں' وہ تو سندھ کے رہنے والے ہیں) اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ججوں کی سوچ پر علاقائی اثرات کتنے گہرے تھے۔

میں نے اداروں کی تعمیر کی ہے

مجھ پر الزام لگایا جاتا ہے کہ میں اداروں کو تباہ کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں بدنام کرنے پر تلا ہوا ہوں۔ میں ایسا کیوں کروں گا۔ ملک میں چند ہی تو ادارے رہ گئے ہیں۔ میں نے اداروں کی تعمیر میں حصہ لیا ہے ان اداروں کے ساتھ میرا گہرا تعلق رہا ہے۔ میں یہ گستاخی کرنے کی جسارت نہیں کروں گا کیونکہ میں 1973ء کے دستور کا خالق ہوں۔ تاہم جس طرح 1956ء کے دستور کو محمد علی کا دستور اور 1962ء کے آئین کو محمد ایوب خان کا دستور کہا جاتا ہے اسی طرح اگر 1973ء کے آئین کو ذوالفقار بھٹو کا آئین کہہ کر پکارا جائے تو اس میں حرج کی کون سی بات ہے۔

نصرت بھٹو کیس کے فیصلہ پر تبصرہ

"یور لارڈشپس! میں آپ کے سامنے اکتوبر 1977ء میں بھی پیش ہوا تھا جب بیگم نصرت بھٹو کی آئینی درخواست عدالت کے زیر غور تھی۔ جس وقت اُس کیس کا فیصلہ سنایا گیا میں کوٹ لکھپت جیل میں

www.bhutto.org

قید تھا۔ میں نے اُسے ایک مثبت فیصلہ قرار دیا۔ تاہم میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس میں دو باتیں مزید شامل کر دی جاتیں تو وہ ایک قیمتی اضافہ ہوتا۔ ایک یہ کہ عدالت کو انتخابات کرانے کیلئے ایک مدت مقرر کر دینی چاہئے تھی' دوسرے آئین میں ترمیم پر پابندی لگا دی جاتی۔ اسے اس بات سے مشروط کر دیا جاتا کہ صرف انتہائی ضرورت کے تحت آئین کو چھیڑا جائے گا۔ اس میں اندھا دھند ترمیم نہیں کی جائے گی۔

پاکستان ایک وفاق نہیں رہے گا

میں نے اکتوبر 77ء کی معروضات میں گزارش کی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ جب آئین کی چھتری میں سوراخ ہوں گے تو قومیتوں کے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔ پاکستان ایک وفاق تھا۔ اب یہ وفاق باقی نہیں رہا اب اسے یک سری حکومت کے انداز میں چلایا جا رہا ہے۔ ہم نے یہ وفاق بہت کٹھن' دشوار گزار اور تکلیف دہ مراحل سے گزر کر بنایا تھا۔ اب مسائل و مصائب کا پنڈورا بکس کھل گیا ہے۔ سیاسی جماعتوں کو ملیامیٹ کیا جا رہا ہے۔ سیاسی پارٹیاں ہی قومی رابطے کا ذریعہ ہوتی ہیں اگر یہ رابطے کمزور پڑ جائیں تو قومی ڈھانچہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ قومی اداروں کے کمزور ہونے سے چار قومیتوں کا مسئلہ تیزی سے سر اٹھا رہا ہے۔ اگر انتخابات کیلئے مدت کا تعین کر دیا جاتا تو یہ صورتحال پیدا نہ ہوتی۔

ہائیکورٹ کے فیصلہ پر تنقید اور اپنا دفاع

اب میں ہائیکورٹ کے فیصلہ کی بابت چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایک جعلی' گھڑا گھڑایا اور جھوٹا کیس ہے۔ جبر و عقوبت میں جتنی عیاری اور لالی ہو سکتی ہے وہ سب اس کلاسیکل مقدمہ میں موجود ہے۔ سوال یہ تھا کہ میں اپنی بے گناہی ثابت کرتا' مسئلہ یہ تھا کہ استغاثہ اپنے کیس کو شکوک و شبہات سے ماوریٰ ثابت کرتا۔ ہائیکورٹ کے فیصلہ میں جو 409 صفحات پر مشتمل ہے ایسی آراء دی گئی ہیں جو میری ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ اس فیصلہ میں شدید باطنی تضادات موجود ہیں۔ سرکاری وکیل نے خالی کارتوسوں میں ردوبدل کی بابت جو کچھ کہا وہ تضادات سے پُر اور مشکوک ہے۔ کیا یہ ردوبدل راؤ رشید نے کیا؟ عبدالاحد نے کیا یا باجوہ نے کیا؟ اس معاملہ میں گواہوں کے مابین شدید اختلافات اور تناقضات پائے جاتے ہیں۔ سازش کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔ اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ محض مفروضوں سے کام لیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایف آئی آر میں مجھے براہِ راست نامزد نہیں کیا گیا۔ صرف میرا ذکر کیا گیا تھا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میں قصوری کے باپ کا قاتل ہوں۔ جیسا کہ جسٹس وحید الدین نے کہا تھا۔ "یہ محرک کی ایک وجہ تو ہو سکتی ہے لیکن خود اسے محرک قرار نہیں دیا جا سکتا"

اگر یور لارڈ شپس مجھے اجازت دیں تو میں قتل کی سازش اور محرک کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ محرک کے حوالہ سے فیصلہ میں کہا گیا کہ ایک خاص شخص میرے خلاف زہریلی اور تلخ تقاریر کیا کرتا تھا۔ اگر اُس کی تقریر میں تضاد بیانی' دروغ گوئی اور من گھڑت باتوں پر مبنی ہوتی تھیں تو مجھے

www.bhutto.org

مشتعل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

میں ایک سیاستدان ہوں۔ میں پچھلے 22 برسوں سے اسمبلی میں موجود ہوں۔ میں نے اسمبلی میں پہلی بار تنقید و تعریض نہیں سُنی تھی کہ مشتعل ہو جاتا۔ میں تو 1963ء سے ایسے تند تیز اور زہریلے حملوں کا سامنا کرتا آرہا ہوں۔ میرے لئے تلخ سے تلخ نکتہ چینی برداشت کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لوگوں نے مجھے آمر' ڈکٹیٹر' سفاک اور ہٹلر کہا لیکن میں کبھی طیش میں نہیں آیا۔ اگر ماتحت پولیس افسران ایف آئی آر میں وزیراعظم کا نام درج کرنے سے ہچکچا رہے تھے تو اس کا ذمہ دار مجھے کیوں ٹھہرایا جائے۔ بھگتائے۔ وہ سب کے سب رضا کارانہ طور پر گواہی کیلئے تیار نہیں ہو گئے تھے وہ آزاد اور خود مختار نہیں تھے وہ جھوٹے اور داغدار تھے۔

مسعود محمود کے بارے میں

سلطانی گواہ مسعود محمود کی شہادت کو موضوع بحث بناتے ہوئے بھٹو نے کہا

"اگر وہ واقعی وعدہ معاف گواہ ہے تو لازم ہے کہ سب سے پہلے وہ خود قابل اعتماد ہو۔ وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو' بعد ازاں اُس کی گواہی کو ٹھوس تائید میسر آنی چاہئے۔ یہ سب کچھ اس مقدمہ میں سامنے نہیں آیا۔ اُس کی شہادت تضادات' اضافوں' فروگذاشتوں اور تناقضات سے بھری پڑی ہے جو تضاد بیانی کے مترادف ہیں۔ بار ثبوت کے معاملہ میں وہ اپنا فرض ادا نہیں کر سکا۔ عدالت نے استغاثہ کو شک کا فائدہ دے کر میرے ساتھ صریح ناانصافی کی ہے۔ میں اس قتل میں ہرگز ملوث نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ مسعود محمود اپنا کوئی الگ محرک رکھتا ہو اور اسی نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ استغاثہ نے محرک کا کوئی دوسرا جواز پیش نہیں کیا۔ استغاثہ کی ذمہ داری تھی کہ معقول شبہ کے بغیر یہ ثابت کرتا کہ یہ ایک گھڑا گھڑایا اور جھوٹا مقدمہ نہیں ہے۔ ابتدائی پرچۂ واردات میں قصوری نے میرے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ محض اُس کا شک ہے کوئی قطعی اور یقینی رائے نہیں۔

مسعود محمود کہتا ہے کہ وہ مجھے ہر روز ملتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ جب میں ملتان کے دورہ پر گیا تو وہ میرے ساتھ تھا۔ میں کوئٹہ جاتا ہوں تو وہ میرے ساتھ ہے۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں وہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ اُس کی مجھ تک رسائی ہے۔ میرے پاس گرین لائن ٹیلیفون تھا۔ میں مسعود محمود سے رابطہ کیلئے اُسے استعمال کرتا تھا۔ اگر میں مجرم ہوتا تو وقار احمد سے ہرگز نہ کہتا کہ جاؤ اور مسعود محمود کو فلاں کام یاد دلاؤ۔ بھلا میں سازش کی تشہیر کیوں کرتا۔ اتنا اہم پیغام فون پر کیوں دیتا جبکہ اس کے ساتھ میرا مسلسل رابطہ تھا۔

مسعود محمود جھوٹ کہتا ہے کہ میں نے سعید احمد خان کی زبانی اُسے کوئی پیغام بھجوایا تھا۔ اس کا میرے ساتھ براہ راست لنک تھا۔ میں خود اُسے کہہ سکتا تھا۔ ایف ایس ایف کے متعلق اُس کا بیان ہے کہ اس فورس کو میرے جلسوں کی رونق بڑھانے کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ کیا میرے لئے سامعین کی کمی تھی کہ میں اس فورس سے کام لیتا۔ وہ کہتا ہے کہ میں بڑے منصوبہ ساز اور قاتل غلام حسین کو نہیں جانتا جو شریک ملزمان میں سے ایک اور اس کا باڈی گارڈ تھا۔ وہ اُس کا چہیتا اور منظور نظر تھا۔ مسعود کی ہدایت پر

www.bhutto.org

اس کی ڈپوٹی قومی اسمبلی میں لگائی جاتی تھی اور پھر بھی وہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں غلام حسین کو نہیں جانتا۔ وہ سازش کے منصوبہ کی بابت کچھ نہیں جانتا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک باضمیر اور خدا سے ڈرنے والا انسان ہے۔ یہ آدمی سازش کی بنیادی کڑی ہے لیکن ہر بات کے متعلق کہتا ہے کہ "مجھے کچھ معلوم نہیں" میں نے مسعود کے ساتھ ملتان میں کبھی صبح 6 بجے بات چیت نہیں کی۔ آئی جی (پی) نے اسے ساڑھے آٹھ بجے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ مجھ سے ساڑھے نو بجے فون پر رابطہ قائم کرے۔ اس نے الزام لگایا ہے کہ میں نے اس کے بچوں کو اغوا کرانے اور اسے کھانے میں زہر دلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ میں نے خود اپنے بچوں کی نگہداشت کی ذمہ داری اسے سونپ رکھی تھی۔ میں نے اسے ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل کے منصب پر ترقی دی' میں اسے غیر ملکی دوروں پر بھیجتا رہا' میرے دور میں وہ دنیا کے بہترین ملکوں مثلاً فرانس' برطانیہ' بلجیم' جرمنی اور جاپان کے طویل دوروں پر جاتا رہا۔ وہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جاتا تھا۔

اس نے بڑی جرأت کے ساتھ میرے خلاف گواہی دی ہے بڑے دھڑلے سے جھوٹ بولا ہے کہ "میں سیٹھ عابد کو نہیں جانتا" سیٹھ عابد اس کا رشتہ دار ہے وہ اس کا بہنوئی لگتا ہے۔ وہ سیٹھ عابد کا بھائی تھا جو کیمپ جیل میں اسے کھانا پہنچاتا رہا۔ حکام دو برس تک سیٹھ عابد کو گرفتار کرنے کی کوشش کرتے رہے' وہ ملک سے باہر بھاگ گیا اور اس وقت واپس آیا جب یہاں مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا۔ اسے آتے ہی معافی دے دی گئی۔ اس کے خلاف سارے مقدمے ختم کر دیئے گئے وہ بے داغ قرار پایا اسے ہر جرم سے بری کر دیا گیا۔ اسے اپنا بینک کھولنے کی اجازت مل گئی انکم ٹیکس کی چوری کے تمام مقدمات داخل دفتر کر دیئے گئے مسعود محمود اس کے متعلق ہر سوال کے جواب میں کہتا ہے "مجھے معلوم نہیں" مسعود کی بیوی سرائین اے فاروقی کی کزن ہے اور وہ کہتا ہے "میں نہیں جانتا" اگر تم سیٹھ عابد کو نہیں جانتے تم سازش کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ آخر کیا جانتے ہو؟ اس نے اپنا سینہ صاف کرنے کیلئے سی ایم ایل اے کے نام ایک سٹینو گرافر کی مدد سے 100 صفحات پر مشتمل درخواست لکھی یہ بات بڑی عجیب' غیر معمولی اور اہم ہے۔ وہ ایسی درخواست کسی نچلے افسر کو بھی لکھ سکتا تھا۔ اس مقصد کیلئے اسے سٹینو گرافر کی خدمات کس نے اور کیوں فراہم کیں؟ اس نے خود تسلیم کیا ہے کہ معافی مل جانے کے باوجود اس نے تمام حقائق کا انکشاف نہیں کیا۔ اس لئے نہ وہ وعدہ معاف گواہ بننے کے لائق ہے نہ ہی اس کی شہادت قابلِ اعتماد ہے۔

وائٹ پیپرز

یہ امر باعثِ دلچسپی ہوگا کہ جب میرے خلاف ہائیکورٹ میں کیس چل رہا تھا اور جب میں جیل کی کال کوٹھڑی میں بند تھا تو میرے خلاف رسوا کن غلط بیانیوں پر مشتمل کئی وائٹ پیپرز شائع کئے گئے جو ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ واضح طور پر یک طرفہ کارروائی اور توہینِ عدالت کا کیس تھا ایک

www.bhutto.org

ملزم کو ایسے امور کی بابت رسوا کیا گیا جو مقدمہ سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ان وائٹ پیپرز کا اصل مقصد لوگوں کو میرے خلاف بھڑکانا اور میری کردار کشی کرنا ہے۔ ان کی اشاعت کیلئے جو وقت منتخب کیا گیا وہ طے شدہ منصوبے کے حصہ ہے جس کی غرض وغایت رائے عامہ کو میرے خلاف کرنا اور مقدمہ کی سماعت پر منفی اثرات مرتب کرنا ہے۔ میں موت کی کوٹھڑی میں بند ہوں میری رسائی ایسے مواد تک نہیں ہے جس کی مجھے ضرورت ہے تاکہ اس کی مدد سے میں ان جھوٹے اور بوگس الزامات کا جواب دے سکوں۔ وائٹ پیپر کا ایک پورا باب یحییٰ بختیار کے خلاف الزامات پر مشتمل ہے جو میرے سینئر وکیل ہیں اس کا مقصد ان کا امیج تباہ کرنا ہے۔ عدلیہ اور بار کو ان کے خلاف بھڑکانہ ہے انہیں ہراساں کرنا ہے۔ تاکہ وہ میرے مقدمہ کی پیروی سکون اور یکسوئی کے ساتھ نہ کر سکیں۔

کھلے مقدمے کی روایات

قانون عامہ کھلی سماعت کو انصاف کا جزو لاینفک قرار دیتا ہے۔ یورپ اور برطانیہ کی تاریخ کھلے عام مقدمات کی تاریخ سے بھری پڑی ہے۔ ایک دلیرانہ جدوجہد کے بعد امریکہ کے آزاد عوام نے اسے یقینی بنا دیا ہے۔ آئین میں چھٹی ترمیم کے ذریعے کھلے مقدمہ کی سماعت کو لازمی بنا دیا گیا ہے۔ یہ مقولہ کہ انصاف نہ صرف کیا جائے بلکہ نظر بھی آنا چاہئے کہ انصاف کیا گیا ہے۔ قانون کی بے داغ اور بنیادی ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قتل کے مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک جج نے اس سخت رائے کا اظہار کیا۔

"ہم تم پر مقدمہ چلا رہے ہیں' پبلک پر نہیں" اس ریمارک پر چیف جسٹس نے طنز کرتے ہوئے کہا

"لیکن یہ تشہیر چاہتا ہے۔ یہ پبلسٹی کا بھوکا ہے" میں اپنی سابقہ تمام پوزیشنوں کو فراموش کر کے ایک عام آدمی اور پاکستان کے شہری کی حیثیت سے انصاف مانگتا ہوں۔ ٹرائل بنچ کے ججوں کی وہ زود رنجی جو ان کے عناد اور تعصب کے انکشاف پر سامنے آئی تھی وہ ان کیلئے میری زندگی سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ اگر مقدمۂ قتل کی سماعت خفیہ طور پر کی جا سکتی ہے تو پھر کسی بھی مقدمے کی کھلی سماعت کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں نے ہائیکورٹ سے استغاثہ کے دلائل و مباحث ختم ہونے کے بعد خطاب کی اجازت مانگی تھی مگر میری درخواست مسترد کر دی گئی۔ یہاں تک کہ بند کمرے میں بھی مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ نور جنوری 78ء کے بعد میرے وکلاء نے بھی میری صفائی پیش نہیں کی تھی۔ اپنی طویل علالت اور عدالت سے غیر حاضری کے باعث میں استغاثہ کے گواہوں کی شہادت نہیں سن سکا تھا۔ تین ماہ تک کھلی عدالت میں مجھے ذلیل کیا گیا۔ استغاثہ کے کیس کی یک طرفہ طور پر دھاک خیز پبلسٹی کی گئی۔ پھر مقدمہ کو خفیہ اجلاس میں تبدیل کر دیا گیا۔ تمام تر پابندیوں کے باوجود میں نے بند عدالت میں اپنی زندگی کا دفاع کرنے کی اجازت مانگی تو وہ بھی نہیں ملی۔ مجھے اس حد تک مجرمانہ ناانصافی کا ہدف بنایا گیا۔

بند کمرے میں سماعت اور بحران

چیف جسٹس نے دنیا بھر کے پریس کی موجودگی میں مکمل ضمانت دی تھی کہ مقدمہ کی سماعت دن کی

www.bhutto.org

پوری روشنی میں ہوگی اور مقدمہ عام قانونی روایت کے مطابق چلایا جائے گا۔ انہوں نے ایمنسٹی انٹر نیشنل کو دعوت دی تھی کہ وہ آ کر دیکھیں کہ مقدمہ کی سماعت کتنے منصفانہ اور جائز انداز میں ہو رہی ہے۔ ان کھلے اعلانات کے باوجود مقدمہ کو خفیہ کیوں بنا دیا گیا۔ میں نے استغاثہ کو تین ماہ تک سنا۔ میں اس سارے عرصے میں خاموش بیٹھا رہا۔ جب میری باری آئی مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ملا تو ظالمانہ نا انصافی کرتے ہوئے اسے خفیہ مقدمہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ چیف جسٹس میرے خلاف شکایت کنندہ بن گئے آپ جانتے ہیں بعض اوقات سبک لہجے اور معنوں میں الفاظ بولے جاتے ہیں۔ ایک موقع پر میں نے جسٹس رضوی پر چوٹ کی تو غلطی سے "جسٹس" کے بجائے "چیف جسٹس" کے الفاظ میرے منہ سے نکل گئے چیف جسٹس نے وہ سن لئے اور فوراً بولے "چیف جسٹس کا وقت ابھی نہیں آیا" اس موقع پر میں نے پہلی بار انہیں مسکراتے دیکھا تھا۔ اس لئے میں نے مزاحاً کہہ دیا" آپ کی باری بھی آئے گی " کیونکہ تمام مسلمانوں کا وقت آتا ہے تو وہ غصہ سے بپھر گئے اور ڈیوٹی پر موجود ایس پی سے کہا کہ وہ میرے خلاف شکایت درج کرائے۔

میری غیر حاضری میں سماعت جاری رکھی گئی

میڈیکل بورڈ کی طرف سے میری علالت کی تصدیق کے باوجود میری حاضری کا انتظار کئے بغیر سماعت جاری رکھی گئی۔ ایسی سماعت 70 میں سے 18 دنوں پر محیط تھی۔ 15 اہم گواہوں جن میں ایم آر ویلچ ، محمد اصغر خان اور وکیل خان شامل تھے ۔ کا بیان میری غیر حاضری میں ریکارڈ کیا گیا۔ بیمار آدمی کیلئے وکیل کو ہدایات دینا بہت مشکل ہو جاتا ہے ان گواہوں پر جرح نہ صرف میری غیر حاضری میں بلکہ میری ہدایات کے بغیر کی گئی۔ جب میں 16 ' 17 ، دسمبر کو عدالت میں پیش ہوا تو عدالت نے حکم جاری کر دیا کہ آئندہ جمعرات سے صبح 8 بجے سے شام کے 30ء4 بجے تک مسلسل سماعت ہوا کرے گی میرے وکیل نے سابقہ اوقات برقرار رکھنے کی استدعا کی تو اسے مسترد کر دیا گیا۔ ایک موقع پر میں نے عادتاً بے خیالی میں میز پر ہاتھ مار دیا تو چیف جسٹس نے مجھے توہین عدالت کا مقدمہ قائم کرنے کی دھمکی دی۔ اس پر احتجاج کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ جو چاہیں فیصلہ کریں لیکن میری بے عزتی نہ کریں۔

خفیہ سماعت کے مضمرات

9 ، جنوری 78ء کو تعطیلات کے بعد بلاوجہ بند کمرے میں سماعت کا فیصلہ کیا گیا تو میں کارروائی کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ چیف جسٹس نے "دن کی پوری روشنی میں" سماعت سے متعلق تمام وعدے پس پشت ڈال دیئے تھے۔ پھر 25 ، جنوری سے سماعت بند کمرے میں کی جانے لگی۔ حالانکہ شریک ملزمان نے سماعت کے دوران جو کچھ کہا اُسے نہ صرف اخباروں میں رپورٹ کیا گیا بلکہ ریڈیو اور ٹی وی بھی اس کی تشہیر کی گئی۔ مقدمہ صرف میری ذات کی حد تک خفیہ تھا۔ پاکستان ٹائمز کی ایک رپورٹ سے

www.bhutto.org

پتہ چلا کہ اس سلسلے میں ایک ماہ بعد حکم جاری کیا گیا جس میں کارروائی بند کمرے میں کرنے کا یہ جواز بتایا گیا تھا کہ میں عدالت پر رُسوا کن الزامات لگانے والا تھا۔ میرے بارے میں کیوں فرض کر لیا گیا کہ میں عدالت کو بدنام کروں گا۔ 25 رجنوری کو ایک نیا حکم نامہ جاری کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ عدالت میں گڑبڑ' ہلڑبازی اور ہڑبونگ کے خوف سے بند کمرے میں سماعت کا فیصلہ کیا گیا ہے حالانکہ ہائیکورٹ ایک قلعہ کی مانند ہے۔ پھر انتظامات کیلئے پولیس کی بہت زیادہ نفری تعینات تھی۔ ان حالات میں گڑبڑ کیسے ہو سکتی تھی یہاں (سپریم کورٹ میں) میں چار دن سے بول رہا ہوں۔ یہاں کتنی گڑبڑ ہوئی ہے پس خفیہ ٹرائل کے بارے میں عدالت کا حکم حقائق پر نہیں بدنیتی پر مبنی تھا۔ پھر تمام شبہات کا فائدہ استغاثہ دیا گیا۔ عدالت نے ہر مرحلہ پر اپنے تعصب اور عناد کا مظاہرہ کیا۔ پہلے دن بھٹو کی سپریم کورٹ میں آمد بلاشبہ متاثر کن تھی انہوں نے ایک جمود توڑ دیا تھا۔ وہ لوگوں کو دوبارہ دیکھنے موت کی کوٹھڑی سے آئے تھے اور لوگ بھی حیرت واستعجاب سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ دوسرے روز وہ پہلے دن سے زیادہ پراعتماد اور مطمئن لگ رہے تھے دوسرے دن انہوں نے اپنی گزارشات کا آغاز صبح 9 بجے کیا۔

ججوں کی باری

اپنے جملہ آلام ومصائب کے درمیان بھی بھٹو نے اپنی حس مزاح کو زندہ رکھا۔ اُنہوں نے یاد دلایا کہ گذشتہ برس جب میری حکومت کا تختہ الٹا گیا پہلا موقع تھا کہ سرکاری ملازموں کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ شاید آئندہ ججوں کی باری بھی آجائے۔ اُنہوں نے جج کی طرف مسکراتے ہوئے کہا :

بھٹو نے اس یقین کا اظہار کیا کہ چونکہ اتنے سارے لوگوں نے ان کے خلاف گواہیاں دی ہیں' اس سے صاف عیاں ہے کہ یہ لوگ حکومت کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت کون بااختیار وبرسراقتدار ہے اور کون مجبور وبے بس۔ انہوں نے اس روز پھر ججوں کا شکریہ ادا کیا کہ انہیں بولنے کی اجازت دی گئی۔

"جب ایک معصوم وبے گناہ شخص کی جان لینے کی باتیں ہو رہی ہوں تو کم از کم اُس آدمی کی بات سُن لینی چاہئے۔"

مقدمہ کا ریکارڈ

اُنہوں نے کہا کہ انہیں عدالت سے خطاب کرنے کی اجازت انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے دی گئی ہے کیونکہ انصاف ریکارڈ سے بالاتر ہوتا ہے۔ ہائیکورٹ کا ریکارڈ ناقص اور مسخ شدہ ہے جہاں تک میری شہادت کا تعلق ہے اسے بہت مسخ کیا گیا۔ اس میں کتر بیونت کی گئی ہے۔ اس موقع پر انہیں ضیاء الحق کا وہ ضرر رساں انٹرویو یاد آیا جو ستمبر 77ء میں کیہان انٹرنیشنل کو دیا گیا تھا۔ بھٹو نے اخبار کے تراشہ سے پورا اقتباس پڑھ کر سنایا۔ جس میں کہا گیا تھا "مسٹر بھٹو جیسے کسی شخص کو قتل کرنے کی بات

www.bhutto.org

تو سمجھ میں آتی ہے اگر قصوری مسٹر بھٹو کی طرح ہوتا تو قتل کو سمجھنا آسان ہوتا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ مسٹر بھٹو اتنا نیچے گر گئے کہ وہ قصوری جیسے بے حیثیت شخص کو نشانہ بنانے لگے "باقی وقت میں انہوں نے قصوری کی شہادت اور قتل کے محرک کے حوالے سے اپنی بے گناہی ثابت کی۔

تیسرے دن بھٹو نے اپنی گزارشات کا آغاز معذرت کے ساتھ کیا کیونکہ وہ عدالت میں تاخیر سے پہنچے تھے اس کا سبب انہیں ہراساں اور مشتعل کرنے کیلئے بلاوجہ کھلی وین کی بجائے پولیس کی بند گاڑی میں جو سپاہیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی بیٹھنے کو کہا گیا۔ بھٹو نے انکار کرتے ہوئے کہا " مجھے اپنی عزت اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ میں وجہ معلوم کئے بغیر اس گاڑی میں بیٹھنے پر واپس اپنی کوٹھڑی میں جانے کو ترجیح دوں گا" اس پر انہیں اسی وین میں عدالت لایا گیا۔ چیف جسٹس نے سارا واقعہ سنا تو ناراضگی کا اظہار کیا۔

اس روز بھٹو نے مسعود محمود کی شہادت کو نشانہ بناتے ہوئے اس امر کی تردید کی کہ انہوں نے ایم ڈی کا عہدہ سنبھالنے کے لئے اس پر کوئی دباؤ ڈالا تھا یا کسی کو قتل کروانے کی ہدایت کی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پی این اے کی احتجاجی تحریک کے دنوں میں 'میں نے اپنے

مسعود جھوٹ بولتا ہے

بچوں کی حفاظت کا کام بھی اس کو سونپا تھا اگر وہ مجھ سے اکثر شاکی رہتا تھا تو پھر مجھے سعید احمد کے ذریعے اس تک پیغام پہنچانے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر اس نے مجسٹریٹ کے روبرو جو بیان دیا تھا اس میں بہت سی تبدیلیاں اور ترامیم کی گئیں۔ مسعود نے ملتان میں میری طرف سے اسے صبح سویرے طلب کرنے کی جو بات کی وہ قطعاً غلط ہے۔ میں نے کبھی کسی کو صبح ساڑھے چھ بجے نہیں بلایا۔ مسعود کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا کہ وہ میرے ساتھ سازش میں شریک تھا حالانکہ اسے تو منصوبے کا سرے سے علم ہی نہیں تھا۔ وہ غلام حسین کو بھی نہیں جانتا تھا جو اس کا باڈی گارڈ تھا۔ اس کی شہادت جھوٹ کا پلندہ اور ناقابلِ اعتماد ہے۔ یہ ایک گھڑی گھڑائی کہانی ہے ایک دلچسپ ناول ہے وہ اپنے بیانات کی رو سے مجرم قرار پاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سعید احمد خان۔

کٹہرے کی تیاری

سپریم کورٹ میں بھٹو کی آخری اور چوتھے دن پیشی کے موقع پر بھی لوگوں کا بڑا ہجوم تھا۔ سازش اور قتل کے معاملات پر دلائل دینے کے بعد اب بھٹو نے اپنی گرفتاری کے واقعات سے عدالت کو آگاہ کیا جسے وہ بدنیتی پر محمول کرتے تھے اور ہائیکورٹ کے تعصب کا نتیجہ قرار دیتے تھے اس دن انہوں نے پھر اپنے لئے بنائے گئے کٹہرے کا ذکر کرتے ہوئے کہا " وہ کٹہرا جس میں مجھے دوسروں سے تنہا کیا گیا' صرف میری اہانت نہیں تھی بلکہ میرے اور وکلاء کے درمیان ایک جسمانی رکاوٹ بھی تھی۔ میرے بائیں طرف پولیس کا ایک سپرنٹنڈنٹ اور دائیں طرف انٹیلی جنس افسر بیٹھتا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش رہتے۔ میں اپنے وکلاء کی خیریت

www.bhutto.org

دریافت کرتا تب بھی وہ سننے کیلئے آگے جھک جاتے۔ میں کچھ لکھنے لگتا تو اسے پڑھتے۔ وہ گدھوں کی طرح میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے اس سے پہلے لاہور ہائیکورٹ میں کوئی کٹہرا نہیں بنایا گیا تھا۔ انہوں نے استغاثہ کے اس موقف کی تردید کی کہ وہ کٹہرا انہیں نامہ نگاروں کے ساتھ رابطہ کرنے سے روکنے کیلئے بنایا گیا تھا۔ میں نے کبھی کوئی پریس کانفرنس نہیں کی تھی جو ہاں بات کرنا مشکل تھا بھلا پریس کانفرنس کی کس کو سوجھتی تھی۔ میرے خلاف سب سے زیادہ تعصب خود چیف جسٹس کے سینہ میں تھا۔ بھٹو نے دونوں کے مابین 1963ء سے پائی جانے والی رنجش کا حوالہ دیتے ہوئے کہا حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ 1968ء میں لاہور کیمپ جیل میں جس شخص نے میری اپیل سنی تھی ایک بار پھر وہی میرے خلاف مقدمہ قتل کی سماعت کر رہا تھا۔

امتیازی سلوک

اپنی بیماری کے موضوع پر بولتے ہوئے بھٹو نے شکایت کی کہ کوٹ لکھپت جیل اور راولپنڈی میں بھی انہیں علاج کی مناسب سہولت فراہم نہیں کی گئی اس طرح ان پر ملیریا' انفلوئنزا اور درد قولنج کا حملہ ہوا ان کا درجہ حرارت 102 ڈگری تک پہنچ جاتا تھا۔ علالت کے باعث وہ عدالت میں حاضر نہ ہو سکے لیکن عدالت نے غیر حاضری میں سماعت جاری رکھی اور ان کی عدم موجودگی میں استغاثہ کے 15 گواہوں کی شہادتیں ریکارڈ کی گئیں۔ 70 میں سے 18 دن کی کارروائی اُن کی غیر حاضری میں کی گئی۔ ہراساں کرنے کی ایک کوشش اس طرح کی گئی کہ سردیوں میں عدالت کا وقت 8 بجے سے 4 بجے تک کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ جبکہ کوٹ لکھپت جیل سے عدالت پہنچنے میں پورا ایک گھنٹہ لگتا تھا اس پر عملدر آمد کا مطلب تھا کہ وکیل اور موکل کیلئے تھکا دینے والا وقت شروع ہو جاتا۔ بڑی مشکل سے اس تجویز کو واپس لیا گیا انہیں موت کی کال کوٹھڑی میں رکھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی جبکہ دوسرے سزا یافتہ ملزموں کو اُن کی سابقہ کوٹھڑیوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

عدالت مارشل لاء کی محافظ نہ بنے

اگرچہ چیف جسٹس نے واضح کر دیا تھا کہ ملک کی سیاسی صورتحال اور پاکستان کے مستقبل کا اس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھٹو نے چند اُمور کو چھونے کی کوشش کی۔

قوم اس وقت نازک صورتحال سے گزر رہی ہے۔ مارشل لاء قوم کو منتشر کر دیتا ہے کسی سول حکومت کے دور میں حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں' ان کا موازنہ مارشل لاء کے تحت حالات سے نہیں کیا جا سکتا۔ انصاف ناقابل تقسیم ہوتا ہے۔ اس میں کسی سے سودا نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی شخص یا تو بے گناہ ہے یا نہیں ہے اس میں درمیان کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ انہوں نے اپنی معروضات کا اختتام کرتے ہوئے عدالت سے استدعا کی کہ وہ انسان کو سر بلند رکھے اور مارشل لاء کی محافظ

www.bhutto.org

(Matron) نہ بنے۔ انہوں نے اپنے بیان کو سرائیکی بولی کے ان الفاظ پر ختم کیا۔
"درداں دی ماری دلڑی علیل اے"

کیا یہ آخری سُریلا راگ تھا؟

بھٹو عدالت کے شکر گزار تھے اور اُنہوں نے عدالت پر اپنے اعتماد کا اظہار ان چار دنوں میں لگاتار کیا۔ وہ عدالت کا شکریہ ادا کرنے میں اس لئے حق بجانب تھے کہ چیف جسٹس نے اُنہیں ایک طویل تقریر کرنے کی اجازت دی تھی لیکن اگر ان کا خیال یہ تھا کہ عدالت بر اس بات پر غور کرے گی جو وہ اپنی طویل تقریر میں کہہ رہے تھے تو یہ محض بھٹو کی خام خیالی تھی۔ ان کا خطاب آخری سریلا راگ (Swan - song) ثابت ہوا جسے عدالت میں گانے کی بڑی فراخدلی سے اجازت دی گئی تھی۔ بالکل اُسی طرح جیسے ڈاکٹر کسی مریض کی زندگی سے مایوس ہونے کے بعد اسے اجازت دے دیتے ہیں کہ "جو تمہارا جی چاہے کھا پی سکتے ہو" کیا یہ عدلیہ کی ڈپلومیسی کا ایک پہلو تھا کہ اُسے بات کرنے کی اجازت دی گئی؟ وہ جو کچھ کہنا چاہے کہہ سکے؟ لیکن اُس کی معروضات سے متاثر ہوئے بغیر وہی فیصلہ برقرار رکھا جو ہائیکورٹ نے کیا تھا۔

www.bhutto.org

دسواں باب

اپیل سے متعلق متفرق امور

شریک ملزمان کی حاضری

وکلاء نے درخواست داخل کی کہ بھٹو کی طرح دوسرے اپیل کنندگان کو بھی عدالت میں پیش ہو کر بذاتِ خود اپنی معروضات پیش کرنے کی اجازت دی جائے ان کی یہ استدعا یہ سمجھتے ہوئے منظور کر لی گئی کہ ان میں ہر ایک کا بیان پانچ سے 10 منٹ پر مشتمل ہو گا ہر ایک نے اپنی گزارشات لکھ رکھی تھیں۔

میاں محمد عباس کا بیان

پہلا شخص میاں محمد عباس سابق ڈائریکٹر آپریشنز تھا جس نے اپنا بیان تین دفعہ تبدیل کیا تھا وہ ایک عمر رسیدہ اور جسیم آدمی تھا اس نے اپنا بیان انگریزی میں پڑھا۔

اس نے اپنے 10 ر جولائی والے بیان پر اصرار کیا جو اُس نے جیل سے بھیجا تھا اور اُس کے وکیل نے پڑھ کر سنایا تھا اس بیان میں اس نے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کا اعتراف یہ کہتے ہوئے کیا تھا کہ یہ سب کچھ جبر کے تحت کرنا پڑا۔ اُس نے ایک بار پھر اقبالِ جرم کرتے ہوئے کہا

"جرم میں میری شرکت فی الحقیقت صحیح ہے۔ میں حالات کے باعث جرم میں مجبوراً شریک ہوا تھا"

اس بیان میں بھی ایسا کوئی اشارہ موجود نہ تھا کہ اسے ایسا کرنے کا حکم وزیر اعظم نے دیا تھا۔ البتہ یہ بات واضح کی گئی کہ "مسعود محمود" سخت مزاج کام لینے والا آقا تھا۔ اُس کی حیثیت ایک دھونس دینے والے ظالم (Bully.) کی سی تھی۔ وہی تھا جس نے اُسے جرم کے ارتکاب پر مجبور کیا۔

www.bhutto.org

غلام مصطفیٰ کا بیان

ایف ایس ایف کے سابق انسپکٹر غلام مصطفیٰ نے اپنے بیان میں کہا "ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم نے صرف وہ فرائض ادا کئے جو افسران بالا کی طرف سے تفویض کئے گئے تھے۔ واردات میں استعمال ہونے والا اسلحہ میں نے حاصل کیا تھا۔ حکام بالا نے ہمیں غیر قانونی غیر اخلاقی اور گھٹیا مقاصد کیلئے استعمال کیا۔ ایف ایس ایف کے ملازمین سے وزیر اعظم سے وفاداری کا حلف لیا جاتا تھا۔ محمد احمد خان کے قتل کے بعد اس حلف نامہ میں ترمیم کی گئی ایف ایس ایف نے جو بھی غلط کام کیا وہ اعلیٰ حکام کے کہنے پر کیا اور مسٹر بھٹو اپنی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے۔"

ارشد اقبال کا اعتراف

ایس ایس ایف کے سابق انسپکٹر ارشد اقبال نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"ایف ایس ایف کے افراد کو غیر قانونی افعال انجام دینے پر مجبور کیا جاتا تھا جو بھی انکار کرتا اُسے سزا دی جاتی تھی۔"

رانا افتخار احمد کا اقبالی بیان

ایف ایس ایف کے سابق سب انسپکٹر افتخار احمد نے کہا:

"مسٹر بھٹو ذاتی طور پر محمد احمد خان کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔ مسعود محمود بہت کمینہ شخص تھا۔ کوئی شخص حکم عدولی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے جرم میں اس لئے ملوث ہونا پڑا کہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں خود کو عدالت کے رحم پر چھوڑتا ہوں"

جہاں تک چاروں شریک ملزموں کا تعلق تھا انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور رحم کی درخواست کی جبکہ بھٹو نے برم کو تسلیم کیا نہ ہی رحم کی بھیک مانگی۔

یوں 23 دسمبر کو اپیل کی سماعت مکمل ہو گئی۔ عدالت نے فیصلہ محفوظ کر لیا۔

اپیل کی سماعت کے دوران پیش آنے والے دو اہم واقعات

سپریم کورٹ میں اپیلوں کی سماعت کے دوران دو اہم واقعات رونما ہوئے جنہوں نے اپیل کے فیصلہ اور عملدر آمد پر گہرا اثر ڈالا۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ ان کا تذکرہ قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔

1.....بنچ سے دو ججوں کی علیحدگی

اپیل کی سماعت 20 مئی سے شروع ہوئی تھی۔ بختیار کے دلائل ابھی جاری تھے کہ 30 جولائی کو بنچ کے ایک رکن جسٹس قیصر خاں ریٹائرمنٹ پر چلے گئے۔ بھٹو کے حامیوں نے اسے زیادتی سے تعبیر کیا کیونکہ

www.bhutto.org

روایت یہ ہے کہ اگر کوئی جج کسی مقدمہ کی سماعت میں شامل ہو تو اُسے سماعت کی تکمیل تک بنچ سے الگ نہیں کیا جاتا۔ ریٹائرمنٹ وغیرہ کا مسئلہ پیش آ جائے تو ایڈہاک بنیادوں پر تقرری یا ملازمت میں توسیع کر دی جاتی ہے۔ یہ ایک معمول کی کارروائی ہوتی ہے جو قلم کی ایک جنبش سے مکمل ہو جاتی ہے قیصر خان خود بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ ان کی تقرری ایڈہاک بنیادوں پر کر دی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور مقررہ تاریخ کو انہیں ریٹائر کر دیا گیا۔

بھٹو کی ہدایت پر اُن کے وکیل نے قیصر خان کی ریٹائرمنٹ کے بارے میں چیف جسٹس سے شکایت کی۔ انوار الحق نے جواب دیا چونکہ صفائی نے ایسی کوئی درخواست نہیں کی تھی اس لئے وہ اپنے طور پر قیصر خان کو ایڈہاک بنیادوں پر جج مقرر نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اپیل کنندہ پہلے ہی بنچ کے بارے میں اپنے عدم اطمینان کا اظہار کر چکا تھا۔ اس پر بختیار نے قدرے تند و تیز جواب دیا۔ "اپیل کنندہ نے بنچ پر نہیں صرف چیف جسٹس کے بارے میں عدم اطمینان ظاہر کیا تھا۔"

قیصر خان کی ریٹائرمنٹ سے ججوں کی تعداد آٹھ رہ گئی اور ووٹوں کی تقسیم چار چار ہو گئی۔ لوگ قیاس کرنے لگے کہ نجانے ووٹوں کا تناسب کیا ہو گا۔ جو لوگ مایوس سوچ کے مالک تھے وہ کہنے لگے کہ ہائیکورٹ کا فیصلہ برقرار رہے گا۔ بہت سے لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر اپیل کی سماعت اس ریٹائرمنٹ سے قبل مکمل ہو جاتی تو فیصلہ بہت مختلف ہوتا۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ اپیل کی سماعت میں جو سستی اور تاخیر روا رکھی گئی اس کی قیمت بھٹو کو اپنی زندگی سے ادا کرنی پڑے گی۔

قیصر خان کی یوں اچانک سبکدوشی ان کی عدم موجودگی کی بنا پر باعث تشویش تو بنی بلکہ ایک مثال قائم ہو گئی کہ مستقبل میں بھی جب کسی جج کی مدت ملازمت پوری ہو جائے گی اسے ریٹائر کر دیا جائیگا جسٹس نسیم حسن شاہ اور وحید الدین بھی نومبر میں ریٹائر ہونے والے تھے۔ بھٹو نے قبل از وقت اپنے سینئر وکیل کو ایک درخواست پکڑائی جس میں چیف جسٹس سے گزارش کی گئی تھی کہ ان دونوں ججوں کو ایڈہاک بنیادوں پر بنچ میں رہنے دیا جائے۔ چیف جسٹس نے عید کی تعطیلات کے بعد اس کی منظوری کا اعلان کیا جس پر خوشی کا اظہار کیا گیا لیکن یہ تشویش اپنی جگہ رہی کہ یہی سلوک جسٹس قیصر خان کے معاملے میں کیوں روا نہیں رکھا گیا۔

نومبر میں اچانک جسٹس وحید الدین احمد کی آنکھ کے قریب بیمبرج ہوا اور وہ علیل ہو گئے۔ عدالت کی کارروائی چند دنوں کیلئے ملتوی کر دی گئی۔ اُنہتر برس کی عمر میں وہ اپنی ریٹائرمنٹ کو پہنچ چکے تھے اور اپیل کی سماعت مکمل ہونے تک انہیں بنچ میں رکھا گیا تھا ان کی بیماری نے نازک اور تشویش ناک صورت اختیار کر لی۔ آنکھ کے قریب دورانِ خون کی وریدنے ان کی بینائی اور توازن کو بہت نقصان پہنچایا۔ کراچی، لاہور اور راولپنڈی کے ڈاکٹروں پر مشتمل ایک بورڈ نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد طویل آرام کی سفارش کی۔ اُن کے جج بھائیوں کیلئے اتنا عرصہ انتظار کرنا ناممکن ہو گیا۔ اپیل پہلے ہی بہت لمبی ہو گئی تھی اس میں مزید تاخیر سے یہ خدشہ پیدا ہو سکتا تھا کہ جو دلائل اُن کے سامنے پیش کئے گئے ہیں وہ بھول نہ جائیں۔ جسٹس وحید

www.bhutto.org

الدین نے بسترِ علالت سے خط لکھا جس میں یہ عندیہ دیا گیا تھا کہ وہ صحت یاب ہونے کے بعد اپیل کی سماعت کرنا پسند کریں گے لیکن اگر عدالت یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ زیادہ عرصہ انتظار نہیں کر سکتی تو جج اُن کے بغیر بھی سماعت کر سکتا ہے۔

20 نومبر کو چیف جسٹس نے فیصلہ سنا دیا کہ جسٹس وحید الدین اب بنچ میں نہیں بیٹھیں گے وکلائے صفائی نے اس کی شدید مخالفت کی۔ بختیار نے کہا جب جج نے خود رضامندی ظاہر کی ہے کہ وہ اپیل کی سماعت کرنا چاہتے ہیں تو یہ اعلان انہیں بنچ سے ہٹائے جانے کے برابر ہے۔ ایڈہاک بنیاد پر ان کی تقرری ایک معقول ترین سبب ہے کہ وہ اپیل کی سماعت کریں۔ چیف جسٹس نے دوسرے ججوں کی تائید سے دو ٹوک جواب دیا کہ چار سے چھ ہفتے تک (جیسا کہ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا) انتظار کرنا اب عملاً ممکن نہیں رہا۔ بختیار نے وضاحت کی کہ جج کا انتظار کر لیا جائے کیونکہ کرسمس کی چھٹیاں ہونے والی ہیں انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ وہ اپنے دلائل تحریری صورت میں پیش کرنے کو تیار ہیں جو بیمار جج کو پڑھ کر سنائے جا سکتے ہیں۔ مگر بنچ پر ان کی کسی دلیل کا اثر نہیں ہوا۔

یوں جسٹس وحید الدین کے نکل جانے سے بنچ سکڑ کر 7 ججوں پر مشتمل رہ گیا۔ فریقین جانتے تھے کہ اب ووٹنگ کا توازن بگڑ جائے گا۔ ابتدا میں بھٹو کے حامیوں کا خیال تھا کہ انہیں چار کے مقابلہ میں پانچ کی اکثریت حاصل ہے لیکن اب چار کے مقابلہ میں ان کے تین ووٹ رہ گئے تھے ان کے حوصلے پست ہونے لگے۔ وہ کفِ افسوس ملنے لگے ' کاش اپیل کی سماعت جسٹس قیصر خان کی ریٹائرمنٹ سے بھی پہلے مکمل ہو جاتی لیکن اب صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

2......جنرل ضیاء کا منصبِ صدارت پر فائز ہونا

اپیل کی سماعت کے دوران دوسرا اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ 15 ستمبر 78ء کو صدر فضل الٰہی چودھری نے ایک آرڈیننس پر دستخط کیے جس کے تحت ملک کیلئے صدر نامزد کرنے کا اختیار چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو دے دیا گیا۔ ضیاء نے صدر مملکت کو یہی تاثر دیا تھا کہ وہ انہی کو دوبارہ صدر نامزد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ بطور صدر ان کے منصب کی میعاد 16 ستمبر کو ختم ہو رہی تھی لیکن اگلے روز جنرل ضیاء نے خود اپنے آپ کو صدر نامزد کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ خود اُن کے رفقاء اور فوج کے دیگر حلقوں میں بھی اس بات کو پسند نہیں کیا گیا اور ایک جرنیل نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا

"میرے خیال میں سی ایم ایل اے اپنی پلیٹ میں بہت زیادہ کھانا ڈال رہے ہیں"۔

اُن کے بقول ضیاء ایک بار خود ان سے کہہ چکے تھے کہ "میں صدر بننا ہرگز قبول نہیں کروں گا" اس کے باوجود موقع ملتے ہی انہوں نے صدارت پر قبضہ کرنے میں لمحہ بھر کا تردد بھی نہیں کیا اور 16 ستمبر کی سہ پہر کو چیف جسٹس نے اُن سے صدارت کا حلف لیا۔ یہ ایک بہت معنی خیز واقعہ تھا۔ اس

www.bhutto.org

کا مطلب یہ تھا کہ اگر بھٹو کی سزا کا فیصلہ بحال رکھا گیا تو پھر چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے ضیاء واحد فرد ہوں گے جنہیں اس میں تبدیلی کرنے کا اختیار ہو گا۔ یہ عجیب بات تھی کہ ایک ایسے شخص کو بڑی عیاری کے ساتھ منصبِ صدارت سے ہٹا دیا گیا جس کی تقرری بھٹو کے زمانہ میں ہوئی تھی اور ان کی جگہ ایک ایسے شخص نے لے لی جس نے اپنی تقرری خود کی تھی اور بھٹو کے ساتھ اس کی دشمنی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔

منصبِ صدارت پر قبضہ کرنے کے بعد ضیاء الحق بھٹو کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے معاملہ میں مختارِ کُل بن گئے۔ اپیل کا فیصلہ 6 ر فروری کو سنایا گیا۔ ملٹری کونسل میں یہ معاملہ 12 ر فروری کو زیر بحث آیا جنرل اقبال اور بعض دوسرے جرنیلوں نے مخالفانہ رائے دی لیکن تب تک ضیاء اپنے پتے لگا چکے تھے اب ان کے قریبی رفقاء میں جنرل اقبال' سید میاں اور چشتی کی جگہ جنرل رحیم الدین' جنرل مجیب الرحمٰن اور اختر عبدالرحمٰن لے چکے تھے۔ جن کے ذریعے ضیاء نے اپنی مرضی کا فیصلہ منظور کروالیا۔

اپیل کے بارے میں اخذ کردہ نتائج کا خلاصہ ( )

چیف جسٹس نے اپیل میں اٹھائے گئے نکات اور پیش کردہ دلائل کا جائزہ لینے کے بعد جو نتائج اخذ کئے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

پیرا..... 924

"یہ ایک بے نظیر اور انوکھا کیس تھا' جس میں ایک سابق سربراہِ حکومت ملوث تھا۔ اس بناء پر سماعت کنندہ بنچ کیلئے اس کی کارروائی مشکل اور تھکا دینے والی تھی۔ بدقسمتی سے بعض مراحل پر اپیلانٹ بھٹو نے جو رویہ اختیار کیا اُس نے کوئی آسانی پیدا نہیں کی۔ صفائی کی طرف سے دلائل کا بڑا حصہ یہ ثابت کرنے کے لئے وقف رہا کہ ہائیکورٹ نے مقدمہ کی سماعت دیانتداری سے نہیں کی اور یہ کہ اس میں بہت سی ضابطے کی بے قاعدگیاں موجود ہیں جو کیس کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں ان کے نتیجہ میں ساری کارروائی اثباتِ جرم اور سزائیں کالعدم ٹھہرتی ہیں۔

میں نے ان معروضات کا جائزہ لیا۔ وہ ضابطۂ فوجداری کے قریباً سارے پہلوؤں پر محیط ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سماعت حقیقتاً بڑی حد تک ضابطہ فوجداری کے احکام کے مطابق کی گئی اور یہ کہ اس میں جو فروگذاشتیں' غلطیاں' بے ضابطگیاں بلکہ بے قاعدگیاں سرزد ہوئیں' وہ اس نوعیت کی ہیں کہ وہ سماعت کو کالعدم نہیں کرتیں اور ضابطہ فوجداری کی دفعہ 527 کے احکام کے تحت' جیسا کہ 1972ء سے وہ اپنی ترمیم شدہ صورت میں نافذ العمل ہے یقیناً قابلِ اصلاح تھیں۔

925..... میں نے مزید دیکھا کہ بنچ کے سربراہ کے خلاف عناد و تعصب کے الزامات نیز سماعت کے دوران صادر کردہ احکام اور کی گئی کارروائیوں پر تنقید مبنی برحق نہیں۔ ان واقعات نیز اُس پس منظر

www.bhutto.org

کے باوجود جس کی طرف اپیل کنندہ اور اس کے فاضل وکیل نے اشارہ کیا ہے پانچ ججوں پر مشتمل بنچ نے مقدمہ کی سماعت کو ممکنہ حد تک منصفانہ بنانے میں اپنی بہترین کوشش کی ہے۔

926..... استغاثہ اپنی طرف سے پیش کردہ زبانی و تحریری شہادتوں کے بل پر کسی معقول شبہ کے بغیر حسب ذیل ثابت کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

الف (i) احمد رضا قصوری اپیلانٹ بھٹو کا مداح اور پی پی پی کے اساسی اراکین میں سے ایک تھا۔ اُسے پارٹی کی قصور شاخ کا چیئرمین بنایا گیا۔ دسمبر 1970ء کے انتخابات میں وہ پی پی پی کے ٹکٹ پر ایم این اے منتخب ہوا۔ بعد میں دونوں کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے۔ قصوری بھٹو کی ذات اور اس کی پالیسیوں پر پارلیمنٹ کے اندر اور باہر کڑی نکتہ چینی کرنے لگا۔ اس نے بھٹو کو اقتدار کا بھوکا اور پاکستان کو دولخت کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس نے اسمبلی میں آئین کے ان آرٹیکلز کے خلاف زہریلی تقریریں کیں جن کی غرض و غایت اُس کی نظر میں شخصی حکمرانی قائم کرنا اور انسانی حقوق و آزادیوں کو سلب کرنا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے 1973ء کے آئین پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا جسے اسمبلی کے جملہ شعبوں کی حمایت حاصل تھی۔ آخر میں اُس نے پی پی پی کو چھوڑ کر تحریک استقلال سے ناطہ جوڑ لیا۔ اپیلانٹ کے خلاف قصوری کی اعلانیہ تنقید اسمبلی کے ریکارڈ پر موجود ہے۔

الف (ii) یہ تلخی اور کشیدگی 3 رجون 1974ء کو اُس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب قصوری نے بھٹو کی تقریر کے درمیان مداخلت کی' اس سے دونوں کے مابین تو تکار ہوئی۔ بھٹو نے قصوری کو ڈانٹتے ہوئے کہا "چپ ہو' میں تمہیں بہت برداشت کر چکا ہوں تم میرے لئے مطلق زہر بن گئے ہو' میں تمہاری بکواس مزید برداشت نہیں کروں گا۔"

الف (iii) اپیلانٹ کی طرف سے قصوری کو قتل کرنے کا محرک ریکارڈ پر اچھی طرح ثابت ہو گیا ہے۔ مسعود محمود اور استغاثہ کے دوسرے گواہوں پر تفصیلی جرح کے دوران مسعود محمود' سعید احمد خان یا دیگر شریک ملزمان میں سے کسی کی طرف سے واضح تحرک کی موجودگی کا اظہار نہیں ہوا کہ اس نے ایف ایس ایف کے ذریعے قصوری کو ٹھکانے لگانے کا اہتمام کیا تھا۔

(ب) جہاں تک پیپلز پارٹی کا تعلق ہے قصوری کوئی غیر اہم شخص نہ تھا۔ اپیلانٹ نے قصوری کو جو خط لکھے ان میں سے ایک میں آخر الذکر کی بیحد تعریف و توصیف کرتے ہوئے اسے "مرد بحران" کہا گیا۔ اسمبلی میں اس نے جو تقاریر کیں' وہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس میں چبھتی ہوئی تقریر کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ قصوری کی کڑی نگرانی اور بعد ازاں اپیلانٹ کے چیف سیکورٹی افسر نیاز اس کے معاون کی طرف سے اُس کا تعاقب کیا گیا اس سے بھی قصوری کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

(ج) اس صورتحال میں بھٹو نے قصوری کو ایف ایس ایف کی ایجنسی کے ذریعے ختم کرانے کی

www.bhutto.org

غرض سے اس کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود کے ساتھ ساز باز کی۔ بھٹو نے مسعود محمود کو قطعی حکم دیا کہ قصوری کی لاش یا ٹیوں میں لپٹے ہوئے جسم کے ساتھ اُس کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ آخر الذکر نے ایسا کام کرنے پر احتجاج کیا اس کے مابعد اقدامات ثابت کرتے ہیں کہ وہ قصوری کے خلاف مجرمانہ سازش میں رضا کارانہ طور پر شریک ہو گیا اُس مقصد کیلئے اُس نے میاں محمد عباس کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ جس کا تعارف بھٹو نے اُس سے یہ کہہ کر کرایا تھا کہ وہ پورے معاملہ سے باخبر ہے اور اسے مسعود محمود کے پیشرو حق نواز ٹوانہ کی طرف سے مناسب ہدایات مل چکی ہیں۔

(د) میاں محمد عباس نے اس سلسلے میں غلام حسین نیز غلام مصطفیٰ ' ارشد اقبال اور افتخار رانا کو اعتماد میں لیا اور انہیں سازش کو کامیاب بنانے کے لئے غلام حسین کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ اُس نے امیر بادشاہ اور فضل علی کو بھی ہدایت کی کہ وہ غلام حسین کو مطلوبہ ہتھیار اور ایمونیشن فراہم کریں۔ اس کام کیلئے غلام حسین کے بطور خاص انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ وہ فوج میں 14 برس تک کمانڈو کی حیثیت سے فرائض انجام دے کر ایف ایس ایف میں آیا تھا اور ایک کمانڈو کورس چلا کر اپنی صلاحیت کا لوہا منوا چکا تھا۔ اُسے ایک سال سے بھی کم مدت میں اے ایس آئی سے انسپکٹر کے عہدہ پر بہت جلد ترقی دی گئی تھی۔

(ر) اس سازش کی تعمیل میں 24 ر اگست 1974ء کو اسلام آباد میں قصوری پر ایک قاتلانہ حملہ کیا گیا جو ناکام رہا اس کی رپورٹ آبپارہ تھانہ میں درج کرائی گئی۔ تفتیشی افسر ناصر نواز نے جائے واردات سے پانچ خول برآمد کئے جن پر 661/71 مارکنگ موجود تھی۔ ماہر اسلحہ کے تجزیہ سے ثابت ہوا کہ وہ خول 7.62 ایم ایم بور کے تھے یعنی اسی قسم کا بور جو ایف ایس ایف کی یونٹوں میں استعمال ہوتا تھا۔ قصوری نے اس حملہ کی بابت ایک تحریک استحقاق بھی قومی اسمبلی میں پیش کی تھی۔

(ز) 29 ر جولائی 74ء کو بھٹو اور مسعود محمود دونوں کوئٹہ میں تھے جہاں اول الذکر نے آخر الذکر کو ہدایت کی کہ قصوری عنقریب کوئٹہ آنے والا ہے اس کے مجوزہ دورہ کے دوران اس پر کڑی نظر رکھی جائے۔ مسعود محمود نے ایف ایس ایف کے مقامی ڈائریکٹر ایم آر ویلیج کو اس سلسلہ میں ضروری ہدایات دیں ' جس نے استغاثہ کے اس دعویٰ کی تائید میں زبانی اور دستاویزی شہادت پیش کی ہے۔ جو اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتی کہ واقعی قصوری کو کوئٹہ میں ٹھکانے لگانے کی سازش کی گئی تھی تاہم وہ اس سے بچ نکلا۔ اس لئے کہ ایم آر ویلیج نے اس فعل شنیع میں دانستہ حصہ نہیں لیا۔ ایم آر ویلیج کی ثابت کردہ مراسلت سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس مرحلہ پر میاں عباس معاملہ سے پوری طرح آگاہ تھا۔

(س) ..... اسلام آباد کے وقوعہ اور کوئٹہ کے دورہ میں حصول مقصد میں ناکامی کے بعد ان سرگرمیوں کا مرکز لاہور منتقل ہو گیا۔ میاں عباس نے غلام حسین اور دیگر ملزمان کے ذریعے منصوبہ بنایا جس کی روشنی میں قصوری کی کار پر اُس وقت حملہ کیا گیا جب وہ شادمان میں ایک شادی میں شرکت کے بعد اپنے گھر جا رہا تھا۔ زبردست پلاننگ کے تحت اس کی کار پر خود کار ہتھیاروں سے 30 روند فائر کئے گئے

www.bhutto.org

جس کے نتیجہ میں قصوری کا باپ مارا گیا شہادتوں سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ وہ حملہ ارشد اقبال افتخار رانا نے غلام حسین کی نگرانی میں طے کردہ منصوبہ کے مطابق کیا تھا۔

(ص) ...... ایف آئی آر میں جو قصوری نے اپنے باپ کی موت کے فوراً بعد درج کرائی ' واضح طور سے یہ بات لکھائی گئی کہ حملہ کی وجوہات سیاسی ہیں۔ یہ کہ اُس پر اس طرح کا ایک حملہ پہلے بھی اسلام آباد میں ہو چکا ہے۔ اس نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ جون 1974ء میں اس کے اور بھٹو کے مابین تو تکار ہوئی تھی۔

(ط) ...... جائے وقوعہ سے ملنے والے 24 خولوں کے کیلیبر سے ظاہر ہوا کہ وہ 7 62 ملی میٹر بور کے تھے۔ اور ان پر پی۔ بی مارکنگ یعنی 661/71 موجود تھی جیسی کہ اسلام آباد کے وقوعہ میں بر آمد ہونے والے چلے ہوئے کارتوسوں پر درج تھی۔ بہر حال اس کیس کی تفتیش میں بوجوہ کوئی خاص پیشرفت نہیں ہوئی۔

(ع) ...... قصوری کے مطالبہ پر حکومت پنجاب نے لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس شفیع الرحمٰن کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی ٹربیونل قائم کیا تاکہ وہ واقعہ پوری طرح چھان بین کرے مگر اس ٹربیونل کی رپورٹ کو اس لئے شائع نہیں کیا گیا کہ اپیلانٹ نے صوبائی حکومت کو ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ بعد میں ٹربیونل کی اصل رپورٹ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ تاہم وزیر اعلیٰ پنجاب کی طرف سے وزیر اعظم کو لکھے گئے ایک مراسلہ کی نقل میں ٹربیونل کے اخذ کردہ نتائج (   ) اور فیصلہ کا خلاصہ ہاتھ لگا! اس مراسلہ سے ان ہدایات کا بھی پتہ چلا جو ٹربیونل نے کیس کی مزید تفتیش کے سلسلہ میں دی تھیں۔ تاہم بعد کی تحقیقات سے کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ یکم اکتوبر 75ء کو صوبائی حکومت نے عدم دستیابی سراغ کی بناء پر مقدمہ کو داخل دفتر کر دیا۔

(ف) ...... اس دوران قصوری انصاف کی دہائی دیتا رہا اور وزیر اعظم کے استعفیٰ کا اس بناء پر مطالبہ کرتا رہا کہ جب تک وہ برسراقتدار ہے اسے انصاف نہیں مل سکتا۔ لاہور اور اسلام آباد کی وارداتوں میں استعمال کئے گئے ایمونیشن میں یکسانیت پائے جانے کے باوجود بھٹو کے چیف سیکورٹی افسر سعید احمد خان اور اس کے معاون باجوہ نے تفتیش کو ایف ایس ایف کی سمت میں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ پنجاب پولیس کے سینئر حکام عبدالوکیل خان (ڈی آئی جی) محمد اصغر خان (ایس ایس پی) اور ملک محمد وارث (ڈی ایس پی) نے بھی تصدیق کی کہ وہ کیس کی تفتیش کرنے میں آزاد نہیں تھے سعید احمد خان اور اس کا معاون زبردست مداخلت کر رہا تھا۔

(ق) ...... 5ر جولائی 77ء کو مارشل لاء لگنے کے بعد یہ مقدمہ از سرِ نو شروع ہوا تو پتہ چلا کہ سعید احمد خان اور اس کے معاون کی مداخلت کے کافی دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ شفیع الرحمٰن ٹربیونل کی رپورٹ کی ایک نقل بھی ہاتھ لگی جو پنجاب کے چیف سیکرٹری نے سعید احمد خان کو بھیجی تھی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ سعید احمد خان اور باجوہ تحقیقات کے دوران اور بعد میں بھی اکثر لاہور آتے جاتے رہے۔ سعید احمد خان

www.bhutto.org

شہادت سے، جس کی تائید متعلقہ دستاویزات سے ہوتی ہے، ثابت ہوا کہ وہ سب کچھ بھٹو کی ہدایات کے تحت کیا گیا۔ اسے تفتیش کی روز مرہ رفتار سے پوری طرح باخبر رکھا جارہا تھا۔

(ل) ..... یہ ثابت کرنے کے لئے ضخیم زبانی اور دستاویزی شہادتیں موجود ہیں کہ واقعہ قتل کے بعد بھی قصوری کی کڑی نگرانی کی جاتی رہی۔ سعید احمد خان اور باجوہ اُس کی سرگرمیوں کے بارے میں باقاعدہ رپورٹیں پیش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ قصوری کے گن مین کا حلیہ اور اس کی شناخت بھی ریکارڈ پر لائی گئی۔

(م) ..... بھٹو نے آخری مرحلہ میں کوشش کی کہ قصوری کو پی پی میں واپس لایا جائے یہ ذمہ داری سعید احمد خان اور باجوہ کو سونپی گئی۔ ریکارڈ پر موجود ڈھیر ساری دستاویزات ثابت کرتی ہیں کہ مذکورہ بالا دونوں تجربہ کار اور منجھے ہوئے پولیس افسر بڑی باریک بینی اور محتاط طریقے سے اپنے مقصد کے حصول میں کوشاں رہے اور اپنے سے بہت ہی کم عمر شخص (قصوری) کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے کہ اُس کے مستقبل کا نیز اُس کی اپنی اور اس کے خاندان کی زندگی کا دارومدار بھٹو سے صلح کرنے میں پوشیدہ ہے۔ ان دستاویزات کے محتاط اور تفصیلی مطالعہ کے بعد مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ وہ جملہ اقدامات بھٹو کے ایماء پر کئے گئے ورنہ سعید احمد خان اور باجوہ کے قصوری کے پاس بار بار جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان سرگرمیوں کے نتیجہ میں بالآخر قصوری دوبارہ پی پی میں شامل ہوگیا اور اس پر چھوٹی موٹی نوازشات ہونے لگیں۔ چنانچہ اسے میکسیکو جانے والے پارلیمانی وفد میں شامل کیا گیا۔ قصوری نے اپنی شہادت میں زور دیکر یہ بات کہی کہ اس نے یہ سب کچھ حفاظتِ خود اختیاری کے تحت کیا تھا۔ بھٹو کا مابعد رویہ کے یہ جملہ افعال قانونِ شہادت کی دفعہ 8 کے تحت متعلقہ ہیں اور اپیلانٹ کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔

927 ..... اس ساری زبانی و تحریری شہادت کا مجموعی حاصل یہ ہے کہ اس سے بھٹو کی طرف سے محرک کی فیصلہ کن موجودگی نیز اس کے اور مسعود محمود، غلام حسین و غلام مصطفیٰ وغیرہ کے مابین قصوری کے خلاف مجرمانہ سازش ثابت ہوتی ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ یہ کام ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل کو سونپا گیا اور مختلف افسران کو آمادہ کیا گیا کہ وہ خود کار ہتھیاروں کے استعمال سے اس سازش کی تکمیل کریں۔

928 ..... یہ درست ہے کہ کیس کی زیادہ تر شہادتیں ملک میں مارشل لاء لگنے کے بعد جمع کی گئیں۔ تاہم میں مطمئن ہوں کہ مسعود محمود، سعید احمد خان، ایم آر ویلچ، عبدالوکیل خان اور محمد اصغر خان جیسے سینئر حکام کا پورا اجتماع محض حکومتی دباؤ کے تحت سابق وزیراعظم کے خلاف جھوٹی گواہیاں دینے کے لئے میدان میں نہیں آیا تھا۔ مسعود محمود اور سعید احمد خان کو بھٹو کے ماتحت خصوصی پوزیشن حاصل تھی وہ اس کے پورے عرصۂ اقتدار میں 5 جولائی 77ء تک اس کے بہت ہی قریب رہے تھے۔

www.bhutto.org

ان کی سنیارٹی ' عمر ' تجربہ ' بھٹو کے ساتھ قریبی تعلق اور اس کی طرف سے کی گئی نوازشات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے اتنی طویل جھوٹی شہادت گھڑی۔ اگر وہ سابق وزیر اعظم کو غلط طور پر پھنسانے کے لئے دباؤ میں آ گئے تھے تب بھی مجھے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ مسعود محمود 'ایم آر ویلچ ' غلام حسین 'امیر باد شاہ اور فضل علی جیسے لوگوں نے میاں عباس کو اس کیس میں غلط طور پر ملوث کر لیا۔ یہ حالات ان کی شہادت کی توثیق کرتے ہیں ' جس کی کافی تائید اُس دور کی دستاویزات سے میسر آتی ہے۔ جن کے حوالے پہلے دیئے جا چکے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ یہ درست ہے کہ اقبالی ملزمان میں سے بعض نے چار سے چھ ہفتے تک نظر بند رہنے کے بعد اقبال جرم پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ تاہم یہ اہم حال اس صورت میں غیر متعلقہ بن جاتا ہے کہ وعدہ معاف گواہوں نے عدالت میں پیش ہو کر شہادت دینے اور جرح کا نشانہ بننے کی حامی بھر لی۔ وعدہ معاف گواہوں کی شہادت قبول نہیں کی جا سکتی تھی اگر مناسب طور سے اس کی قوی تائید میسر نہ آتی مقدمہ ہذا میں اس شرط کو ضرورت سے بڑھ کر پورا کیا گیا ہے۔

929...... یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اس مقدمہ کا اندراج بہت عرصہ پہلے یعنی 11 ر نومبر 74ء کو علی الصبح کرایا گیا تھا۔ اُس موقع پر قصوری نے کھل کر بھٹو کا نام لیا تھا۔ اسلام آباد اور لاہور کے واقعات میں استعمال ہونے والے ایمونیشن میں یکسانیت ثابت ہو جانے اور ہر دو وارداتوں میں ایف ایس ایف سے کام لئے جانے کی بابت نشاندہی کے باوجود دونوں مقدمے اس بناء پر داخل دفتر کر دیئے گئے کہ اُن کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس امر کی وضاحت نہیں کی گئی کہ کیس کی آزادانہ تفتیش کی اجازت کیوں نہیں دی گئی۔ صرف ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ بھٹو نے یقیناً بھانپ لیا تھا کہ اگر تفتیش کرنے والے ہاتھ ایف ایس ایف تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو مسعود محمود سارے راز کو فاش کر دے گا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ ماہرانہ رپورٹیں جن کے قابل ادخال ہونے پر صفائی نے اعتراض کیا ' وہ دو مختلف اضلاع یعنی اسلام آباد اور لاہور کے پولیس افسروں نے ایک ہی ایجنسی یعنی انسپکٹوریٹ آف ' آرمامینٹس جی ایچ کیو راولپنڈی۔ سے حاصل کی تھیں ان کے قانونی طور پر قابل ادخال ہونے سے قطع نظر جو ساعت کی اغراض کیلئے ایک تکنیکی ضرورت تھی۔ دونوں واقعات کی تفتیش پر مامور افسران کو اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ بر آمد ہونے والے خول 62 7 ایم ایم کے خود کار چینی ساخت کے ہتھیاروں سے فائر کئے گئے تھے۔ اتنی بیش قیمت معلومات حاصل ہو جانے کے باوجود تفتیش کا رخ ایف ایس ایف کی سمت میں آگے بڑھانے کیلئے سرے سے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اقبال کرنے والے شریک ملزمان اور وعدہ معاف گواہ ایسی چھان بین میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتے تھے۔

930...... اندریں حالات اس استدلال کی حمایت نہیں کی جا سکتی کہ بھٹو کے خلاف یہ مقدمہ

www.bhutto.org

سیاسی وجوہات کی بناء پر بنایا گیا ہے۔ یا یہ کہ اس کے پس پشت کوئی کوئی بین الاقوامی سازش کار فرما ہے جبکہ حقیقت میں یہ مقدمہ اپیلانٹ کی اقتدار سے معزولی سے قریباً تین سال پیشتر درج کرایا گیا تھا۔ حملہ آوروں کی ممکنہ شناخت کیلئے واضح اشارے دستیاب ہونے کے باوجود نہ صرف دونوں وارداتوں میں استعمال کئے گئے اسلحہ کی نوعیت کی شکل میں بلکہ شفیع الرحمٰن ٹریبونل کی رپورٹ میں تفتیش کو جان بوجھ کر مضحکہ خیز بنانے کی اجازت دی گئی۔ پس یہ دعویٰ بیکار محض ہے کہ اپیلانٹ کو اس مقدمہ میں سیاسی وجوہ کی بناء پر ملوث کیا گیا ہے یا یہ کہ دراصل یہ کیس بین الاقوامی سازش کا شاخسانہ ہے۔

اپیل کا فیصلہ

سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت کا باقاعدہ آغاز 20 مئی 78ء سے ہوا تھا اور اس کا فیصلہ 6 فروری 79ء کو سنایا گیا۔ فیصلہ کی بابت سات ججوں پر مشتمل بنچ میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ اکثریتی گروپ چیف جسٹس کے علاوہ جسٹس محمد اکرم، جسٹس کرم الٰہی چوہان اور جسٹس نسیم حسن شاہ پر مشتمل تھا جبکہ اقلیتی گروپ میں جسٹس محمد حلیم، جسٹس دراب پٹیل اور جسٹس جی صفدر شاہ شامل تھے۔ بنیادی فیصلہ چیف جسٹس نے لکھا اور اُن کے گروپ کے باقی تین ججوں نے اس سے اتفاق کیا۔ اقلیتی گروپ کے ہر سہ ججوں نے الگ الگ اختلافی فیصلہ لکھا۔ اپیل کا فیصلہ مجموعی طور پر فل سکیپ سائز کے 1495 صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں سے 825 صفحات اکثریتی گروپ نے لکھے جبکہ باقی 670 اقلیتی گروپ کے لئے وقف تھے۔

سزائیں بحال رکھی گئیں

چیف جسٹس انوار الحق کی سرکردگی میں اکثریتی گروپ کا جو فیصلہ صادر کیا گیا اس میں کہا گیا تھا۔

"دونوں وعدہ معاف گواہوں کی شہادت کے تفصیلی اور جامع جائزہ کے بعد جس کی تائید میں خاصی زبانی و تحریری شہادتیں موجود ہیں مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ استغاثہ نے اپنا دعویٰ بڑی کامیابی سے ثابت کر دکھایا ہے یعنی سازش کا وجود سازشیوں کی شناخت اور یہ امر واقعہ کہ قصوری کے باپ کی موت مذکورہ بالا سازش کا اظلب نتیجہ تھی۔ ان نتائج اور تحقیقات کی بنیاد پر اپیل کنندگان کے خلاف جو اثباتِ جرم اور سزائیں قلمبند کی گئیں وہ پوری طرح جائز ہیں۔ بجز اس کے کہ بھٹو، میاں محمد عباس اور غلام مصطفیٰ کے معاملہ پر میرے نزدیک تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 301 کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ مذکورہ دفعہ صرف حقیقی قاتلوں پر اطلاق پذیر ہے۔ اس مقدمہ میں ایسے ملزم ارشد اقبال اور رانا افتخار ہیں۔"

تینوں اپیلیں خارج کر دی گئیں

اپیلوں کے سلسلہ میں عدالت کا درج ذیل حکم پڑھ کر سنایا گیا۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو بنام سرکار

....

اکثریت کی رائے کے مطابق یہ اپیل خارج کی جاتی ہے۔ ہائیکورٹ کی طرف سے اس سلسلہ میں قلبند کردہ اثبات جرم اور سزائیں بحال رکھی جاتی ہیں اور ان کی توثیق کی جاتی ہے۔ بجز اس کے اپیل پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ 301 کا اطلاق نہیں ہو گا۔

میاں محمد عباس بنام سرکار

....

اکثریت کی رائے کے مطابق یہ اپیل خارج کی جاتی ہے نیز ہائیکورٹ کی طرف سے دی گئی سزائیں بحال رکھی جاتی ہیں اور اُن کی توثیق کی جاتی ہے۔ سوائے اس کے کہ اپیل پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ 301 کا اطلاق نہیں ہو گا۔

غلام مصطفیٰ و دیگران بنام سرکار

....

عدالت کی متفقہ رائے کی مطابقت میں یہ اپیل خارج کی جاتی ہے۔ تینوں اپیل کنندگان کو ہائیکورٹ کی طرف سے سنائی گئی سزائیں بحال رکھی جاتی ہیں اور اُن کی توثیق کی جاتی ہے۔ سوائے اس کے کہ غلام مصطفیٰ پر تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 301 لاگو نہیں ہو گی۔

درج بالا حکم چیف جسٹس نے خود پڑھ کر سنایا۔ اس وقت بھٹو یا قصوری خاندان کا کوئی فرد عدالت میں موجود نہیں تھا۔ البتہ عبدالحفیظ پیرزادہ موجود تھے۔

اختلاف کرنے والے ججوں یعنی جسٹس محمد حلیم، جی صفدر شاہ اور دراب پٹیل نے بھٹو کو بے گناہ ٹھہرا کر تمام الزامات سے بری کیا تھا۔ ان تینوں نے اپنے الگ الگ فیصلہ میں بھٹو کی اپیل منظور کرنے اور انہیں بری کرنے کے حق میں جو دلائل دیئے ان پر ہم نے آئندہ باب میں بحث کی ہے۔ کیونکہ اُن کے دلائل بڑے مفصل اور جامع ہیں اور ہمارے اس نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں کہ ہائیکورٹ میں بھٹو کیس کی سماعت منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انداز میں نہیں ہوئی تھی اور اس پر شخصی عناد و تعصب کے گہرے پردے پڑے ہوئے تھے۔

گیارھواں باب

بری کرنے والے ججوں کے فیصلے

سپریم کورٹ نے اپیل کے فیصلہ کا اعلان 6 ر فروری 1979ء کو منگل کے دن صبح گیارہ بجے کیا۔ چیف جسٹس نے پورے فیصلہ کا ایک مختصر خلاصہ پڑھ کر سنایا جو ایک صفحے پر مشتمل تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ تینوں اپیلیں نامنظور کر دی گئی ہیں یعنی ہائیکورٹ کی دی گئی سزاؤں کو بحال رکھتے ہوئے اُن کی توثیق کر دی گئی۔ فیصلہ منقسم نوعیت کا تھا۔ چار جج سزا کے حق میں اور دوسرے تین بھٹو کو بری کرنے کے حق میں تھے۔ اول الذکر اکثریتی گروپ چیف جسٹس انوار الحق، جسٹس محمد اکرم، جسٹس کرم الٰہی چوہان اور ڈاکٹر نسیم حسن شاہ پر مشتمل تھا۔ آخر الذکر اقلیتی گروپ میں جسٹس دراب پٹیل، محمد حلیم اور جی صفدر شاہ شامل تھے۔ اعترافِ جرم کرنے والے تین ملزمان کی اپیلیں متفقہ طور پر نامنظور کر دی گئی تھیں کیونکہ وہ آخر تک اپنے اقبالِ جرم پر قائم رہے تھے۔ جن ججوں نے فیصلہ کی مخالفت کی اور بھٹو کو قطعی طور پر بری کرنے کی رائے دی اُن کے فیصلے اس قابل ہیں کہ ان کے فیصلوں کا خلاصہ نذرِ قارئین کیا جائے تاکہ بریت کے حق میں اُن کے دلائل کے قانونی وزن اور اُن کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

1..... جسٹس دراب پٹیل کا فیصلہ

جسٹس دراب پٹیل کا فیصلہ اقلیتی گروپ کے 670 صفحات میں سے 221 صفحات پر محیط تھا۔ انکے ہم خیال جی صفدر شاہ نے 441 صفحے سپردِ قلم کئے تھے۔ بقیہ چند صفحے جسٹس محمد حلیم نے لکھے۔ جسٹس دراب پٹیل کے فیصلہ میں کہا گیا تھا کہ مسٹر بھٹو کے خلاف استغاثہ کے دعویٰ کا انحصار مسعود محمود اور

www.bhutto.org

غلام حسین کی شہادتوں پر ہے چونکہ یہ دونوں وعدہ معاف گواہ ہیں اس لئے ان کی شہادتوں کو تائیدی شہادت کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے استغاثہ نے وجہِ تحریک کے بارے میں مسٹر قصوری کی گواہی اور مسٹر بھٹو کے طرزِ عمل سے ملنے والی شہادت پر انحصار کیا۔ استغاثہ کے بقول مسٹر بھٹو نے قتل سے پہلے اور بعد میں بھی قصوری کی کڑی نگرانی کرائی تھی اور اس لئے بھی کہ اُس نے قتل کی تفتیش میں مداخلت کی تھی۔ تاہم محرک کی بابت گواہی ہمیشہ کمزور نوعیت کی تائیدی شہادت ہوتی ہے۔ اور تفتیش میں مداخلت سے قطع نظر بھٹو کے مابعد رویہ کی بابت استغاثہ نے جو شہادت پیش کی وہ بھی مشکوک نوعیت کی ہے۔ اس کی مختلف تعبیر و توضیح کی جا سکتی ہے پس وہ کوئی تائیدی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ اس لئے وکیل استغاثہ مسٹر بٹالوی نے تفتیش میں کی گئی مداخلت پر بہت زیادہ انحصار کیا لیکن اس الزام کے اثبات میں جن گواہوں کے بیان لئے گئے وہ پولیس افسر تھے جن کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے تفتیش میں ایسے مؤثر طریقہ سے مداخلت کی کہ مقدمہ کو عدم سراغ یابی کی بناء پر داخل دفتر کرنا پڑا۔ اس کا مطلب یہ ہوا وہ پولیس افسر بھی شریکِ جرم تھے۔ ہائیکورٹ نے اپنے فیصلہ میں ان کی شہادتوں پر بہت زیادہ بھروسہ کیا ہے۔ اس لئے مسٹر بختیار نے اعتراض کیا کہ شریکِ جرم وعدہ معاف گواہ کی تائید نہیں کر سکتا اس لئے ہائیکورٹ کا فیصلہ قرینِ انصاف نہیں جبکہ بٹالوی کا اصرار تھا کہ پولیس افسران شریکِ جرم نہیں تھے۔ انکی حیثیت معین بعد وقوعِ جرم کی تھی۔ میں مسٹر بختیار کے اس موقف سے اتفاق کرتا ہوں کہ پولیس افسران اپنے اعترافات کی رو سے ضابطہ فوجداری کی دفعہ 201 کے تحت شریکِ مجرم تھے اور لاہور ہائیکورٹ کے فاضل ججوں نے احترام کے ساتھ کہوں گا اس نکتہ پر صحیح نتیجہ اخذ نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں فاضل جج نے متعدد فیصلوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ثابت کیا کہ شریک مجرموں کی گواہی ناقابل اعتبار ہوتی ہے، سلطانی گواہ ایسا شریک جرم ہوتا ہے جسے معافی مل چکی ہوتی ہے۔ استغاثہ نے دو وعدہ معاف گواہوں کی شہادت پر انحصار کیا ہے لیکن میں اس کے اس مؤقف سے اتفاق نہیں کرتا کہ وعدہ معاف گواہ کی شہادت دوسرے شریک مجرموں سے بلند تر درجہ کی اور قابلِ اعتبار ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا مقدر سماعت کے اختتام تک غیر یقینی ہوتا ہے۔ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 339 کے تحت اسے دی گئی معافی کسی بھی وقت منسوخ کی جا سکتی ہے چنانچہ چیف جسٹس نے نگاانگ بنام ایمپیرر (اے آئی آر 1937 رنگون 209) نے بجا طور پر اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر شریک مجرم وعدہ معاف گواہ ہو اور معافی کے واضح وعدہ کے تحت گواہی دے رہا ہو تو وہ لازماً استغاثہ کے حق میں گواہی دے گا اور سچائی کی حدود سے تجاوز کر جائے گا۔ میں اس رائے سے متفق ہوں۔ وعدہ معاف گواہ کی شہادت دوسرے شریک مجرم کی گواہی سے 'جو وعدہ معاف گواہ نہ ہو' زیادہ داغدار ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس عدالت نے اسحاق بنام تاج (پی ایل ڈی 1954ء 'ایف سی 335) نامی مقدمہ میں قرار دیا تھا۔

ب میں بعض دوسرے حالات کو لیتا ہوں جو شریک مجرموں کی شہادت قبول کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے سامنے قتل کا مقدمہ پیش ہے۔ اگرچہ قتل ایک سنگین جرم ہے اس کے باوجود آئے دن قتل پہ قتل ہوتے رہتے ہیں اور معاشرہ نے قتل سے جو خباثت وابستہ کر رکھی ہے وہ شریک مجرموں

www.bhutto.org

کی راست گوئی سے غیر متعلقہ ہے۔ ایک ان پڑھ دیہاتی کیلئے یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ اسے اس کے سردار' وڈیرے یا سرکاری افسر نے ارتکاب جرم پر مجبور کر دیا تھا۔ تاہم ایک تعلیم یافتہ شخص کا' جو اعلیٰ منصب پر فائز ہو یہ کہنا کہ اُس پر اس کے سینئر افسر نے دباؤ ڈالا تھا' بالکل مختلف بات ہے اور موجودہ کیس میں مسعود محمود کا ایسا ہی دعویٰ ہے۔

اگر استغاثہ عدالت کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ شریک مجرم کی شہادت کیلئے ٹھوس تائید و مطابقت ضروری نہیں کیونکہ اُسے جبر یا دباؤ کے تحت ارتکاب جرم پر مجبور کر دیا جاتا ہے تو اس کا بارِ ثبوت استغاثہ کے ذمہ ہے۔ شریک جرم کی گواہی کو بیّن اور روشن دلائل کی بناء پر ناقابلِ اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ اگر عدالت شریک مجرم کے اس بے دلیل بیان کو قبول کر لے کہ اسے ڈرا دھمکا کر جرم کا ارتکاب کرایا گیا تھا تو یہ اس اصول کو جھٹلانے کے مترادف ہو گا کہ شریک مجرم کی شہادت ٹھوس تائید کئے بغیر قبول نہیں کرنی چاہئے۔ ہندو پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں نے اس مسلمہ اصول کی ہمیشہ پیروی اور پاسداری کی ہے کہ "کوئی شریک مجرم خود اپنی تائید آپ نہیں کر سکتا۔ داغدار شہادت کو بار بار دہرانے سے اُس کے داغ دور نہیں ہو جاتے" نتیجتاً میں قرار دیتا ہوں کہ ٹیکنیکل جرائم کے سوا' جن میں مجرمانہ ضمیر وابستہ نہیں ہوتا' شریک مجرموں (جن میں وعدہ معاف گواہ بھی شامل ہیں) کی شہادت تائید کے بغیر ہرگز قبول نہیں کرنی چاہئے۔ اگر تائید کے اصول کو رشوت ستانی کے مقدمات میں نرم نہیں کیا جا سکتا' جیسا کہ وسیم الدین بنام سرکار (پی ایل ڈی 1961 ڈھاکہ 798) میں جسٹس حمود الرحمٰن نے قرار دیا تھا۔ تو سنگین جرائم میں اسے نرم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور موجودہ کیس سنگین جرائم میں سے ایک ہے۔

یہاں میں وضاحت کے ساتھ یہ کہوں گا کہ ہمارے سامنے مسٹر بٹالوی کی معروضات میں سے ایک یہ ہے کہ بھٹو کے علاوہ کوئی اور قصوری کے قتل کا محرک نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے مسعود محمود کی شہادت انتہائی غالب احتمالات پر مشتمل ہے اور ہمیں اس بناء پر اسے قبول کر لینا چاہئے۔ جسٹس عبدالرشید نے منگل سنگھ بنام ایمپرر (اے آئی آر 1934 لاہور 346) میں اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ :-

"کسی سزایابی کی بنیاد وعدہ معاف گواہ کی شہادت پر نہیں ہونی چاہئے۔ جب تک اہم کوائف میں ایسی آزادانہ گواہی سے اس کی تائید میسر نہ آ جائے جس کے ذریعے مجرموں میں سے ہر ایک کو ارتکابِ جرم میں ملوث کیا جا سکے"۔

برِصغیر کی بائی کورٹس میں سے یہ پہلا فیصلہ تھا جس میں شریک جرم کی شہادت کیلئے آزادانہ تائید کے اصول کو ایک دستور العمل کی شکل دی گئی۔ اس سلسلہ میں غلام قادر بنام سرکار (پی ایل ڈی 1959 ایس سی 377) نامی فیصلہ میں کی گئی تنبیہ کا حوالہ دینا بھی کار آمد ہو گا۔

"شریکِ جرم کی شہادت میں قصوروار کو بے گناہ سے بدل دینے کا خطرہ ہمیشہ موجود رہتا ہے اور یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اعترافِ جرم کرنے والے گواہ کے بیان پر یقین کرنا انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ جو اپنی جان بچانے کی غرض سے اس حد تک جھوٹ بول سکتا ہے کہ دوسروں کے کہنے میں آ کر کسی اصل مجرم کی

www.bhutto.org

جگہ جس کے لئے وہ نرم گوشہ رکھتا ہو ایسے شخص کو پھنسادے جس کا جرم سے دُور کا واسطہ بھی نہ ہو"۔

پس شریک مجرموں کی شہادت کے متعلق ضابطہ بالکل واضح ہے۔ اس کے باوجود مسٹر بٹالوی نے استدعا کی کہ عدالت اس اصول میں لچک پیدا کرے' میں رمضان علی بنام سرکار (پی ایل ڈی 1967 ایس سی 545) میں جسٹس حمود الرحمٰن کے ظاہر کردہ ملاحظات کی روشنی میں خود کو اس قابل نہیں پاتا کہ اس اصول میں کوئی لچک پیدا کروں۔

اس بحث کی روشنی میں میں اب مسعود محمود کی شہادت کا جائزہ لیتا ہوں جس نے معاشرہ میں معروف سنگین ترین جرائم میں سے ایک جرم قتل میں اپنے ملوث ہونے کا اعتراف کیا ہے اور استغاثہ کے بقول یہ کسی ظالم شخص کا نہیں بلکہ ایک سفاک و مستبد شخص کے ایماء پر ایک عام آدمی کا قتل تھا جو آمر پر تنقید کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ مسعود کی شہادت ظاہر کرتی ہے کہ اس نے قصوری کے اقدام قتل میں حصہ لیا۔ اس لئے اس کی گواہی کو مضبوط تائید کے بغیر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ہائی کورٹ کا اختیار کردہ یہ مؤقف کہ اسے قتل میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا گیا تھا میرے لئے قابل قبول نہیں' کسی سیاستدان کو جو مسٹر قصوری کی طرح مشہور ہو' قتل کرنا کھیل نہیں ہوتا' بھٹو نے وعدہ معاف گواہ کو جو مشن سونپا وہ انتہائی نازک تھا۔ یہ بھٹو کی بڑی حماقت ہوتی اگر وہ مسعود کو ایسا نازک مشن قبول کرنے پر مجبور کرتا' اس پر مستزاد' وعدہ معاف گواہ کے بقول وہ مشن میاں عباس کو پہلے ہی سونپا جاچکا تھا۔ میں ادب کے ساتھ جسٹس منیر کی ظاہر کردہ اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں جس کا اظہار انہوں نے عبدالقادر بنام سرکار (پی ایل ڈی 1965 ایس سی 407) میں صفحہ 413 پر کیا ہے اور قرار دیتا ہوں کہ آزادانہ تائید کے بغیر مسعود محمود کی گواہی قابل نہیں کی جاسکتی۔

وعدہ معاف گواہ نے اعتراف کیا کہ اسے اس دن حراست میں لیا گیا جس روز ملک میں مارشل لاء لگا اور اس کا قبائی بیان قریباً دو ماہ قید میں رہنے کے بعد قلمبند کیا گیا تھا۔ اس مدت کے دوران اُسے زیادہ تر قید تنہائی میں رکھا گیا اور یہ کہ اُس سے مارشل لاء حکام کی ایک ٹیم نے پوچھ گچھ کی تھی۔ اُس پر اس ایمائی سوال کے ساتھ جرح کی گئی کہ اس نے سینھ عابد جو کہ اس کا چچازاد بھائی اور بہنوئی بھی تھا کی رہائی کیلئے پولیس سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ اس نے صفائی کے تابڑ توڑ حملوں سے تنگ آکر تسلیم کیا کہ سینھ عابد 5 رجولائی 77ء سے قبل قانون کی نگاہوں میں بھگوڑا تھا اور نفاذِ مارشل لاء کے بعد وطن لوٹ آیا تھا۔ اس پس منظر میں جب اس سے سوال کیا گیا کہ سینھ عابد مذکورہ بالا گٹھ جوڑ کے ایک جُز کے تحت وطن لوٹا اور دوسرے جز کے تحت اسے وعدہ معاف گواہ بنایا گیا جس کے عوض وہ بھٹو کو قتل کے مقدمہ میں پھنسانے پر آمادہ ہو گیا تو اُس نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ میں مسٹر بٹالوی کے اس نکتہ سے اتفاق کرتا ہوں کہ صفائی کے وکلاء پولیس' سینھ عابد اور سلطانی گواہ کے مابین طے پانے والے اس ناپاک گٹھ جوڑ کو ثابت کرنے میں ناکام رہے۔ بہرحال یہ حقیقت واضح ہے کہ ان حالات میں جو طویل نظربندی کے دوران مسعود کو پیش آئے' شروع میں بہت ہی کٹھن محسوس ہوئے ہوں گے۔ چونکہ مارشل لاء محض امن و امان قائم کرنے اور

www.bhutto.org

انتخابات کروانے کیلئے نافذ کیا گیا تھا' ظاہر ہے وعدہ معاف گواہ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا' اُس کے پیش نظر یہ سوچا ہو گا کہ اس کے خلاف سنگین الزامات موجود ہیں۔ استغاثہ مسعود کی نظر بندی سے متعلق وجوہات کے بارے میں عدالت کو اعتماد میں لے سکتا تھا لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔اس سے واحد استنباط جو کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ وعدہ معاف گواہ کے خلاف انتہائی سنگین نوعیت کے الزامات تھے۔ اس سلسلہ میں میاں عباس کے اس بیان کا حوالہ دینا کار آمد ہو گا جو اس نے 21 رجولائی 77ء کو مارشل لاء حکام کے سامنے دیا تھا اور اس میں مسعود کے جملہ سیاہ افعال کی تفصیل پیش کی تھی۔ اس بیان کی روشنی میں یہ امکان موجود ہے کہ اُس کے خلاف ان جرائم میں مقدمہ چلایا جاتا' میں صرف اس قدر کہوں گا کہ مسعود کے خلاف یہ الزامات اُسی قدر سنگین تھے' جس قدر وہ الزامات جن میں اسے معافی دے دی گئی۔

افسوس ہے شہادت کا یہ پہلو ہائیکورٹ کے فاضل ججوں کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ چونکہ وعدہ معاف گواہ جھوٹی گواہی دینے کی قوی ترین ترغیب میں تھا تاکہ تفتیش کنندہ ایجنسی کی خوشنودی حاصل کر سکے' اس لئے اس کی شہادت کیلئے قوی تر تائید کی ضرورت ہے۔ یہاں ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو بجائے خود زیادہ اہم نہیں' مسٹر بٹالوی نے ڈیلیچ کی گواہی پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ایک سچا اور دیانتدار گواہ ہے کیونکہ اس نے قصوری کو کوئٹہ میں قتل کرنے کی بابت مسعود کے غیر قانونی احکام ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ چونکہ اس نے وعدہ معاف گواہ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اُس کے احکام کی تعمیل نہیں کی جائے گی اس لئے وکیل صفائی نے اس سے پوچھا وہ اس امر کی وضاحت کرے کہ اُس نے یہ بات مسعود کو کیوں نہیں بتائی تھی' ڈیلیچ نے جواب دیا۔

"ہر وہ شخص جس نے مسعود کے ساتھ کام کیا ہو سمجھتا تھا کہ بہتر چارہ کار یہ ہے کہ تردید کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی جائے۔ اگر میں اُس کی تجویز پر جرح کرتا تو اُسے اپنے خلاف کارروائی پر مجبور کر دیتا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ جو کچھ مجھے کہا گیا ہے افشا نہ ہونے پائے اگر میں اس کی بات نہ مانتا تو مجھے "غدار پاکستان" قرار دے کر میرے خلاف کارروائی شروع کرا دیتا۔ مجھے اپنی جان کی فکر نہیں تھی تاہم مسعود میرے خلاف مقدمہ بازی کی ترغیب دے سکتا تھا تاکہ جو کچھ اس نے مجھ سے کہا میں کسی سے اس کا ذکر نہ کروں' اور اگر کسی کو بتاؤں تو میری بات پر یقین نہ کیا جائے"۔

استغاثہ کی پیش کردہ شہادت کے مطابق مسعود محض وعدہ معاف گواہ نہیں تھا بلکہ ایسا گواہ تھا جسے کسی کے خلاف جھوٹی شہادت دینے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا۔ بشرطیکہ وہ شہادت اس کے موافق ہوتی۔

اب میں مسعود کی شہادت کے اس جز کو لیتا ہوں کہ وقار احمد نے اسے ایف ایس ایف کے ڈی جی کا عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس سلسلے میں مسٹر بختیار کی یہ دلیل وزن رکھتی ہے کہ بھٹو اتنا احمق نہ تھا کہ اُس قدر اہم منصب پر ایسے شخص کو بٹھا دیتا جو اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ وعدہ معاف گواہ کی شہادت جھوٹ سے شروع اور جھوٹ پر ختم ہوتی ہے۔ استغاثہ نے کوئی ایسی شہادت پیش نہیں کی جس سے ثابت

ہوتا ہو کہ مذکورہ پوسٹ کیلئے امیدواروں کی کمی تھی۔ نہ ہی مسعود میں کوئی خصوصی صلاحیت تھی۔ اس سلسلے میں دباؤ ڈالنے کے کیلئے باجوہ اور سعید احمد خان کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ باجوہ بیچارہ تو فوت ہو چکا ہے اور سعید احمد خان نے وعدہ معاف گواہ کے اس دعویٰ کی تائید نہیں کی کہ اس نے مسعود پر کوئی پریشر ڈالا تھا۔ اس لئے استغاثہ کے خلاف معکوس استنباط کرنا بالکل بجا ہے کہ اُس نے وقار احمد کو بطور گواہ کیوں پیش نہیں کیا۔ پس اس معاملہ میں وعدہ معاف گواہ کی شہادت قبول نہیں کی جا سکتی۔

مسعود محمود گواہ کا کہنا ہے کہ اس نے 23 ر اپریل 74ء کو ڈی جی ایف ایس ایف کا چارج لیا۔ اسکے بعد 3 ر جون 74ء کے واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ اس واقعہ کے "ایک یا دو دن بعد" مسٹر بھٹو نے مجھے بلایا اور ہمارے درمیان طویل ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے حوالہ سے یہ ثابت کرنا استغاثہ کا کام تھا کہ بھٹو نے مسعود کو سازش میں شامل ہونے کو کہا اور یہ کہ مسعود ویسا کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ جب بھٹو نے مسعود کو سازش میں شمولیت کی پیشکش ہی نہیں کی تو اُس کے قبول کرنے یا سازش کے وجود میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسعود کی اپنی شہادت بھی ثابت نہیں کرتی کہ بھٹو نے اُسے سازش کے معاہدہ میں شامل ہونے کو کہا تھا۔ اس لئے سرے سے کوئی سازش وجود میں نہیں آئی۔ اس کے بعد مسٹر بٹالوی نے سعید احمد خان کی شہادت کا ذکر کیا جس میں اس نے کہا ہے "1974ء کے وسط میں مسٹر بھٹو نے مجھ سے کہا کہ میں مسعود محمود کو اُس مشن کے بارے میں یاد دہانی کرا دوں جو اسے بھٹو کی طرف سے سونپا گیا تھا" آگے سعید احمد یہ بھی کہتا ہے کہ اُس نے وہ پیغام مسعود کو پہنچا دیا تھا اور وعدہ معاف گواہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ کام کر دیا جائے گا۔ فاضل وکیل کے بقول اس سے سازش کے بارے میں استغاثہ کے کیس کی تائید ہوتی ہے یہ ایک گمراہ کن دلیل ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ سعید احمد کی گواہی سچی ہے تب بھی اُس کی شہادت سے اس سوال پر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ آیا وعدہ معاف گواہ نے قتل کا ارتکاب مسٹر بھٹو کے حکم سے کیا تھا یا وہ قتل کی سازش میں بخوشی شریک ہو گیا تھا۔

اس سے آگے غلام حسین کی شہادت شروع ہوتی ہے میں نے اسکی شہادت کا بغور مطالعہ کیا اور جائزہ لیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے "اگست 74ء کے اوائل میں میاں عباس نے مجھے بلایا اور قصوری کے قتل کا حکم دیا کیونکہ ایف ایس ایف کے ڈی جی کی طرف سے ایسی ہی ہدایات دی گئی تھیں"

اس شہادت کی رو سے بھی مسٹر بھٹو نہیں پھنستے۔ گواہ کے بقول میاں عباس نے 20 ر اگست کو اسے دوبارہ طلب کیا اور قصوری سے متعلق مشن جلد پورا کرنے کی تاکید کی کیونکہ مسعود محمود اور وزیر اعظم بھی اُس (میاں عباس) پر اس سلسلے میں دباؤ ڈال رہے تھے۔ اُس کی شہادت سنی سنائی بات کے سوا کچھ نہیں جو قانون شہادت کی رو سے قابل ادخال نہیں ہوتی۔ فضل علی اور امیر بادشاہ کی گواہیوں کا بھی یہی حال ہے جن کا تعلق غلام حسین کو ایمونیشن جاری کرنے سے ہے۔ میں مناسب موقع پر ان کی شہادت کا محاکمہ کروں گا۔

ہائیکورٹ سعید احمد خان کی شہادت سے بڑی متاثر ہوئی کیونکہ اس کے نزدیک وہ ایک آزاد اور قابل

www.bhutto.org

اعتبار گواہ ہے۔ اس لئے میں اس امر کا جائزہ لیتا ہوں کہ آیا وہ واقعی ایک آزاد و خود مختار اور قابلِ اعتبار شاہد ہے۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ ایسا ہی ہے چونکہ مسعود محمود کی گواہی تضاد بیانیوں اور غلط بیانیوں سے بھری ہوئی ہے اس لئے سعید احمد کی شہادت اس کی تائید کیلئے کافی نہیں۔ یہ تائیدی شہادت میں رابطہ کا کام دے سکتی ہے۔

مسٹر بٹالوی نے ویلچ کی شہادت پر بھی بڑا بھروسہ کیا ہے۔ کیونکہ وعدہ معاف گواہ کا کہنا ہے کہ اس نے ویلچ کو قصوری کے قتل کی بابت ہدایات دی تھیں اور ویلچ نے اس بیان کی تائید کی ہے۔ اگر اسے سچ مان لیا جائے تو اس کی گواہی سے وعدہ معاف گواہ کی مسٹر بھٹو کے خلاف زیرِ دفعہ 107 ضابطۂ فوجداری شہادت کی تائید ہوتی ہے۔ وعدہ معاف گواہ نے ابتدائی سوال کے جواب میں جو کچھ کہا اس سے پتہ چلتا ہے کہ گواہ نے پہلے ویلچ کو فون پر مذکورہ بالا حکم دیا اور پھر کوئٹہ پہنچنے پر اسے یاد دہانی کرائی۔ اس کی شہادت پر سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بڑا تیز طرار اور انتہائی ذہین و فطین شخص تھا۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ اس نے قتل جیسے شنیع فعل کا حکم فون پر دیا ہو گا' ایک احمقانہ حرکت لگتی ہے۔ گواہ نے اسے فوراً بھانپ لیا کہ اس سے بھول ہو گئی ہے اس نے جرح میں بیان کو اس طرح بدل دیا کہ وہ جولائی 74ء میں مسٹر ویلچ سے ملا تھا۔ ملاقات کے دوران اُسے قصوری کی بابت حکم دیا اور اسلام آباد سے فون کر کے محض یاد دلایا تھا۔ بظاہر یہ استغاثہ کے کیس میں ایک اضافہ ہے۔ مسٹر بٹالوی نے اسے درست تسلیم کر لیا کہ وعدہ معاف گواہ نے جرح میں جو کچھ کہا اس سے ویلچ کی شہادت کی تائید ہو گئی ہے۔ تاہم وہ اس بات کو فراموش کر گئے کہ ویلچ کی شہادت مسعود کے بعد ریکارڈ کی گئی تھی اور اس نے یہ تسلیم کیا تھا کہ "میں مسٹر مسعود محمود کا بیان اخبارات میں پڑھتا رہا ہوں"۔ چونکہ ویلچ وعدہ معاف گواہ نہیں ہے۔ اس لئے اس کی گواہی کو مسعود کی شہادت پر ترجیح ملنی چاہئے جس کا مطلب یہ ہوا کہ مسعود نے انتہائی معاملہ فہم آدمی ہوتے ہوئے اپنے ماتحت کو جسے وہ اچھی طرح نہیں جانتا تھا' ایک سیاسی لیڈر کے قتل کا حکم دیا۔ میرے لئے یہ سب کچھ باور کرنا مشکل ہے۔ پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ وعدہ معاف گواہ کا یہ دعویٰ نہیں کہ اس نے وہ حکم وزیرِ اعظم کی ہدایات کے تحت دیا تھا اُس نے اس حکم کے دینے کی بابت اکیلے ذمہ داری قبول کی ہے اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ ویلچ کی گواہی کسی طرح مسٹر بھٹو کے خلاف زیرِ دفعہ 107 ضابطۂ فوجداری تائید کر سکتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ محض مسعود محمود کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔

میاں عباس نے شروع میں اقبالِ جرم کر لیا تھا پھر اپنے خلاف مقدمہ کی مزاحمت کرنے لگا اور اقبالی بیان سے منحرف ہو گیا۔ سپریم کورٹ میں اپیل کے دوران پھر اپنے اعتراف کو درست تسلیم کر لیا۔ اس پس منظر میں بٹالوی نے گزارش کی کہ ہم اسے اس کے اقبالِ جرم کی روشنی میں سزایاب کریں کیونکہ اُس کے اقبال کی دیگر شہادتوں سے تائید ہوتی ہے۔ بلاشبہ اقبالی بیان پر سزایابی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کی تائید ہو جائے۔ میاں عباس کا اقبالی بیان بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ قصوری کے قتل کا حکم مسعود

www.bhutto.org

نے دیا تھا۔ بھٹو نے نہیں۔ اور یہ کہ مسعود نے قصوری کو قتل کرانے کے منصوبہ پر عمل کا فیصلہ 13/ مئی 74ء کو کر لیا تھا یعنی 3/ جون 74ء کے واقعہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ استغاثہ کے کیس کی ان دو متضاد روایتوں میں سے کون سی قابل ترجیح ہے اس کا فیصلہ کرنا خود استغاثہ کا کام ہے۔ غلام حسین نہ صرف ایک وعدہ معاف گواہ ہے بلکہ میری نظر میں انتہائی بد دیانت اور جھوٹا شخص ہے۔ میں اس کی شہادت کو بلا جھجک مسترد کرتا ہوں۔ میں مسعود کے اس دعویٰ کو بھی تسلیم نہیں کرتا کہ "میں غلام حسین کو نہیں جانتا تھا"۔ کیونکہ قتل جیسے جرم کی تکمیل کا مشن کسی اجنبی کو نہیں سونپا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں' میں ہائیکورٹ کے فاضل جج کے ملاحظات سے بھی اتفاق نہیں کرتا۔ مسعود اور غلام حسین دونوں وعدہ معاف گواہ ہیں وہ ایک دوسرے کی تائید نہیں کر سکتے پھر ان کی شہادت عاشق حسین لودھی کی گواہی سے متصادم ہے جس کا کہنا ہے کہ مسعود جب کبھی قومی اسمبلی میں آتا تھا غلام حسین اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر راز کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لودھی کی یہ شہادت دونوں گواہوں کے قول کی تردید کرتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ تھے۔ اس لئے ہائیکورٹ نے اُسے مسترد کر دیا جبکہ میرے نزدیک وہ ایک سچا گواہ ہے۔ استغاثہ نے اُس کی راست گوئی کو جھٹلانے والی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اس کے برعکس دونوں وعدہ معاف گواہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔

وقوعۂ اسلام آباد کے بارے میں مسعود محمود کا یہ کہنا کہ اُس نے اس کے متعلق اڑتی سی خبر سنی تھی' سراسر جھوٹ ہے یہ ممکن نہیں کہ وقوعہ کی ناکامی کے بعد اس نے اس سلسلہ میں مکمل معلومات حاصل نہ کی ہوں۔ 10/ نومبر 74ء کے واقعہ قتل کی بابت وہ کہتا ہے کہ اس کی خبر مسٹر بھٹو نے فون پر اُسے دی تھی۔ اُس کے ڈرائیور منظور حسین کی گواہی سے سارے واقعہ کی تردید ہوتی ہے پھر قتل جیسے واقعہ کی صبح سویرے فون پر اطلاع دینے کی روایت بھی ناقابل فہم ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کی یہ ساری گواہی جھوٹی ہے۔ اُس کی گواہی کو ٹھوس تائید کے بغیر قبول نہیں کیا جاسکتا۔

ہائیکورٹ کے اخذ کردہ اس نتیجہ پر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ جائے واردات سے ملنے والے خول مسٹر بھٹو کی ہدایت پر بدل دیئے گئے تھے۔ اگر یہ نتیجہ درست ہوتا تو اس سے مسعود محمود کی گواہی کو انتہائی ٹھوس تائید میسر آسکتی تھی۔ اس لئے اب میں اس سوال کا جائزہ لیتا ہوں کہ آیا ہائیکورٹ کا اخذ کردہ نتیجہ درست ہے یا نہیں۔

خالی کارتوسوں کی بابت استغاثہ کے اہم گواہ غلام حسین نے اپنی شہادت میں کہا ہے کہ اس نے 7.62 ایم ایم کی گولیاں راولپنڈی میں واقع ایف ایس ایف کے اسلحہ خانہ سے حاصل کی تھیں اور اس مقصد کیلئے دو سٹین گنیں ایف ایس ایف کی تیسری بٹالین مقیم لاہور سے حاصل کی گئی تھیں۔ اس کی تائید میں تین گواہ امیر بادشاہ' محمد امیر اور فضل علی بھگتانے گئے کہ انہوں نے غلام حسین کی شہادت کی تائید کی۔ فریقین کے وکلاء میں اس بات پر اتفاق ہے کہ خول معائنہ کیلئے انسپکٹوریٹ آف آرمامینٹس کو سٹین گنوں کے بغیر بھیجے گئے تھے کیونکہ سٹین گنیں برآمد نہیں ہوئی تھیں۔ نفاذ مارشل لاء کے بعد کیس کی تفتیش دوبارہ

www.bhutto.org

شروع ہوئی تو اُس وقت ان سٹین گنوں کی شناخت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا حل یہ ڈھونڈا گیا کہ بٹالین کے پاس کل 25 سٹین گنیں تھیں وہ سب کی سب معائنہ کیلئے روانہ کر دی گئیں۔ وہاں کارتوسوں کا تقابلی ملاحظہ گنوں سے کیا گیا ماہر اسلحہ نے عدم مطابقت پر مبنی منفی رپورٹ دی۔ وہ رپورٹ سامنے نہیں لائی گئی 'البتہ نادر حسین عابدی' ماہر اسلحہ نے تصدیق کی کہ وہ رپورٹ نفی میں تھی اور مسٹر بٹالوی نے بھی تسلیم کیا کہ اسے روک لیا گیا تھا۔ اس لئے اس کے سوا کوئی استنباط نہیں کیا جا سکتا کہ معائنہ کیلئے جو خول بھیجے گئے ان میں سے کوئی بھی ان سٹین گنوں کے سائز کا نہیں تھا جو ایف ایس ایف کی تھرڈ بٹالین کے پاس تھیں۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ غلام حسین کی گواہی بھی غلط ہے اور دوسرے تینوں گواہوں کی بھی۔ پس ثابت ہوا کہ ماہر اسلحہ کی رپورٹ استغاثہ کو تباہ کن نظر آئی۔ اس لئے اس نے کارتوسوں میں رد و بدل کا نظریہ پیش کر دیا جو بجائے خود محلِ نظر ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں صرف عبدالحئی نیازی کا بیان ملتا ہے۔ آئی جی پولیس جس کے گھر میٹنگ ہوئی اور خول بدلے گئے اُسے اظہار کے لئے بلایا ہی نہیں گیا۔ تفتیشی ٹیم کا انچارج ڈی ایس پی فوت ہو چکا ہے اس کے حوالے سے بھی کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے یہ سارا معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اور شک کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہئے تھا لیکن ہائیکورٹ نے محض مفروضہ کی بناء پر اس تھیوری کو درست مان لیا۔ حالانکہ شفیع الرحمٰن ٹریبونل کے روبرو کسی نے کارتوسوں میں ردّ و بدل کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ جب بٹالوی کے علم میں نیازی کی شہادت میں موجود بہت سی خامیاں لائی گئیں تو انہوں نے کہا کہ وہ ہائیکورٹ کی طرف سے اختیار کردہ اس موقف کا دفاع نہیں کر سکے تھے کہ استغاثہ نے کارتوسوں میں رد و بدل کے نظریہ کو ثابت کر دیا ہے۔ یعنی خود سرکاری وکیل اس نظریہ کی تردید کر رہے ہیں۔ اس لئے اس پر یقین کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔

اب میں محرک کے سوال کی طرف آتا ہوں کیونکہ ہائیکورٹ نے محرک کی شہادت پر بہت زیادہ انحصار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمہ اصول یہ ہے کہ محرک بجائے خود کسی شریک مجرم کی شہادت کا مؤید نہیں بن سکتا۔ وجۂ تحریک تائیدی شہادت میں کمزور کڑی کا درجہ رکھتی ہے۔ لہٰذا عدالت کو محرک کی شہادت پر انحصار کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ زیرِ نظر مقدمہ میں ہائیکورٹ نے خفیہ رپورٹ پر انحصار کیا ہے حالانکہ یہی عدالت خفیہ رپورٹوں کو ناقابلِ اعتبار قرار دے چکی ہے پھر صفائی نے قصوری کی گواہی میں موجود بہت سی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ جن کی موجودگی میں قصوری کی شہادت مشکوک و مشتبہ لگتی ہے اور میں اسے قابلِ یقین نہیں سمجھتا شفیع الرحمٰن ٹریبونل کے سامنے اس نے خود چار ایسے گروپوں کا ذکر کیا جو ممکنہ طور پر اس کے قتل میں ملوث ہو سکتے تھے۔ مزید برآں یہ حقیقت بھی ثابت ہو چکی ہے کہ وقوعۂ اسلام آباد کی بابت جو ایف آئی آر درج کرائی گئی اس میں بھٹو کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا۔ اس لئے میں محرک کے بارے میں قصوری کی تائیدی شہادت کو قبول کرنے سے قاصر ہوں۔ اس معاملے میں محمد وارث نے بھی قصوری کی مقامی عداوتوں کے بارے میں گواہی کو چھپانے کی کوشش کر کے عدالت کو گمراہ کیا ہے اس لئے اس کی شہادت پر بھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اندریں حالات محرک کے بارے میں

www.bhutto.org

استغاثہ کا کیس ایک سے زیادہ وجوہات کی بناء پر ناکام ہو گیا ہے۔

اب اس شہادت کی طرف رجوع کرنا مناسب ہو گا جو اس الزام کی تائید میں پیش کی گئی ہے کہ مسٹر بھٹو نے قتل کی تفتیش رکوادی تھی۔ اس لئے مقدمہ کو عدم سراغ یابی کی بناء پر داخل دفتر کر دیا گیا۔

عبدالوکیل خان، محمد اصغر اور سعید احمد کی شہادتوں کی طرف

عبدالوکیل خان 1974ء میں ڈی آئی جی (لاہور) تھا۔ اُس کا تفتیش سے برائے نام واسطہ تھا۔ محمد اصغر کے برعکس اُس نے اُس میٹنگ میں شرکت سے انکار کیا ہے جو 11 ر نومبر 74ء کو آئی جی کے گھر پر ہوئی تھی۔ البتہ اس سلسلے میں اس نے سول لائنز تھانہ میں باجوہ کے ساتھ ملاقات کی تصدیق کی ہے جس میں باجوہ نے اس بات پر خفگی کا اظہار کیا تھا کہ ابتدائی رپورٹ میں وزیر اعظم کا نام کیوں درج ہونے دیا گیا۔ قتل کے قریباً دو ہفتے بعد عبدالاحد نے گواہ کو

مطلع کیا کہ باجوہ خالی کارتوسوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ گواہ کے مطابق باجوہ ایف ایس ایف کے زیادہ قریب تھا اس لئے اس نے عبدالاحد کو ڈانٹا کہ اس نے خول باجوہ کے سپرد کیوں کئے۔ یہ گواہی سنی سنائی بات پر مشتمل ہے اور بتانے والا فوت ہو چکا ہے۔ اس لئے عبدالاحد کے حوالہ سے عبدالوکیل کی شہادت قابل یقین نہیں ہے۔ باجوہ بھی زندہ نہیں اس لئے اس سے منسوب بیان کی توثیق بھی ممکن نہیں۔ وہ بھی سنی سنائی شہادت کی ذیل میں آتا ہے۔ اس لئے قابل ادخال نہیں۔ اس لئے میں قرار دیتا ہوں کہ اسے غلط طور پر قبول کر لیا گیا ہے اور یہ شہادت اس دعویٰ کو کوئی تقویت نہیں پہنچاتی کہ بھٹو تفتیش میں مداخلت کر رہے تھے۔

اب میں محمد اصغر کی شہادت کو لیتا ہوں میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ قصوری کی مقامی عداوتوں کے بارے میں اس کی شہادت قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ عبدالوکیل کی طرح محمد اصغر کا بھی یہ کہنا ہے کہ باجوہ نے اس سے شکوہ کیا کہ ابتدائی رپورٹ میں وزیر اعظم کا نام کیوں درج ہونے دیا گیا نیز اس نے خالی کارتوسوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ یہ گواہی قابلِ ادخال ہے تب بھی وہ استغاثہ کی کوئی مدد نہیں کرتی کیونکہ صرف اس قدر ثابت کر دینا کافی نہیں کہ تفتیش میں کوئی خلافِ قانون مداخلت کی گئی تھی بلکہ یہ بھی کہ وہ دخل اندازی بھٹو نے کرائی تھی۔ تاہم گواہ کے بقول آئی جی نے دخل دینے کی کوشش کی تھی، اس الزام کا تعلق گواہ اور نیازی کے اس دعویٰ سے ہے کہ آئی جی نے وقوعہ کی رات کو اپنے گھر اجلاس بلایا تھا چونکہ آئی جی کا اظہار نہیں لیا گیا اس لئے مجھے یہ باور کرنے میں تامل ہے کہ کوئی آئی جی اس قدر بیوقوف ہو سکتا ہے کہ ویسے احکام صادر کرتا جو اس سے منسوب کئے جا رہے ہیں۔ پس میں محمد اصغر کی شہادت پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔

اب محمد وارث کی گواہی کی طرف آتے ہیں۔ اُس نے تفتیش کا چارج 2 ر جنوری 75ء کو سنبھالا۔ اُس نے وہی کچھ دہرایا جو دوسرے دو گواہوں نے سعید احمد اور باجوہ کی طرف سے دیئے گئے مشورہ کی بابت بتایا تھا۔ گواہ نے یہ بھی کہا سعید احمد کے کہنے پر میں نے اور عبدالاحد نے جوائنٹ آرمی ڈی

www.bhutto.org

ٹیکشن آرگنائزیشن ( ) سے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ وہ ایمونیشن آرمی کی بعض یونٹوں اور فرنٹیئر کور کو مہیا کیا گیا تھا اور یہ انکشاف بھی ہوا کہ 62ء7 ایم ایم کیبلر کے کارتوس باڑہ مارکیٹ میں بھی دستیاب ہیں۔ ایف ایس ایف کو شاملِ تفتیش نہ کرنے کی بابت پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا "ہم پر سعید احمد خان نے دباؤ ڈالا تھا" یہ شہادت بھی بھٹو کے خلاف استغاثہ کی کوئی مدد نہیں کرتی کیونکہ گواہ نے سعید احمد کو ملوث کیا ہے۔ بھٹو کو نہیں۔

اسکے بعد سعید احمد خان کی شہادت پر ایک نظر ڈالتے ہیں سعید احمد خان نے بتایا کہ بھٹو نے جنوری 75ء میں اسے ہدایت کی تھی کہ مقدمہ پر نظر رکھے جو اُن دنوں شفیع الرحمٰن ٹریبونل میں زیرِ سماعت تھا۔ حسبِ ہدایت گواہ لاہور پہنچا اعلیٰ افسروں کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اسے یہ جان کر دکھ ہوا کہ واردات کو وقوع پذیر ہوئے ڈیڑھ ماہ گزرنے کے باوجود تفتیش میں کوئی قابلِ قدر پیشرفت نہیں ہوئی اس لئے اُس نے تفتیش بدل کر عبدالاحد کی جگہ محمد وارث کے حوالے کر دی اور خود واپس پنڈی چلا گیا وہاں بھٹو اور مسعود محمود کو یہ بتایا کہ واردات میں 62ء7 ایم ایم کے کارتوس استعمال ہوئے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ 1977ء میں بھٹو کے دور میں ہی اُس کے عہدہ میں تنزلی کر دی گئی تھی اور اُس کے بھائی کو بھٹو کے حکم سے برطرف کر دیا گیا تھا اس لئے وہ ایک ناراض گواہ ہے۔ اُس کی گواہی اس لئے بھی قابلِ استرداد ہے کہ اصغر اور وارث دونوں کے بقول اس نے تفتیش میں مداخلت کی تھی۔ گویا اس نے زیرِ دفعہ 201 ت پ شہادت کو چھپانے اور ضائع کرنے میں مدد دی تھی۔ اور وہ ایک شریک مجرم تھا اُس کی شہادت تائید کے بغیر قبول نہیں کی جا سکتی۔

اب میں وقوعہ اسلام آباد کی طرف آتا ہوں۔ ہائیکورٹ کی رائے ہے کہ اس واقعہ سے استغاثہ کے کیس کو بڑی مدد ملی۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ استغاثہ نے اسلام آباد کا واقعہ ثابت کر دیا ہے یہ حقیقت پھر بھی اپنی جگہ رہتی ہے کہ وہ حملہ مسٹر بھٹو کے حکم سے کیا گیا تھا یا اس کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ تھا۔ اس حملہ میں غلام حسین کے ساتھ کم از کم دو دوسرے حملہ آور شامل تھے اُن کا اظہار نہیں لیا گیا۔ غلام حسین چونکہ وعدہ معاف گواہ ہے وہ اپنی تائید آپ نہیں کر سکتا۔

استغاثہ کے کیس کا زیادہ انحصار مسعود محمود کی گواہی پر ہے۔ میں ثابت کر چکا ہوں کہ اس کی گواہی تائید کے بغیر قابلِ قبول نہیں چنانچہ استغاثہ نے دیگر تین گواہوں قصوری' ویلچ اور سعید احمد خان کی شہادتوں پر انحصار کیا۔ ان تینوں کی شہادتوں کے تجزیہ سے میں ثابت کر چکا ہوں کہ وہ کسی طور مسٹر بھٹو کو ملوث نہیں کرتیں چنانچہ بحث کردہ حالات کی روشنی میں مطمئن ہوں کہ استغاثہ مسٹر بھٹو کے خلاف اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا ہے اس لئے میں بھٹو کی اپیل منظور کرتا ہوں۔

اب میں اس امر کا جائزہ لیتا ہوں کہ آیا میاں عباس کی سزایابی کو اُس کے خلاف شہادت کوئی سہارا دیتی ہے یا نہیں۔ اس اپیل کنندہ نے اپیل کی باقاعدہ سماعت کیلئے منظوری کے بعد اپنی پوزیشن بدل لی تھی

www.bhutto.org

اور اپنے اقبال کو درست تسلیم کر لیا تھا اس لئے اسے اپیل واپس لینے کی اجازت دے کر خارج کیا جائے۔ لیکن ضابطہ فوجداری کی رُو سے کوئی اپیل باقاعدہ سماعت کیلئے منظور ہونے کے بعد واپس نہیں لی جا سکتی۔ مسل کا ملاحظہ کرنے کے بعد اسے خارج کیا جا سکتا ہے چونکہ میاں عباس کے خلاف کسی آزادانہ گواہی سے اُس کی تائید نہیں ہوتی جو میاں عباس کو موردِ الزام ٹھہرا سکتی۔ اس لئے میں اس کی سزایابی کو کالعدم قرار دیتا اور اُس کی اپیل منظور کرتا ہوں۔

اب میں اُن تین ملزمان کی اپیلوں کو لیتا ہوں جنہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور شروع سے آخر تک اس پر قائم رہے۔ میں مطمئن ہوں کہ ان تینوں کے اقبالی بیان حقیقی اور رضا کارانہ ہیں۔ اسلئے اُن کی اپیلیں لازماً خارج کی جانی چاہئیں۔ میں اس بات سے بھی متفق ہوں کہ وہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 301 پڑھے بشمول دفعہ 302 کے تحت کسی کمتر سزا کے مستحق نہیں ہیں اور اُنہیں جو سزائیں دی گئی ہیں اُن کی توثیق کرتا ہوں۔

۲..... جسٹس محمد حلیم کا اختلافی نوٹ

جسٹس محمد حلیم اقلیتی گروپ کے دوسرے اہم رکن تھے جنہوں نے جسٹس صفدر شاہ کے فیصلہ سے اتفاق کا اظہار کیا یہ جسٹس حلیم ہی تھے جنہوں نے اپیل کے خاتمہ پر کہا تھا

"سب کچھ اچھا ہے اگر انجام اچھا ہے" انہوں نے اپنے مختصر لیکن پر مغز نوٹ میں لکھا تھا۔

"میں نے اپنے فاضل بھائی جی صفدر شاہ کا وہ فیصلہ پڑھا ہے جس کے صادر کرنے کا وہ ارادہ رکھتے ہیں۔ میں ان کے فیصلہ میں درج کردہ وجوہات اور اخذ کردہ نتائج سے کلی اتفاق کرتا ہوں۔ البتہ ایک مختصر نوٹ کا اضافہ کرنا پسند کروں گا۔

چونکہ استغاثہ کے کیس کا انحصار زیادہ تر وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کی شہادت پر ہے۔ اسلئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس پر یقین کیا جائے یا نہیں؟ اس کی گواہی کے مجموعی جائزہ سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ اس معیار کی گواہی نہیں ہے جس پر اعتبار کیا جا سکے۔ اس میں نہ صرف باطنی کمزوریاں ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود محمود اس ذہنیت کا آدمی ہے جس کا طرزِ عمل اُن حقائق کے پس منظر میں جو اس کی شہادت میں نمایاں ہیں کلیتاً غیر فطری ہے! اس نمایاں کمزوری نے بحث کا دروازہ کھول دیا ہے کہ آیا بھٹو کی طرف سے قصوری کے قتل کی بابت دیا گیا مبینہ حکم اور اس کی بابت اس کا ردِ عمل دفعہ 120 (الف) ض.ف کے مفہوم میں سمجھوتہ کے مترادف ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب میرے فاضل بھائی جی صفدر شاہ نے اپنے فیصلہ میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ دے دیا ہے اسلئے مجھے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہائیکورٹ نے اس کی شہادت میں موجود اہم فروگذاشتوں، تضاد بیانیوں اور اضافوں کی اس طرح تعبیر کی ہے جیسے وہ ا۔

"ایسے معاملات کی تفاصیل یا فروگذاشتیں ہوں جنہیں سرکاری وکیل مخصوص سوالات پوچھ کر

www.bhutto.org

ریکارڈ پر لے آیا تھا۔" میری رائے میں یہ فروگذاشتیں اور اضافے اس کی شہادت کو مشکوک انداز میں متاثر کرتے ہیں اسلئے ہائیکورٹ نے انہیں استغاثہ کے حق میں استعمال کر کے اس کی شہادت کو غیر حقیقی اہمیت دی ہے۔ مجھے اجازت دی جائے تو میں احترام کے ساتھ کہوں گا کہ یہ سراسر غلط ہے کیونکہ فوجداری قانون کے مسلمہ اصول کے مطابق گواہی میں شک کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو ملتا ہے۔

یہ بات بھی ناقابلِ فہم ہے کہ وعدہ معاف گواہ کی پوزیشن میں ہوتے ہوئے وہ وقوعہ اسلام آباد سے آگاہ نہیں تھا جرح کے دوران جب اس کے متعلق سوال کئے گئے تو اس نے جواب دیا "میں نے اس کے بارے میں سرسری سا سنا تھا۔" اس جواب سے بحیثیت وعدہ معاف گواہ اس کا کردار اجاگر نہیں ہوتا۔ اس کی بیان کردہ داستان پر یقین کرنا مشکل ہے۔ اسے زندگی کا خطرہ لاحق تھا حالانکہ بھٹو کی طرف سے اُس پر نوازشات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور بھٹو نے خود اپنے بچوں کی نگرانی کا فریضہ اسے سونپ رکھا تھا۔ بظاہر یہ وضاحت اسلئے وضع کی گئی تاکہ قصوری کو قتل کرنے کی ہدایت پر اُس کے ردعمل کو جائز ٹھہرایا جاسکے۔ جو مجھے ایک فریب کاری لگتی ہے یہ چند نمایاں نکات ہیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تاہم دوسری باتیں بھی ہیں جو اُس کی راست گوئی پر روشنی ڈالتی ہیں۔

اُس کی شہادت میں خامیوں کی پریشان کن نوعیت کو دیکھتے ہوئے جن پر میرے فاضل بھائی صفدر شاہ نے اپنے فیصلہ میں شافی بحث کی ہے۔ میں مضبوطی سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ اس کی گواہی غیر فطری اور ناقابل یقین ہے۔ آخر میں اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ گواہی دیتے وقت وہ ایک باڑھ پر بیٹھا ہوا لگتا ہے اور اپنے کردار کو کم سے کم کرنے کیلئے کوشاں نظر آتا ہے جو کسی وعدہ معاف گواہ کا عمومی طرزِ عمل نہیں ہوتا۔ اس کی شہادت کی اس صورتحال کو دیکھیں تو یہ دانش و تدبر کو اپیل نہیں کرتی اسلئے میں اس پر یقین نہیں کرتا۔ سازش کے کیس کو تباہ کرنے کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔ اس کے باوجود تائیدی شہادت کا حوالہ دینا بے محل نہ ہوگا جو مجھے غیر فیصلہ کن اور قائل نہ کرنے والی لگتی ہے۔ اسلئے اہم کوائف میں وعدہ معاف گواہ کی بے دلیل باتوں کو سچ ثابت کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ شہادت کا ایک جز سعید احمد خان نے فراہم کیا ہے۔ دوسرا ایم آر ویہج اور اس کی مرتب کردہ دو رپورٹوں نے جن میں سے ایک مسعود محمود کے نام ہے۔ نیز اسکی طرف سے ارسال کردہ ایک خط جو میاں محمد عباس (شریک سازشی) کی طرف سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں تھا۔

پہلے میں سعید احمد خان کی شہادت کو لیتا ہوں جس کا لُب لباب یہ ہے کہ معمول کی ایک میٹنگ کے اختتام پر مسٹر بھٹو نے اُس سے پوچھا آیا وہ مسٹر قصوری کو جانتا ہے؟ اس کی طرف سے نفی میں جواب ملنے پر بھٹو نے اس سے کہا کہ وہ مسعود محمود کو اس کام کی یاددہانی کرادے، جس کے کرنے کا حکم اسے پہلے دیا جا چکا ہے۔ سعید احمد خان نے وہ پیغام گرین لائن پر مسعود محمود کو پہنچا دیا۔ اُس کی شہادت کا یہ حصہ داخلی طور پر ناقابلِ یقین ہے کیونکہ ایسا پیغام مسٹر بھٹو خود بھی گرین لائن پر دے سکتے تھے۔ اس میں کسی درمیانی واسطہ کو ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر اسے قبول کر لیا جائے پھر بھی میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اسے

www.bhutto.org

تائیدی شہادت کیسے بنایا جائے کیونکہ یہ ایک مبہم اور غیر واضح بات تھی جس کا مطلب اکیلا مسعود محمود جانتا تھا۔ اس کی شہادت بھی تائید کی محتاج ہے۔ پس میرے خیال میں ایسی تائیدی شہادت بیکار ہے جو مبہم ہو۔

جہاں تک ایم آر ویلچ کا تعلق ہے اس نے اس پیغام کے بارے میں بھٹو کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جو 29 ر جولائی کو مسعود محمود نے اس تک پہنچایا تھا۔ یہ پیغام رسانی اسے سازش میں ملوث کرنے میں ناکام رہی ہے۔ جہاں تک اُس کے اپنے طرز عمل کی بات ہے اس نے خود کو اس سے دور رکھا۔ خفیہ رپورٹوں کی بابت اس نے کہا کہ میرے فرائض کے پس منظر میں وہ معمول کا حصہ تھیں۔ اس انکوئری کے بارے میں جو میاں عباس نے اس بارے میں کی تھی کہ قیام کوئٹہ کے دوران قصوری کہاں سویا کرتا تھا۔ اس مراسلہ کا جواب اس نے معمول کے طریقہ سے یعنی ڈیڑھ ماہ کی تاخیر سے دیا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ خفیہ رپورٹوں اور دو خطوط کو سامنے رکھنے سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ وہ کسی سازش کی تعمیل میں تھے۔ تاہم ہائیکورٹ نے ان سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔

فاضل وکیل استغاثہ نے بھی اسی رائے کی حمایت میں دلائل دیئے جبکہ میرے نزدیک ان دستاویزات سے ایسا مفہوم مراد لینا کسی خاص مقصد کی طرف کھینچ کھانچ کر لے جانے کے مترادف ہے۔ جو درست نہیں اس سے شک کے اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے اسلئے یہ تائیدی شہادت کسی کام کی نہیں۔

جہاں تک مسٹر بتالوی کی اس دلیل کا تعلق ہے کہ بھٹو کے جرم کی تشخیص کرتے وقت شہادت کا بحیثیت مجموعی مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہاں میں واضح کرتا چلوں کہ ایسی شہادت پر غور کرنے سے پہلے قانون تقاضا کرتا ہے کہ اس کا ہر جز شک وشبہ سے بالاتر ہو جبکہ یہاں ایسی بات نہیں ہے۔ میرے فاضل بھائی صفدر شاہ نے اس کے قابل یقین ہونے کی بابت خاصے شبہات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے قطع نظر شہادت کے دیگر اجزاء بھی مسٹر بھٹو کو بطور سازشی براہ راست ملوث نہیں کرتے۔ اسلئے میں یہ کہوں گا کہ استغاثہ اپنا کیس ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ جہاں تک میاں عباس کا تعلق ہے مذکورہ فیصلہ میں اسے قابل توجیہ وجوہات کی بناء پر بری الذمہ ٹھہرایا گیا ہے اور میں ضروری نہیں سمجھتا کہ اس کے معاملہ کا از سر نو جائزہ لوں۔ دوسرے تینوں ملزمان نہ صرف اپنے پہلے اقبال پر قائم رہے بلکہ جب زیر دفعہ 342 ض ف ان کے بیانات لئے گئے تب بھی انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ جہاں تک اُن تینوں کا تعلق ہے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ انہوں نے خود کو اس میں کیوں پھنسایا۔ اس فرضی سوال کا جواب دینا میرے ذمہ نہیں۔ ہو سکتا ہے جس سازش پر استغاثہ نے انحصار کیا ہے اس کے علاوہ بھی کوئی سازش کار فرما ہو۔

چنانچہ میں ذوالفقار علی بھٹو اور میاں محمد عباس کی اپیل نمبر 11 و نمبر 12 منظور کرتے ہوئے انہیں بری کرتا ہوں اور دیگر تینوں اپیل کنندگان کی اپیل نمبر 13 خارج کرتا ہوں۔"

3...... جسٹس جی - صفدر شاہ کا فیصلہ

" میں اس فیصلہ کے ذریعے فوجداری اپیل ہائے نمبر 11 - نمبر 12 ' نمبر 13 لغایت 1978ء کو نمٹانا چاہتا ہوں جو پانچ ججوں پر مشتمل لاہور ہائیکورٹ کے فل بنچ کی طرف سے صادر کردہ اس فیصلہ کے خلاف دائر کی گئی ہیں جس کا اعلان مقدمہ بضیغہ ابتدائی نمبر 60 میں 18 / مارچ 78ء کو کیا گیا۔

اس مقدمہ کا پس منظر جو مسٹر قصوری پر قاتلانہ حملہ کا سبب بنا اور اس کے باپ کی ہلاکت پر منتج ہوا میرے واجب الاحترام چیف جسٹس نے اپنے فیصلہ میں کھول کر بیان کر دیا ہے اسلئے اسے دہرانا غیر ضروری ہو گا ماسوائے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے۔

بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ طریق کار اپنانے کا فیصلہ کیا ہے کہ براہ راست استغاثہ کے کیس کے مرکزی نکتہ سے بات شروع کی جائے۔ آیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپیل کنندہ کے خلاف اپنے دعویٰ کے اہم خدوخال معقول شبہ سے بالاتر ثابت کر دیئے ہیں۔ میرے خیال میں استغاثہ کے کیس کے بنیادی نکات حسب ذیل ہیں -

(الف)..... محرک' جس کیلئے بھٹو' قصوری کو قتل کرانا چاہتے تھے۔

(ب)..... مبینہ سازش جو بھٹو اور مسعود محمود کے مابین طے پائی تاکہ مذکورہ بالا مقصد حاصل کیا جا سکے۔

(ج)..... مسعود محمود کی شہادت کی سعید احمد خان کی طرف سے تائید و حمایت

(د)..... وہ مراسلت جس کا تبادلہ ایم آر ویلچ اور میاں عباس کے درمیان ہوا۔

اپنے اس چارٹ کے مطابق مجھے پہلے محرک کے مسئلہ کو لینا چاہئے لیکن سلسلۂ واقعات میں سب سے پہلے مسعود اور وقار احمد کی ملاقات آتی ہے اسلئے میں اس سے بحث کا آغاز کرتا ہوں۔

استغاثہ کے مطابق اوائل اپریل 74ء میں وقار احمد اور مسعود محمود کے مابین ایک ملاقات ہوئی جس میں اول الذکر نے مسعود کو بتایا کہ اسے 12 / اپریل کو بھٹو کی خدمت میں پیش ہونا ہے یہ کہ وہ ایک تقرری کی پیشکش کریں گے جو اُسے لازماً قبول کر لینی چاہئے۔ یہ کہ وزیر اعظم کے پاس جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔ استغاثہ نے وقار احمد کو ہائیکورٹ میں پیش نہیں کیا اسلئے صفائی کی طرف سے اعتراض کیا گیا کہ مسعود محمود نے اس ملاقات میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں سچ نہیں بولا کیونکہ اُسکی شہادت محض سنی سنائی گواہی کے مترادف ہے۔ ہائیکورٹ نے اس اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مسعود محمود کی شہادت کے اس جز کو قبول کر لیا۔ جس پر مسٹر بختیار نے شدید اعتراض کیا۔ انکے اعتراض میں کتنی جان ہے۔ یہ معلوم کرنے کیلئے ہمیں مسعود محمود کی شہادت کے اس جُز کا جائزہ لینا ہو گا۔ جس کا تعلق 12 / اپریل کو دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو سے ہے۔

اس بارے میں مسعود محمود کی شہادت یہ ہے کہ :-

" 12 / اپریل 74ء کی ملاقات میں وقار احمد بڑی شفقت سے پیش آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وزیر

www.bhutto.org

اعظم ایک نئے منصب کی پیشکش کریں گے جو تمہیں لازماً قبول کر لینا چاہئے۔ اس کے بعد اُس نے میرے گھریلو حالات اور میری مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد مشورہ دیا کہ میں مسٹر بھٹو کی بات مان لوں۔ ورنہ مجھے ملازمت سے فارغ کیا جا سکتا ہے۔"

اس شہادت کی روشنی میں وقار احمد نے مسعود محمود سے جو کچھ کہا' اس کی حیثیت سنی سنائی شہادت کی ہے جو قانون شہادت کی دفعہ 60 کے تحت قابلِ ادا خل نہیں جس کی تائید بہت سے نظائر سے ہوتی ہے۔

اس کی مخالفت کرتے ہوئے وکیل استغاثہ مسٹر بٹالوی نے کہا کہ مسعود محمود کی شہادت کا یہ حصہ سنی سنائی شہادت کے اصول کی زد میں نہیں آتا۔ اسلئے وہ زیر دفعہ 60 قانون شہادت قابل ادخال ہے۔ اپنے موقف کی تائید میں انہوں نے پریوی کونسل کے دو فیصلوں' اے آئی آر 1947 پی سی 19 اور پی ایل ڈی 1958 پی سی 100 کا حوالہ دیا لیکن یہ دونوں فیصلے موجودہ صورتحال سے متعلق نہیں ہیں اس لئے وکیل استغاثہ کا استدلال کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اس لئے میں اسے مسترد کرتا ہوں۔

اب میں محرک کی طرف آتا ہوں جس کیلئے بھٹو کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مسعود محمود کے ساتھ سازش میں شریک ہو گیا تھا تاکہ قصوری کو ٹھکانے لگایا جا سکے چونکہ محرک کے بارے میں استغاثہ کی شہادت سراسر قرائنی نوعیت کی ہے اسلئے قرائنی شہادت کو بروئے کار لانے کیلئے مسلمہ اصولوں کا جائزہ لینا مناسب ہو گا۔

دوسری چیزوں کی طرف قرائنی شہادت کی اپنی خوبیاں اور خرابیاں ہیں۔ اس کی حمایت میں جسٹس منیر اپنی کتاب ( ) جلد اول' صفحہ نمبر 23' ایڈیشن 1974) میں رقم طراز ہیں

"قرائنی شہادت بہرحال بہترین قسم کی ہوتی ہے کیونکہ مشہور کہاوت ہے کہ "انسان جھوٹ بول سکتے ہیں واقعات نہیں" اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ کسی بات کو قرائنی شہادت سے ثابت کرنے کیلئے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(i) ... واقعات جن سے نتیجہ اخذ کرنا مقصود ہو' پوری طرح ثابت شدہ ہوں۔

(ii) ... جملہ حقائق مفروضہ سے ہم آہنگ ہوں۔

(iii) ... واقعات فیصلہ کن نوعیت اور رجحان کے ہونے چاہئیں۔

(iv) واقعات اخلاقی تیقن کیلئے ہر مفروضہ کو خارج کر دیں ماسوائے اس ایک کے جسے ثابت کرنا مقصود ہو۔

ایم عطا محمد خان و دیگر بنام تاج (اے آئی آر 1950 لاہور 199) میں لاہور ہائیکورٹ کے فل بنچ نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ اگر قرائنی شہادت کی کسی دوسرے معقول مفروضہ سے وضاحت نہ کی جا سکتی ہو فقط ایسی صورت میں وہ ملزم کی سزایابی کی بنیاد بن سکتی ہے۔

www.bhutto.org

اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم قصوری کی شہادت کے اس متعلقہ جز کا جائزہ لیتے ہیں۔

"یہ کہ 1970ء کے انتخابات میں وہ قصور سے پی پی پی کے ٹکٹ پر ایم این اے منتخب ہوا۔ انتخابات میں بھاری کامیابی نے بھٹو کو اقتدار کا بھوکا بنا دیا۔ اُس نے 28 فروری 71ء کو اقبال پارک (لاہور) میں ایک بڑے جلسہ عام میں دھمکی دی کہ جو کوئی قومی اسمبلی کے مجوزہ سیشن میں شرکت کرنے جائے گا اُس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ یہ کہ ڈھاکہ جانے والا یکطرفہ ٹکٹ لیکر جائے۔ یہ کہ 14 مارچ کو نشتر پارک میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے مجیب الرحمٰن سے دوٹوک الفاظ میں کہا "اُدھر تم، اِدھر ہم"۔

یہ کہ بھٹو کی حکمت عملی کا منہ چڑانے کیلئے وہ اکیلا ڈھاکہ گیا۔ اس طرح اُس کے اور بھٹو کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے۔ دسمبر 71ء میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں تبدیل ہو گیا تو قصوری نے بھٹو کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اگست 73ء میں نیا آئین نافذ ہوا تو اُس نے اس پر دستخط نہیں کئے۔ اسی پس منظر میں 3 جون 74ء کا واقعہ پیش آیا جس میں بھٹو نے اُسے دھمکی دی کہ "تمہاری بکواس مزید برداشت نہیں کی جائے گی"۔ پھر 24 اگست 74ء کو اس کی کار پر قاتلانہ حملہ کیا گیا جس کی رپورٹ آبپارہ تھانہ میں درج کرائی گئی لیکن کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ یہ کہ وہ پی پی پی کو چھوڑ کر اکتوبر 74ء میں تحریک استقلال میں شامل ہو گیا اور حکومت پر کڑی تنقید کرنے لگا۔ 10 اور 11 نومبر 74ء کی درمیانی شب کو اُس پر خود کار ہتھیاروں سے ، سرا حملہ کیا گیا ' جس میں اس کا باپ مارا گیا۔ اسی رات تھانہ اچھرہ میں وقوعہ کی ابتدائی رپورٹ درج کرائی گئی ' جس میں بھٹو کو نامزد کیا گیا پولیس نے تو اس کیس میں کچھ نہ کیا ' البتہ حکومت پنجاب کے مقرر کردہ شفیع الرحمٰن ٹربیونل نے مقدمہ کی پوری انکوائری کر کے رپورٹ مرتب کی ' جسے شائع نہیں کیا گیا۔ ٹربیونل کے سامنے قصوری نے اپنے اوپر حملہ کا ذمہ دار بھٹو کو قرار دیا اور بھٹو کے ساتھ اپنے اختلافات کی وضاحت کی تاکہ یہ ثابت کر سکے کہ بھٹو اُس کے قتل کا محرک رکھتا تھا۔

قصوری کی طویل شہادت اور اس پر ہونے والی جرح ' سعید احمد خان کے تائیدی بیان اور بہت سی دستاویزات کے بغور مطالعہ سے ' جو اس ضمن میں ریکارڈ پر لائی گئیں ' حسب ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں -

○ ..... پی پی کے حلقوں میں اسے سخت ناپسند کیا جاتا تھا خود اس کے مقامی حلقہ قصور میں یعقوب مان کا مضبوط گروپ اُس کا شدید مخالف تھا۔ مان گروپ نے اُس پر کئی بار حملے کئے جس کی شہادتیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔

○ ..... 74ء کی احمدیوں کے خلاف تحریک ختم نبوت میں قصوری نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس طرح وہ مرزائیوں کی نظروں میں بھی کھٹکتا تھا۔

○ ..... شفیع الرحمٰن ٹربیونل کے سامنے اُس نے خود چار ایسے گروہوں کا ذکر کیا تھا جن کا قاتلانہ حملے میں ملوث ہونے کا امکان تھا۔ 3 جون 74ء کے ناخوشگوار واقعہ کے صرف اڑھائی ماہ بعد 24 اگست

www.bhutto.org

74ء کو قصوری پر اسلام آباد میں جو قاتلانہ حملہ ہوا اُس کی ابتدائی رپورٹ میں قصوری نے بھٹو کی طرف اشارہ تک نہیں کیا کہ اس حملہ میں اس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

○ ..... اپنے باپ کے قتل کی ایف آئی آر میں اُس نے بھٹو پر محض اس بناء پر شک ظاہر کیا تھا کہ وہ اُس کی ذات اور پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کرتا رہتا ہے۔ اسلئے ممکن ہے کہ اس واقعہ کے پیچھے اس کا ہاتھ ہو واضح الفاظ میں بھٹو کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا تھا۔

○ ..... وہ بھٹو پر جس گندی اہانت آمیز، رسوا کن اور ناقابل برداشت زبان میں تنقید و تعریض کرتا تھا اس سے حکومتی حلقوں میں اسکے خلاف سخت نفرت پائی جاتی تھی۔ اسلئے یہ بات بعید از امکان نہیں کہ بھٹو کو خوش کرنے کیلئے مسعود محمود نے خود اپنے طور پر یا کسی اور نے قصوری کو ختم کرنے کیلئے اُس کے خلاف سازش کی ہو۔

ان نتائج کی روشنی میں، میں استغاثہ کے اس دعویٰ سے اتفاق نہیں کرتا کہ اکیلا بھٹو ہی قصوری کے قتل کا محرک رکھتا تھا جیسا کہ ہائیکورٹ نے اپنے فیصلہ میں قرار دیا ہے۔

زیر نظر مقدمہ میں محرک کی بابت ساری شہادت قرائنی ہے بلکہ استغاثہ کے کیس کا تمام تر انحصار مسعود محمود کی گواہی پر ہے۔ جو خود اعتراف کرنے والا شریک مجرم ہے لیکن اپنی جان بچانے کی خاطر وعدہ معاف گواہ بن گیا۔ اس کی گواہی کیلئے ضروری تائید میسر نہیں، اندریں حالات اُس کی شہادت پر یقین نہیں کیا جا سکتا چنانچہ میں بصد احترام ہائیکورٹ کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ اکیلا بھٹو ہی قصوری کو قتل کرانے کا محرک رکھتا تھا۔ ایک باخبر ذریعہ نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مسعود محمود کے بھائی مقبول محمود کا قصور میں میڈیکل سٹور تھا۔ عقیدہ کے لحاظ سے وہ قادیانی تھے۔ 1974ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک کے دوران احمد رضا قصوری کی قیادت میں مرزائیوں کے خلاف جلوس نکالا گیا۔ جلوس کے شرکاء نے بے قابو ہو کر میڈیکل سٹور پر ہلہ بول دیا اور اسے آگ لگادی۔ اس بناء پر مسعود محمود قصوری کے خلاف ذاتی رنجش رکھتا تھا جس کے باعث اُس نے قصوری کے قتل کا منصوبہ بنایا اور اپنی زیر کمان فورس کے جوانوں سے اس پر حملہ کرایا لیکن غلطی سے اُس کا باپ مارا گیا۔ (مصنف)

(ب) ..... اب میں قصوری کو ٹھکانے لگانے سے متعلق بھٹو اور مسعود محمود کے مابین طے پانے والی مبینہ سازش کی طرف آتا ہوں۔ ایسا کرنے کے لئے میں چاہتا ہوں کہ پہلے مسعود محمود کی شہادت کا تجزیہ کروں اور یہ دیکھوں آیا اُس کی شہادت فطری، غالب احتمالات پر مبنی اور قائل کرنے والی ہے یا ایک وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے جب تک اہم کوائف میں اس کی تائید میسر نہ آجائے۔ ایک مختلف زاویۂ نظر سے دیکھتے ہوئے میں اُس کے ساتھ ایک عام گواہ کا سلوک کر رہا ہوں اور وقتی طور پر یہ بات بھلا دیتا ہوں کہ وہ خود اقبال کرنے والا مجرم ہے۔ وہ اپنی کھال بچانے کیلئے پرانے ساتھیوں کو دھوکہ دے چکا ہے۔ اس کی شہادت پر بے یقینی کے ساتھ نظر ڈالی جائے اور اہم امور میں

www.bhutto.org

مطابقت میسر آئے بغیر اسے قبول نہ کیا جائے۔

کسی مقدمہ میں شہادت کے تجزیہ کیلئے ماہرین قانون نے بہت سے اصول وضع کئے ہیں۔ ان میں سے یہ اصول سب سے زیادہ اپیل کرتا ہے کہ -

"انسانی گواہی کی صداقت و راست گوئی پرکھنے کیلئے ہمارے پاس کوئی ٹیسٹ نہیں سوائے اس کے کہ ہم اپنے علم، مشاہدہ اور تجزیہ سے اس کی مطابقت کا اندازہ لگائیں"

اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیئے اب ہم مسعود محمود کی شہادت کا جائزہ لیتے ہیں اُس کی گواہی کا جو ٹائپ کے 132 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ماحصل یہ ہے کہ -

"پولیس سروس کے ایک رُکن کی حیثیت سے ترقی کرتے ہوئے وہ ڈی آئی جی کے عہدہ تک پہنچا۔ 1969ء میں اسے سینٹو کے صدر دفتر انقرہ میں بطور ڈپٹی سیکرٹری تعینات کیا گیا۔ 70ء میں سینٹو سے واپسی پر وزارتِ دفاع میں جوائنٹ سیکرٹری اور بعد ازاں ایڈیشنل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ آخر میں اسے ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ پر ترقی ملی۔ 3 رجون 74ء کو بھٹو اور قصوری کے مابین تو تکار کے بعد بھٹو نے مسعود محمود کو بلایا اور اُس سے کہا کہ وہ مسٹر قصوری سے تنگ آچکے ہیں اسلئے میاں عباس سے کہو کہ وہ قصوری کی بابت سوچے گئے مشن کو جلد مکمل کرے۔ مسعود نے میاں عباس کو وزیر اعظم کے پیغام سے مطلع کیا تو اُس نے یقین دلایا کہ مشن ضرور پورا کیا جائے گا اور یہ کہ اسے اس سلسلہ میں پہلے ہی ہدایات مل چکی ہیں۔ اگست 74ء میں مسٹر قصوری پر اسلام آباد میں قاتلانہ حملہ ہوا۔ اسی دوران بھٹو نے اُسے ہدایت کی کہ قصوری ستمبر میں کوئٹہ جانے والا ہے وہاں اُس پر کڑی نظر رکھی جائے چنانچہ مسعود نے ایف ایس ایف کے مقامی کمانڈر ایم آر دیپلج کو فون پر ضروری ہدایات دیں اور پھر کوئٹہ گیا تو اُسے یاد دہانی کرائی۔ اس سلسلہ میں اس نے تین دستاویزات پیش کیں جو ایم آر دیپلج کی طرف سے ارسال کردہ رپورٹیں ہیں۔ 11 رنومبر 74ء کو ملتان میں قیام کے دوران بھٹو نے اسے بذریعہ فون مطلع کیا کہ میاں عباس نے قصوری کی بجائے اُس کے باپ کو قتل کروا دیا ہے۔ صادق حسین قریشی کے گھر دونوں میں اس وقوعہ پر تبادلہ خیال ہوا اور مسعود اسی دن راولپنڈی لوٹ آیا۔ جہاں میاں عباس نے اُسے بتایا کہ آپریشن کے دوران قصوری کی بجائے اُس کا باپ نشانہ بن گیا ہے۔ اس کے بعد مسٹر بھٹو نے مشن کی تکمیل پر زور دیا لیکن مسعود نے جواب دیدیا کہ "میں آئندہ خلاف قانون احکام کی تعمیل نہیں کروں گا"۔ اس کے نتیجہ میں اس کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ اُس کے بچوں کو ایچی سن کالج سے اغوا کرنے کی ناکام کوشش بروئے کار لائی گئی۔ چمبہ ہاؤس میں سے زہر دینے کی کوشش بھی ہوئی۔ 5 رجولائی 77ء کو اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ 14 راگست کو اس نے سی ایم ایل اے کے نام 100 صفحات پر مشتمل خط لکھا جس میں ایف ایس ایف کے خلاف قانون افعال کا اعتراف کیا۔ اگست کے آخری ہفتہ میں ایف آئی اے والوں نے اُس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے نواب محمد احمد خان کے قتل میں ملوث ہونے کا اقبال کر لیا۔ اسلام آباد کے

www.bhutto.org

ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں اس کا ابتدائی بیان قلمبند کرنے کے بعد اُس نے کیمپ جیل لاہور سے فوجی حکام کو درخواست دی کہ اگر اُسے وعدہ معاف گواہ بنالیا جائے تو وہ نواب محمد احمد خان کے قتل کی سازش کو طشت از بام کرنے کیلئے تیار ہے۔ درخواست منظور کرتے ہوئے اسے وعدہ معاف گواہ بنالیا گیا اور 14 ستمبر کو اُسنے لاہور کے ایک مجسٹریٹ کے روبرو بطور وعدہ معاف گواہ بیان قلمبند کرایا۔

اپنی شہادت کی تائید میں اس نے اپنے ٹی اے بل اور متفرق دستاویزات پیش کیں۔ استغاثہ کی طرف سے ابتدائی سوال کے جواب میں اُس نے جو کچھ بتایا یہ اس کا خلاصہ ہے۔ میں اپنے فیصلہ کے شروع میں اس بارے میں کافی کچھ کہہ چکا ہوں کہ وقار احمد نے اوائل اپریل 74ء میں مسعود محمود سے جو کچھ کہا اس کے بارے میں شہادت ناقابلِ ادخال ہے۔ تاہم ابتدائی سوال کے جواب میں اس نے جو بیان دیا اس کا تجزیہ ضروری ہے۔ تاکہ پتہ چل سکے آیا اُس کی گواہی فطری اور غالب احتمالات پر مبنی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا صحیح جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں متعدد فیصلوں اور ان میں نقل کردہ قانونی اصولوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ مسعود محمود کوئی عام گواہ نہیں ہے۔ ایک تعلیم یافتہ، پولیس سے ریٹائرڈ اعلیٰ افسر اور بڑا ذہین و تجربہ کار شخص ہے۔

12 اپریل 74ء کو وزیراعظم کے پاس جانے سے پہلے اس کے اور وقار احمد کے مابین جو گفتگو ہوئی اُس کے بارے میں مسعود کی ساری شہادت سراسر غیر فطری، ناقابلِ یقین اور سازباز پر مبنی ہے۔ کیونکہ ریکارڈ پر ایسی کوئی شہادت نہیں کہ ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ اتنا غیر مقبول، جان جوکھم والا اور ناپسندیدہ تھا کہ وقار احمد نے اس منصب کو قبول کرنے کے لئے اسے نفسیاتی طور پر تیار کرنا ہی کوئی ایسی شہادت دستیاب ہے جو ظاہر کرتی ہو کہ مسعود محمود یا بھٹو کردار کی اس پستی کیلئے مشہور تھا کہ اس نے مبینہ سازش کی تکمیل کیلئے اسے درست آلۂ کار سمجھا۔ مسعود کی شہادت اسلئے بھی غیر فطری لگتی ہے کہ وہ گورنمنٹ ملازم تھا۔ وہ کسی بھی جگہ تبادلہ پر جانے سے کیسے انکار کر سکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ اسے بہت سے گھریلو مسائل درپیش تھے۔ وقار احمد نے اُسے متعلقہ قواعد پڑھ کر سنائے۔ یہ بات شہادت کو اور بھی مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔ وقار احمد ایک اعلیٰ تجربہ کار افسر تھا۔ اس مشقت میں پڑنے کی بجائے وہ براہ راست تبادلہ کا حکم مسعود کے ہاتھ میں تھما دیتا تو آخر الذکر کیلئے اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔

پھر اُسی دن بھٹو کے ساتھ ہونے والی گفتگو کا اُس نے جس طرح نقشہ کھینچا ہے اس سے اُس کا امیج بلند نہیں ہوتا۔ اگر ریکارڈ پر کوئی ایسی شہادت ہوتی جو ظاہر کرتی کہ ایف ایس ایف ایک دہشت ناک اور بدنام فورس تھی کہ شریف اور نیک افسران اس کے نزدیک جانے سے کنی کتراتے تھے یا اس مقصد کیلئے مسعود اخلاقی فقدان کی شہرت رکھتا تھا۔ اُس صورت میں مسعود کی گواہی کا جائزہ لینے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے پس میری رائے میں اس کی شہادت سراسر جھوٹی اور مضحکہ خیز ہے اس کی اس بات پر یقین کرنا بھی مشکل ہے کہ وقار احمد اور بھٹو کی کوششوں کے بعد سعید احمد اور باجوہ نے بھی اسے نئی تقرری قبول کر لینے کی ترغیب دی۔

www.bhutto.org

اس سے آگے مسعود محمود کا بیان ہے کہ 3 رجون 74ء کو اسمبلی میں قصوری کے ساتھ تلخ کلامی کے بعد بھٹو نے اُسے بلایا اور اُسے کہا کہ میاں عباس کو قصوری کے قتل سے متعلق مشن کی یاد دہانی کرادے یہ کہ کچھ عرصہ بعد بھٹو نے اُسے مطلع کیا کہ قصوری عنقریب کوئٹہ جانے والا ہے۔ وہاں اس پر کڑی نظر رکھی جائے۔ ایم آر دیلیج نے مسعود کے حکم کی تعمیل کی اور اس سلسلے میں تین رپورٹیں مسعود کو روانہ کیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہائیکورٹ نے مسعود کی شہادت کے اس جز کو تسلیم کر لیا ہے۔ وکیل صفائی نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے دلیل پیش کی کہ عدالت نے اس شہادت کو اس امر واقعہ پر غور کئے بغیر درست مان لیا کہ اگر ہم چاہیں تو دوسرے معقول قیاس کی بناء پر اس کی دوسری تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان دنوں بلوچستان میں بغاوت کے سے آثار تھے اور قصوری اپنی شعلہ بیانی سے جلتی پر تیل چھڑک سکتا تھا۔ اسلئے ایم آر دیلیج سے کہا گیا کہ قصوری پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔ ہائیکورٹ نے ایسی بے ضرر ہدایات اور معمول کی مراسلت کی غلط تعبیر و تشریح کی ہے۔ اس استدلال میں خاصا وزن ہے اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ ہائیکورٹ نے کسی جانچ پڑتال کے بغیر مراسلت کو قبول کر لیا ہے۔

اُس کی مزید گواہی یہ ہے کہ جون 74ء میں کسی وقت بھٹو نے اُسے بلایا اور میاں عباس کو قصوری کی بابت مشن کی یاد دہانی کرانے کو کہا جس پر مسعود نے احتجاج کرتے ہوئے ایسے احکام کو غیر قانونی قرار دیا تو وزیر اعظم طیش میں آ گئے اور چلا کر کہنے لگے اُس سلسلے میں میں تمہاری کوئی بکواس نہیں سنوں گا۔ بعد ازاں اُس نے میاں عباس کو بلا کر بھٹو کا پیغام دیا۔ بھٹو خود بھی گرین لائن پر وقتاً فوقتاً اُسے یاد دلاتے رہے۔

اُس کی شہادت کے اس حصہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس کی نامعقولیت صاف نظر آ جاتی ہے۔ سازش کے بنیادی تصور پر تھوڑا سا غور کرنے سے عام فہم والا آدمی بھی سمجھ جاتا ہے کہ سازشی اپنے ناپاک ارادوں کو پوشیدہ رکھنے میں اتنے محتاط ہوتے ہیں کہ ایسی کوئی نشانی 'علامت' نشان یا سراغ باقی نہیں چھوڑتے' جس سے سازش کا پتہ چل سکے۔ اس اصول کی روشنی میں مسعود محمود کی گواہی سراسر نامعقول لگتی ہے کیونکہ بھٹو جیسا زیرک اور ہوش مند انسان مسعود محمود کو قتل جیسے گھناؤنے جرم کی سازش میں کیوں شریک کرتا جبکہ میاں عباس شروع سے ایف ایس ایف کے صدر دفتر میں کام کر رہا تھا اور بھٹو کے سٹاف افسران سے اُس کے مراسم تھے۔ وہ خود میاں عباس کو بلا کر یاد دہانی کرا سکتا تھا جو زیر بحث نوعیت کی سازش میں اُن کیلئے سب سے زیادہ محفوظ اور فطری بات ہوتی۔

ایسی ہی وجوہات کے باعث میں مسعود کے اس دعویٰ کو بھی غلط سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا حکم دینے کے بعد وہ سعید احمد خان کی معرفت بھی میاں عباس کو پیغام بھجواتے اور کام کی یاد دہانی کراتے رہے۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ ساری کہانی ناقابل یقین لگتی ہے جب تک یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ مسٹر بھٹو اتنے ناسمجھ اور اناڑی تھے کہ انہیں اپنے مذکورہ بالا طرز عمل کے مضمرات کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ اگر ان دونوں گواہوں (مسعود اور سعید احمد) کا اس سازش میں یہی کردار تھا جیسا کہ استغاثہ کا دعویٰ ہے تو کوئی

www.bhutto.org

عدالت اس پر کیسے یقین کر سکتی ہے۔ یہ کام تو بھٹو میاں عباس کو یاد دہانی کرا کے خود بھی انجام دے سکتے تھے۔ ہائیکورٹ نے اس ساری شہادت کو قبول کرلیا ہے اور اس کے غیر فطری پن کو نظرانداز کر دیا ہے۔

مسعود محمود نے مزید بیان کیا کہ 11 ر نومبر 74ء کو وہ بھٹو کے ساتھ دورہ پر ملتان میں تھا۔ بہت صبح سویرے جبکہ وہ بستر میں ہی تھا بھٹو نے اسے فون پر نواب محمد احمد خان کے قتل سے مطلع کیا اور اُسے بعد میں صادق قریشی کی اقامت گاہ پر آنے کو کہا جب وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وزیراعظم نے بڑی بے نیازی کے ساتھ مسعود سے کہا "میں نے سنا ہے کہ گذشتہ رات مسٹر قصوری کے والد کو لاہور میں کسی نے قتل کر دیا ہے" اس نے جواب دیا "ہاں میں نے بھی ایسا ہی سنا ہے"۔ اس کے بعد وہ راولپنڈی کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے میاں عباس کو بلایا اس نے مسعود کو بتایا کہ آپریشن میں قصوری کا باپ ہلاک ہو گیا ہے۔ بعدازاں بھٹو نے اُسے طلب کر کے سخت برہمی کا اظہار کیا کہ "اصل کام کیوں مکمل نہیں ہوا؟" اس موقع پر مسعود نے دوٹوک جواب دے دیا کہ آئندہ وہ ایسے غیر قانونی کام ہرگز نہیں کرے گا۔ اُس کے نتیجہ میں اسے قتل کی دھمکیاں ملیں 'اس کے بچوں کے اغوا کی اور اُسے کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی گئی۔

یہ درست ہے کہ قصوری کا باپ 10 ر نومبر 74ء کی رات کو لاہور میں قتل ہو گیا تھا۔ سوال یہ ہے آیا یہ ممکن ہے کہ بھٹو نے صبح سویرے جبکہ وہ بستر میں ہی تھا اُس سے یہ کہا ہو گا کہ "میاں عباس نے سارا کام خراب کر دیا ہے۔ اُس نے قصوری کی بجائے اُس کے باپ کو قتل کرا دیا ہے" یہ بات سب نے تسلیم کی ہے کہ بھٹو کا مسعود کے ساتھ براہ راست رابطہ تھا۔ اسلئے یہ بات ناقابل یقین ہے کہ مسٹر بھٹو جو اس سازش کا مرکزی کردار تھے مسعود کے ساتھ عام فون پر بات کرتے۔ مسعود کے دعویٰ کی نامعقولیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ کچھ دیر بعد بھٹو نے اُسے صادق قریشی کے ہاں طلب کیا تو اس کے سامنے وہی بات دہرا دی جو پہلے فون پر بتا چکے تھے 'گویا اس کے ساتھ ہونے والی پہلی گفتگو مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کیلئے کافی نہ تھی۔

اس صورتحال میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ بھٹو نے پہلے صبح سویرے اسے فون کیا اور پھر صادق قریشی کے گھر بلایا جبکہ مسعود کے ڈرائیور منظور حسین نے جو متعلقہ وقت میں اُس کے ساتھ تھا۔ اس بات سے انکار کیا ہے کہ اُس روز مسعود صادق قریشی کے گھر گیا تھا۔ ریکارڈ پر کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ مسعود خود کار ڈرائیونگ کر کے صادق حسین قریشی کے ہاں پہنچا تھا۔ استغاثہ نے مسعود کے اس دعویٰ کو ثابت کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ وہ واقعی مسٹر بھٹو سے ملنے قریشی کے گھر گیا تھا۔ اس حقیقت پیش نظر اس کی ساری گواہی استرداد کے لائق تھی۔ بہرحال میں اس کے مذکورہ بالا دعویٰ کو قبول نہیں کرتا۔

مسعود پر کی گئی جرح کو زیر غور لاتے وقت میری کوشش یہ ہوگی کہ دوسری باتوں کے علاوہ یہ ثابت کیا جائے کہ اُس کا یہ کہنا سفید جھوٹ ہے کہ ملتان سے راولپنڈی آنے پر میاں عباس سے ملا تھا کیونکہ میاں

www.bhutto.org

عباس اُس روز پشاور گیا ہوا تھا جہاں سے وہ 12 ر نومبر کو شام کے 7 بجے لوٹا۔ جیسا کہ دستاویزی شہادت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے دراصل وہ اپنے اس بیان کے ذریعے حسبِ ذیل مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔

(1) ..... خود کو ایک معصوم اور بے گناہ ایجنٹ ثابت کرنا۔

(2) ..... یہ کہ وہ خدا سے ڈرنے والا انسان ہے اور اُس سے پہلے کئے گئے غلط کاموں کا حساب لیا جائے گا۔

(3) ..... بھٹو کے سامنے اس کا سرکشانہ رویہ اور یہ کہنا کہ آئندہ میں اس طرح کے غیر قانونی احکام پر عمل نہیں کروں گا۔

اُس کی گواہی کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک وقت میں وہ بڑا بزدل ہوتا ہے اور دوسرے لمحے بڑا دلیر اور نڈر بن جاتا ہے۔ اور تیسرے لمحے ایک خدا ترس اور صاحبِ ضمیر انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں بھٹو کے تکلیف دہ دباؤ کی مزاحمت کا حوصلہ یا بنیادی انسانی شرافت بھی نہ تھی۔ وہ فوراً قصوری کے قتل کی گھناؤنی سازش میں شریک ہو گیا تو اس کی اس بات پر کیسے یقین کر لیا جائے کہ اس نے بھٹو کے سامنے باغیانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے خلاف قانون احکام ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ 1974ء میں بھٹو ایک مضبوط وزیر اعظم کی حیثیت رکھتے تھے اسلئے مسعود کی شہادت پر یقین کرنا مضحکہ خیز ہو گا کہ وہ اُن کے ساتھ بیان کردہ انداز میں مخاطب ہوتا اور پھر اگلے تین برس (5 جولائی 77) تک ایف ایس ایف کے ڈی جی کے منصب پر فائز رہتا۔

ایسی ہی وجوہات کی بناء پر اُس کے اس بیان کو قبول نہیں کیا جا سکتا کہ بھٹو کے ساتھ مذکورہ بالا جھڑپ کے بعد اُسے دھمکیاں دی گئیں۔ اُس پر حملے کئے گئے اُس کے بچوں کو اغواء کرنے اور اسے کھانے میں زہر دینے کی کوششیں کی گئیں جبکہ ریکارڈ پر ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک آدھ کوشش کامیاب ہوئی یا نہیں۔ یہ دعویٰ محض اُس کے دماغ کی اختراع لگتا ہے تاکہ یہ ظاہر کیا جا سکے کہ اُس کا مسلسل تعاقب کیا جاتا رہا اور ایذائیں دی جاتی رہیں' اگر بھٹو واقعی ظالم اور اُس کی جان کے درپے ہوتے تو مسعود کو ٹھکانے لگانے میں انہیں ہرگز دقت نہ ہوتی۔

مسعود محمود کا یہ دعویٰ کہ بھٹو اور وقار احمد دونوں اس کے دشمن تھے حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا کیونکہ وہ تو سارا عرصہ بڑے مزے میں رہا۔ اسے ہر طرح کی آسائش حاصل رہی' بیرون ملک دوروں پر جاتا رہا اور 5 ر جولائی 77ء تک اپنے اعلیٰ منصب پر فائز رہا۔

سازش کی بابت جرح میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں اُس نے کہا کہ اس سلسلے میں میرے پیشرو ٹوانہ کو ضروری ہدایات دیدی گئی تھیں۔ میں نے میاں عباس کو کوئی پلان نہیں دیا۔ اگست 74ء میں قصوری پر ہونے والے حملہ کے بارے میں اُس کا کہنا ہے کہ اُس نے اس کے متعلق سرسری سا سنا تھا۔ اس کے اس جُز کا تجزیہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میاں عباس کو یاد دہانی کرانے کے علاوہ کوئی

www.bhutto.org

کردار ادا نہیں کیا۔

مسعود محمود کی شہادت کے یہ اہم اجزائے ترکیبی ہیں۔ میں نے ارادتاً پہلے ابتدائی سوال کے جواب اور پھر جرح کے اہم پہلوؤں سے بحث کی ہے تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ اس کی شہادت کا ہر جز یا تو غیر فطری اور ناقابل یقین ہے یا اپنے اندر صداقت کی ایک رمق بھی نہیں رکھتا۔ اس مشقت کے باوجود اگر اس کی شہادت کے بارے میں کوئی حسنِ ظن ہے تو وہ ان اضافوں 'تضاد بیانیوں اور بہت سی فروگذاشتوں سے دور ہو جاتا ہے جو جگہ جگہ پائی جاتی ہیں اور وکیلِ صفائی نے کُھل کر ان کی نشاندہی کی تھی اور یہاں انہیں دہرانا محض تضیعِ اوقات ہو گا۔

اب اس بات کی طرف آتے ہیں کہ آیا ریکارڈ پر کوئی ایسی شہادت موجود ہے جو مسعود محمود کی گواہی کی تائید کرتی ہو۔ استغاثہ نے اس سلسلہ میں سعید احمد خان 'ایم آر ویلچ کی گواہی نیز بھٹو کے مابعد رویہ پر انحصار کیا ہے۔ اگرچہ میں محرک پر بحث کرتے ہوئے ان دونوں گواہوں کی شہادت نیز بھٹو کے مابعد رویہ کے بارے میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ بایں ہمہ اس موضوع پر کچھ مزید بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سعید احمد خان کی شہادت کا تجزیہ کرنے کے بعد میں پہلے قرار دے چکا ہوں کہ وہ ایک جھوٹا اور ناقابل اعتبار گواہ ہے۔ ایسا قرار دینے کیلئے میں نے اُس کی زبانی اور بہت سی دستاویزات جن پر اس نے انحصار کیا' کو پہلو بہ پہلو رکھ کر پرکھا ہے۔ اسلئے اس کی بقیہ زبانی شہادت لازماً لائقِ استرداد ہے مزید برآں اُس کی شہادت میں استغاثہ کے کیس کے ہر اہم جز پر نمایاں اضافے موجود ہیں جن کا اس نے زیرِ دفعہ 161 بیان میں کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ ان اضافوں اور تضادات کی وکیلِ صفائی نے بڑی شرح و بسط سے نشاندہی کی اور عرض کیا کہ ان اضافوں اور تضادات سے لگتا ہے کہ گویا اُس نے خود اپنی تردید کی ہے۔ ان کی یہ دلیل وزن رکھتی ہے۔ سعید احمد خان کی طرف سے کئے گئے ہر اضافہ پر سرسری نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ان میں ذرا بھی صداقت ہوتی تو وہ اسے اس وقت یاد ہونے چاہئیں تھے جب اُس نے زیرِ دفعہ 161 بیان دیا تھا کیونکہ وہ اتنے اہم ہیں کہ انہیں بھولنا ممکن نہیں تھا۔ اسلئے میری رائے یہ ہے کہ میں نے مسعود محمود کی گواہی کے جن پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ انہی خطوط پر سعید احمد خان کی شہادت میں پائے جانیوالے اضافے قانون شہادت کی دفعہ 145 کے تحت تضادات کے مترادف ہیں ان تضادات پر غور کرتے ہوئے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ وہ سچا گواہ نہیں ہے۔ اسلئے اُس کی شہادت پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

استغاثہ کی راہ میں ایک اور الجھن یہ ہے کہ سعید احمد خان ایک "شریک جرم" نوعیت کا گواہ ہے کیونکہ اس کا کردار معین بعد وقوع جرم ہے۔ وکیل استغاثہ کو اس سے اتفاق نہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سعید احمد خان نے تفتیش کا رخ موڑنے میں جو کردار ادا کیا وہ بھٹو کے ایک بے گناہ ایجنٹ کا تھا کیونکہ اسے علم نہیں تھا کہ آخر الذکر خود نواب محمد احمد خان کے قتل کا ذمہ دار ہے۔

www.bhutto.org

مجھے افسوس ہے ریکارڈ پر موجود شہادت اور جس طریقہ سے ٹرائل جج نے گواہی پر انحصار کیا وہ برعکس صورتحال کی مظہر ہے۔ ہائیکورٹ نے فیصلہ کے پیرا نمبر 469 میں اُسے ایک آزاد گواہ قرار دیا ہے۔ تاہم پیراہائے نمبر 207، 502، 505 اور 506 پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تفتیش میں سعید احمد خان کی مداخلت کے باوجود محمد وارث آگے بڑھنے میں قطعاً ناکام رہا۔ اسلئے کسی شکوک وشبہ کے بغیر یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ بڑے ملزم کی طرف سے سعید احمد خان کو جو رہنما خطوط دیئے گئے اور اُس نے ملک وارث کو بتائے' وہ درست نہیں تھے اور اصل مجرموں کا سراغ لگانے کی غرض سے نہیں دیئے گئے تھے۔ محض تفتیشی افسر کو بھٹکانا مقصود تھا۔ وکیل سرکار کا موقف ہے کہ ہائیکورٹ کی تجویز سعید احمد خان کو زیادہ سے زیادہ "شریک بعد وقوع جرم" ٹھہراتی ہے۔ قانونِ شہادت کے تحت اسے "شریک جرم" نہیں بناتی۔ اپنی دلیل کی حمایت میں انہوں نے بہت سے فیصلوں کے حوالے دیئے۔ میں وکیل سرکار کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتا ہوں اس کے برعکس مسٹر بختیار کا استدلال یہ ہے کہ اس کی حیثیت شریک جرم کی ہے اسلئے اس کی شہادت قبول نہیں کی جاسکتی۔ تاوقتیکہ اس کی تائید موجود نہ ہو۔ انہوں نے بھی اپنے استدلال کی حمایت میں متعدد نظائر کا حوالہ دیا۔ برصغیر کی عدالتوں نے ایک صدی سے یہ نقطہ نظر اپنا رکھا ہے کہ "معین بعد وقوع جرم" خواہ وہ کسی جرم میں حصہ دار نہ ہو' شریک جرم سے بہتر نہیں ہوتا۔ میں اس رائے کا احترام کرتا ہوں اور اعجاز بٹالوی نے پاک وہند نیز برما کی مختلف ہائی کورٹس کے جن فیصلوں کا حوالہ دیا ہے انہیں مسترد شدہ قرار دیتا ہوں۔ میں مسٹر بختیار کی اس دلیل سے متفق ہوں کہ اگر سعید احمد خان "شریک جرم" کے زمرہ میں نہیں آتا تو وہ شریک جرم کے قریب قریب ہے اسلئے اُس کی گواہی کو تائید میسر آئے بغیر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ سعید احمد خان کوئی عام گواہ نہیں تھا جسے اپنے افعال اور غلط طرزِ عمل کے نتائج کا احساس نہ ہو وہ صوبہ سرحد میں آئی جی رہ چکا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اصلی قاتلوں کو چھپانے کیلئے تفتیش میں مداخلت جاری رکھی تو میری رائے یہ ہے کہ وہ استغاثہ کے بقول "بے گناہ ایجنٹ" نہیں تھا بلکہ ایک شریک جرم یا شریک جرم کی نوعیت کا گواہ تھا۔ پس اُس کی گواہی تائید کے بغیر قبول نہیں کی جاسکتی چونکہ ریکارڈ پر اس کی تائید میں کوئی شہادت موجود نہیں نتیجتاً اس کی گواہی ناقابلِ قبول ہے۔

اس کے بعد ایم آر دیہیج کی گواہی رہ جاتی ہے میں محرک کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس کی شہادت پر خاصی روشنی ڈال چکا ہوں اور میں نے اس پر اعتبار نہیں کیا جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے اور مسعود محمود کے مابین لارڈ ہوٹل (کوئٹہ) میں پانچ منٹ کی جو اتفاقیہ ملاقات ہوئی' اُس میں مسعود محمود نے دیہیج کو قصوری کے قتل کی ممکنہ ہدایات نہیں دی تھیں کیونکہ وہ تو اسے سرسری جانتا تھا۔ بہرحال متعدد خفیہ رپورٹوں کے معائنہ سے جو اس نے مسعود کو پیش کی تھیں اُن کے مابین ہونے والی مراسلت نیز اُس کی زبانی گواہی کی بناء پر میں نے اُس پر یقین نہیں کیا۔

ہائیکورٹ نے پیرا نمبر 43 میں قرار دیا ہے کہ واردات کے اصل خول میاں عباس نے

www.bhutto.org

بدل دیئے تھے تاکہ تفتیش کو غلط سمت میں ڈال کر ایف ایس ایف اور بھٹو کو تحفظ فراہم کیا جاسکے۔ یہ تجویز ریکارڈ کرتے وقت عدالت نے گواہان استغاثہ عبدالوکیل خان، محمد بشیر، محمد سرور، عبدالاکرام، فضل علی، نزل زوار حسین، عبدالحئی نیازی اور نادر حسین عابدی کے علاوہ بہت سی دستاویزات پر انحصار کیا ہے۔ اس ضخیم شہادت کو ملاحظہ کرنے کے بعد ہائیکورٹ کی رائے سے اتفاق نہیں کر سکا۔ کیونکہ ۔

(1) مذکورہ بالا گواہوں کی شہادت غیر فطری اور ناقابل یقین ہے۔

(2) یہ کہ لازمی نکات میں ان کی گواہیاں اضافوں سے پر ہیں۔

(3) یہ کہ زیادہ تر دستاویزی شہادتیں نہ صرف مشکوک نوعیت کی ہیں بلکہ کلیتاً کوئی یقین پیدا نہیں کرتیں۔

ایسا لگتا ہے کہ وکیل استغاثہ کو بھی ان خامیوں کا احساس ہو گیا تھا کیونکہ بحث کے دوران انہوں نے حسب ذیل دلیل پیش کی تھی "میں قطعی طور پر یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ خالی کارتوسوں میں ردو بدل کی یقینی شہادت موجود ہے۔ تاہم خاصی شہادت اس طرف اشارہ کرتی ہے۔ تاخیر اور دوسرے حالات ثابت کرتے ہیں کہ برآمد کردہ خول اصلی نہیں ہیں میری گزارش یہ ہے کہ یہ کوئی نظریہ نہیں۔ اس کا غالب احتمال ہے کہ خول تبدیل کئے گئے تھے۔ غالب احتمال کے بارے میں شہادت کی تصویر کو اجتماعی تصویر سے اندازہ کرنا چاہئے۔ اس مضبوط استنباط کا امکان موجود ہے کہ خول بدل دیئے گئے تھے۔"

میں ان گواہوں کی شہادت پر ترتیب وار بحث کروں گا۔ عبدالحئی نیازی نے اپنی شہادت میں خالی کارتوسوں میں ردو بدل کے نظریہ کی بنیاد رکھی۔ اسکا کہنا ہے ۔

"11 نومبر 74ء کی رات کو نو/دس بجے کے قریب عبدالاحد ڈی ایس پی نے جس کا دفتر تھانہ سے متصل واقع تھا، مجھے کہا کہ میں اسکے ہمراہ آئی جی کے گھر چلوں کیونکہ انہوں نے حکم دیا ہے کہ وقوعہ کے برآمد کردہ 24 خول اور مقتول کی ٹوپی انہیں دکھائی جائے۔ ڈی ایس پی مطلوبہ اشیاء خاکی لفافہ میں ڈال لیں اور ہم آئی جی کے بنگلہ پر پہنچ گئے۔ میں اور ڈرائیور جیپ میں بیٹھے رہے اور ڈی ایس پی وہ چیزیں لیکر اندر چلا گیا۔ قریباً آدھ گھنٹہ بعد اس نے باہر آکر بتایا کہ آئی جی صاحب نے خول اپنے پاس رکھ لئے ہیں اور کہا ہے کہ تفتیش انکے احکام کے مطابق ہونی چاہئے۔ یہ کہ 13 نومبر 74ء کو ڈی ایس پی نے اس سے جائے وقوعہ کا نقشہ لیا اور اور راولپنڈی چلا گیا۔ واپسی پر اس نے مجھے بلایا اور برآمد شدہ اشیاء کی فہرست کا مسودہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ وزیراعظم ہاؤس سے دیا گیا تھا مجھے اسکی نقل کرانی چاہئے اس کی تعمیل میں میں نے فرد برآمدگی تیار کی۔ میں نے ڈی ایس پی کو آگاہ کیا کہ میری تیار کردہ فرد میں کھوکھوں کے نشانات ( ) ان نشانوں سے مختلف ہیں جو اصل کھوکھوں پر کھدے ہوئے تھے۔ اس نے جواب دیا یہ سب کچھ اوپر کے احکام کے تحت کیا گیا ہے ہم ان احکام کی خلاف ورزی کریں گے تو

www.bhutto.org

ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے"

اُس کے اس بیان پر مزید بحث کئے بغیر میں جرح کی طرف آتا ہوں۔ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ وہ کس قدر جھوٹا ہے اور اسکی گواہی سراسر ناقابل اعتبار ہے۔

جرح میں نیازی نے اعتراف کیا کہ وہ شفیع الرحمٰن ٹریبونل میں بطور گواہ پیش ہوا تھا اور وہاں اس نے تین بیان دیئے تھے۔ وکیل صفائی نے اسکے بیانوں کے حوالہ سے متعدد سوال کئے جن کے جواب اس نے اکثر و بیشتر نفی میں دیئے اور کہا

"اُس وقت میں دباؤ میں تھا اور آزادی سے کام نہیں کر سکتا تھا"

یہ گواہ زیر نظر مقدمہ میں تفتیشی افسر رہ چکا تھا اُس کے اس بیان کے علاوہ کہ آئی جی اور ڈی آئی جی نے اس پر دباؤ ڈالا تھا' ریکارڈ پر اس کی تائید کرنے والی کوئی شہادت موجود نہیں۔ یہ کہ استغاثہ نے آئی جی کا اظہار نہیں لیا اور ڈی آئی جی نے گواہ کے اس دعویٰ کی تردید کی ہے اسلئے میں اس کی شہادت پر یقین نہیں کر سکتا۔

اگلا گواہ فضل علی ہے جو متعلقہ وقت میں ایف ایس ایف کے اسلحہ خانے کا انچارج تھا۔ استغاثہ نے اس کا اظہار درج ذیل مقاصد کیلئے لیا تھا -

1..... یہ کہ اسلام آباد اور لاہور کے واقعات میں استعمال ہونے والا اسلحہ ایک ہی لاٹ نمبر کا تھا اور ایس ایم جی / ایل ایم جی میں استعمال ہونے والا تھا۔

2..... اسی لاٹ میں سے اُس نے غلام حسین کو کچھ اسلحہ دیا تھا۔

..... یہ کہ اوائل اگست 74ء میں اُس نے غلام حسین کو ایک جیپ پر ایک سٹین گن' دو میگزین 'ایک پستول اور 60 روند دیئے تھے۔

4..... یہ کہ 25 ر نومبر 74ء سے دو تین دن پیشتر غلام حسین وہ اسلحہ واپس کرنے آیا جو 9 ر مئی کو لے گیا تھا۔ اس میں سے ایس ایم جی کے 51 روند کم تھے اسلئے میں نے اسلحہ لینے سے انکار کر دیا۔

5..... یہ کہ اُسی دن وہ دوبارہ آیا اور پورا اسلحہ جمع کرا دیا۔

استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ لاہور اور اسلام آباد کے واقعات میں استعمال ہونے والا ایمونیشن ایک ہی لاٹ نمبر کا تھا جو غلام حسین کو دیا گیا لیکن اس خیال سے کہ کوئی بھٹو یا ایف ایس ایف پر شک نہ کرے' میاں عباس نے وقوعہ کے اصل خول اس طرح تبدیل کرا لئے جیسا کہ فضل علی نے اپنی شہادت میں بیان کیا ہے۔ جبکہ ماہر اسلحہ کی رپورٹ یہ تھی کہ وہ کارتوس ایف ایس ایف کی تھرڈ بٹالین کے زیر ملکیت 25 سٹین گنوں میں سے کسی سے بھی فائر نہیں کئے گئے تھے۔ وکیل استغاثہ کا کہنا ہے کہ ماہر اسلحہ کے پاس جو خول بھیجے گئے وہ تبدیل شدہ تھے۔ اسلئے اس کی رپورٹ منفی تھی۔ استغاثہ کے دعویٰ میں پہلی خامی یہ ہے کہ 24 خول آئی جی کے پاس سے میاں عباس تک کیسے پہنچے۔ اس سلسلہ میں ریکارڈ پر کوئی شہادت موجود نہیں۔ یہ قرائنی شہادت ہے جس کی ایک کڑی بھی گم ہو جائے تو معاملہ مشکوک ہو جاتا ہے اسلئے اس

www.bhutto.org

پر یقین کرنا مشکل ہے۔

علاوہ ازیں وکیلِ استغاثہ کے اس موقف سے اتفاق کرنا بھی مشکل ہے کہ تھانہ اچھرہ میں موجود مختلف دستاویزات میں محمد بشیراور عبدالاکرام نے نیازی کے ایماء پر جعلی اندراج کئے تھے۔ یہ موقف اس کی اپنی شہادت کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔اگر گواہوں نے سرکاری ریکارڈ میں جعل سازی کرنے میں ضمیر کی کوئی خلش محسوس نہیں تو گواہی کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر انہوں نے جو جو کچھ کہا اس پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے؟

فضل علی کی گواہی میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اگر میاں عباس اپنے ذرائع سے ایس ایم جی کے 51 کھوکھے حاصل کر سکتا ہے تو اس کے لئے 24 کھوکھوں کا حصول کونسا مشکل کام تھا۔ فضل علی کے دعویٰ کی نامعقولیت اس حقیقت سے آشکارا ہوتی ہے کہ "جب میں میاں عباس کی ہدایت پر مال خانہ سے 24 کھوکھے لایا تو وہ حیرت انگیز طور پر ہر لحاظ سے اصل کھوکھوں سے مطابقت رکھتے تھے جو جائے واردات سے ملے تھے"۔ خیالی باتوں کی آخر کوئی حد ہوتی ہے لیکن نیازی محمد بشیر' عبدالاکرام اور فضل علی کو تخیل کی پرواز میں کھلی چھٹی تھی' اس لئے وہ الف لیلہ کے پرستان کو بھی پار کر گئے۔ فضل علی کی شہادت میں جو بہت سی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں وہ تضادات کے مترادف ہیں اسلئے اس کی شہادت ناقابل اعتبار ہے۔

بلاشبہ محمد بشیر نے کھوکھوں میں ردوبدل کے نظریہ کی تائید کی ہے لیکن اس کی شہادت بھی غیر فطری اور ناقابل یقین ہے۔

اس سلسلے میں اگلا گواہ محمد سرور ہے۔ اُس نے جرح میں جو غلط بیانیاں کیں' ان کی روشنی میں اس کی گواہی بھی قرین قیاس ویقین نہیں۔ عبدالاکرام کی شہادت بے شک فضل علی اور محمد بشیر کی تائید کرتی ہے لیکن وہ بھی غیر فطری' بعید از قیاس اور اضافوں سے بھری ہوئی ہے' اسلئے میں اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں پھر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ تفتیش کے دوران اُس کا اظہار نہیں لیا گیا تھا۔ اسلئے بھی اس کی گواہی مشکوک ہو جاتی ہے۔

اگلے گواہ عبدالوکیل نے خالی کارتوسوں میں ردوبدل کی بابت گواہی دی ہے۔ تاہم اُس نے عدالت میں بیان دیتے وقت اپنے سابقہ بیان اور پھر جرح کے دوران بہت زیادہ اضافے کئے جو تضادات کے مترادف ہیں اسلئے اُس کی شہادت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

یہ امر حوس' جث سے مختلف ووچرز اور سرٹیفیکٹس اور دیگر دستاویزات کی تفصیل میں جانا محض وقت کا ضیاع ہو گا کیونکہ استغاثہ ان سے جو کچھ ثابت کرنا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دونوں وارداتوں میں جو اسلحہ استعمال کیا گیا وہ ایک ہی کیلیبر کا تھا اور ایک ہی لاٹ نمبر سے غلام حسین کو جاری کیا گیا تھا جس نے دونوں حملے منظم کئے اور ان کی نگرانی کی' غلام حسین کی شہادت کے تجزیہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ استغاثہ کے حق میں کارآمد اور یقین افزا نہیں ہے اس کی گواہی انتہائی لغو' غیر فطری' بعید از قیاس اور جھوٹی ہے۔

عدالت عالیہ کا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے اس شہادت سے برعکس نتیجہ اخذ کرتے وقت ایسا لگتا ہے کہ اس نے گواہوں کی شہادت اور مذکورہ بالا متعدد دستاویزات کو مناسب جانچ پڑتال کے بغیر قبول کر لیا۔ جس سے یہ امکان خارج ہو سکتا تھا کہ اس گواہی کی دوسرے معقول قیاس کی بنیاد پر بھی وضاحت کی جا سکتی ہے گواہان استغاثہ کی شہادت جبکہ ہم اس پر استغاثہ کے دعویٰ کے اجتماعی تناظر میں غور کریں' نہ صرف غیر فطری اور غلط لگتی ہے بلکہ عدالت میں بیان قلمبند کراتے وقت اس میں نمایاں اور بڑے بڑے اضافے کئے گئے ہیں۔ جن کا ہائیکورٹ نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ عدالت عالیہ میں پھر ادب کے ساتھ عرض کروں گا' خود کو محض استغاثہ کے کیس کے غالب امکانات کی حمایت کرنے کے راستہ پر ڈال لیا جو کہ درست نہیں تھا' یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ بار ثبوت ہمیشہ مدعی (استغاثہ) کے کندھے ہوتا ہے اور شہادت سے پیدا ہونے والے شک کا فائدہ ملزم کو دیا جاتا ہے۔ فوجداری انصاف سے تعلق یہ بنیادی اور واضح اصول عدالت عالیہ نے زبانی و تحریری شہادت قلمبند کرتے وقت پیش نظر نہیں رکھا۔ اسلئے اس کی مذکورہ تجویز کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ اگر استغاثہ کا مقصد بظاہر ایسا ہی لگتا ہے' یہ ثابت کرنا تھا کہ خالی کارتوسوں میں ردوبدل کیا گیا تھا تو میاں عباس نے (جسے ردوبدل کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے) فضل علی کو اعتماد میں لینے کا چکر دار پر خطر اور غیر فطری راستہ اختیار کرنے کی بجائے ان کھوکھوں کو 303 یا کسی اور کیلیبر کے کھوکھوں سے کیوں نہ بدل لیا جبکہ استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ وہ بڑا صاحب تدبیر تھا اور اس نے غلام حسین کے گم شدہ 51 کھوکھے پورے کر دیئے تھے۔ اسی طرح یہ بات ناقابل یقین ہے کہ 75-1974ء میں تفتیش کے دوران کسی گواہ استغاثہ پر دباؤ ڈالا گیا تھا کیونکہ نیازی نے پہلے ہی ایف آئی آر درج کر لی تھی جس میں بھٹو کا نام درج تھا اور شفیع الرحمٰن ٹریبونل میں عبدالوکیل خان کے زور دار بیان کے باوجود جس میں اس نے اپنے آئی جی بلکہ سعید حمد خان اور باجوہ کے طرز عمل پر شدید نکتہ چینی کی تھی' حکومت نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔

اس سے آگے فاضل جسٹس نے بڑی طویل بحث اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ بھٹو کی سزا یابی پر دفعہ 111 ت ب کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس ساری طویل بحث سے' جس کا غالب حصہ گواہان استغاثہ کی شہادت کے جزیہ لیلئے وقف رہا' میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ عدالت عالیہ نے' احترام کے ساتھ عرض کرتا ہوں' ان کی گواہی کو فوجداری انصاف رسانی کے مسلمہ اصولوں کے تحت چھان بین کے بغیر قبول کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ نوعیت کے کیس میں بار ثبوت کی بابت بھی خیالات میں گڑبڑ ہے۔ دلائل کے دوران وکیل استغاثہ نے اس بات پر زور دیا کہ مقدمہ کا فیصلہ غالب احتمالات کی بنیاد پر ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں قانون شہادت کی دفعہ 3 پر انحصار کیا۔

میں مسٹر یحییٰ بختیار کے اس موقف سے پوری طرح متفق ہوں کہ ہائیکورٹ نے مسٹر بھٹو کے بارے میں "بڑے ملزم" کی جو ترکیب استعمال کی' وہ نامناسب تھی۔ مسٹر بھٹو حملہ کے وقت جائے واردات پر ہی نہیں تھے از روئے قانون انہیں "معین لبعد وقوع جرم" کہا جا سکتا ہے۔ "بڑے ملزم" کی ترکیب کا

www.bhutto.org

اطلاق ارشد اقبال اور رانا افتخار پر ہو سکتا ہے جنہوں نے واقعتاً قصوری کی کار پر فائرنگ کی تھی۔

مجھے اس بارے میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ استغاثہ مسٹر بھٹو اور میاں عباس کے خلاف اپنا کیس ثابت کرنے میں سراسر ناکام ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان کی اپیلیں منظور کی جاتی ہیں۔ نتیجتاً ہائیکورٹ نے انہیں جو سزائیں دی تھیں وہ کالعدم ہوگئی ہیں اور ہدایت کی جاتی ہے کہ انہیں فوری طور پر رہا کر دیا جائے بشرطیکہ وہ کسی اور مقدمے کے سلسلہ میں مطلوب نہ ہوں۔ جہاں تک غلام مصطفیٰ' ارشد اقبال اور رانا افتخار کا تعلق ہے ان کی پوزیشن مختلف ہے۔ کیس کے بالکل ابتدائی مرحلوں سے لیکر آخر تک انہوں نے نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا بلکہ ان کی طرف سے پیروی کرنے والے فاضل وکیل نے پوری سماعت کے دوران استغاثہ کے کیس کی حمایت کی۔ ریکارڈ پر موجود شہادت سے جس کی تائید ان کے اقبالی بیانوں سے ہوتی ہے میں ادنیٰ شائبہ کے بغیر مطمئن ہوں کہ وہ تینوں قصوروار ہیں چنانچہ ہائیکورٹ کی طرف سے ان کے خلاف اثباتِ جرم اور دی گئی سزائیں درست ہیں۔

www.bhutto.org

بارھواں باب

نظرثانی کی درخواست

سپریم کورٹ نے اپیل کا فیصلہ 6 ر فروری 79ء کو سنایا نظرثانی کی درخواست دائر کرنے کے لئے 7 دن کی مہلت دی گی تھی۔ یحییٰ بختیار نے اپنے نائب وکلاء کو جو ملک کے مختلف حصوں میں پریکٹس کرتے تھے پھر اکٹھا کیا۔ بختیار کا خیال تھا کہ اس فیصلے میں ریکارڈ پر موجود شہادتوں کو غلط پڑھا گیا۔ حقائق کی غلط تشریح کی گئی اور قانون کا غلط اطلاق کیا گیا جس کیوجہ سے صحیح انصاف نہیں ہوا۔ نظرثانی کی درخواست کا مقصد انہی غلطیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرنا تھا۔ صفائی کے وکلاء نے نظرثانی کی درخواست کی تیاری پر دن رات کام کیا۔ یہ درخواست 97 صفحات پر مشتمل تھی۔ صفائی کے خیال کے مطابق انہوں نے اکثریتی فیصلہ میں جو بڑی غلطیاں کی تھیں درخواست میں ان کی نشاندہی کر دی گئی تھی۔ صفائی کو یقین تھا کہ چیف جسٹس نے اپنے فیصلہ میں ان کی طرف سے قائم کی گئی تنقیحات کو نظرانداز کر دیا اور ان کے دلائل کا کوئی جواب نہیں دیا۔

درخواست پر دلائل

درخواست 13 ر فروری کو داخل کر دی گئی۔ عدالت کا اجلاس 14 ر فروری کو ہوا۔ اگرچہ عدالت نے نظرثانی کی درخواست کی سماعت سے پہلے سزا پر عملدر آمد روکنے کے لئے حکم امتناعی جاری کر دیا تھا لیکن کوئی میعاد مقرر نہیں کی تھی۔ درخواست کی سماعت کی منظوری کے لئے درخواست دینے کی تاریخ 24 ر فروری مقرر کی گئی۔

مسٹر حفیظ پیرزادہ نے جو رہائی کے بعد کھنو کے وکلائے صفائی میں شامل ہو گئے تھے۔ ایک جداگانہ

www.bhutto.org

درخواست تیار کی جس میں استدعا کی گئی کہ جسٹس وحید الدین اور جسٹس قیصر خان کو نظر ثانی کی درخواست کی سماعت کرنے کا موقع دیا جائے۔

پیرزادہ نے ایک اور درخواست تیار کی جو خود چیف جسٹس کے خلاف تھی کہ ان کی تقرری غیر قانونی ہے۔ درخواست میں چیف جسٹس کی ستمبر 77ء سے اچانک ختم کئے جانے کا ذکر تھا کیونکہ سابق چیف جسٹس نے مارشل لاء کی اطاعت کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا لیکن اس درخواست کی سماعت میں اتنی تاخیر کر دی گئی کہ نظر ثانی کی درخواست کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ یوں یہ درخواست خود بخود غیر موثر ہو گئی تاہم ہر شخص کو یقین تھا کہ کوئی بھی جج یہ فیصلہ نہیں دے گا کہ چیف جسٹس کی تقرری غیر قانونی تھی۔

3 مارچ کو بھٹو نے بھی چیف جسٹس کو ایک طویل خط ارسال کیا جس میں وہ پھٹ پڑے اور ان کے غلط اقدامات اور منفی رویوں کا ذکر کیا جو اپیل کی پوری سماعت کے دوران دیکھنے میں آئے تھے۔ اس خط میں انوار الحق کے قائمقام صدر بننے اور جکارتہ کے دورے پر جانے کے ذکر کے ساتھ ساتھ یہ شکایت بھی کی گئی تھی کہ بھٹو نے جیل میں اپنے علاج کی بابت جو شکایات کی تھیں، چیف جسٹس نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ سپریم کورٹ میں اپنی حاضری اور بولنے کی اجازت دینے کے عمل کو بھٹو نے انوار الحق کا ماہرانہ کارنامہ (   ) قرار دیا جس کے ذریعے مقدمہ کی سماعت اور اپیل میں موجود "تمام خامیوں اور حذف اضافہ" کی تلافی کر دی گئی۔ انہوں نے فیصلہ پر کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا "روئے زمین پر ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں اس دستاویز کو دفنایا جا سکے، جو آپ نے تیار کی ہے" انہوں نے اپنے خط میں ایک دستاویزی واقعہ کا انکشاف بھی کیا جب 1972ء میں انوار الحق نے چیف آف ایئر سٹاف سے کہا تھا کہ بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے، جو بھٹو کے خلاف اس کی پرانی اور گہری دشمنی کی عکاسی کرتا ہے۔ تین ججوں نے بھٹو کو بری کیا تھا۔ ان کے فیصلہ سے اعتماد حاصل کرتے ہوئے بھٹو نے یہ پیش گوئی کی کہ "چیف جسٹس اپنی قابل رحم زندگی کے آخری سانس تک، شدید کرب واضطراب اور آسیبی سایہ کے دباؤ میں رہے گا۔" بھٹو نے آخر میں استدعا کی تھی کہ ان کا یہ خط عدالت میں پڑھا جائے لیکن اس کی نوبت بھی نہ آئی۔

نظر ثانی کی ابتدائی درخواست میں میعاد کی کمی کی وجہ سے نبٹ بری ہی تھی اسلئے اضافی وجوہات و نکات 80 صفحے کی دوسری دستاویز میں پیش کئے گئے یوں اکثریتی فیصلہ کے ججوں کی 60 سے زائد ایسی بنیادوں کا خاکہ اس میں موجود تھا جو ریکارڈ پر موجود غلطیوں کی نشاندہی کرتی تھیں۔ بہت سی وجوہات جو اس میں پیش کی گئیں وہ دراصل ایک ایسی آخری کوشش کی حیثیت رکھتی تھیں، جن سے ججوں کو یہ بتانا مقصود تھا کہ انہوں نے ہائیکورٹ کے فیصلہ کے ناقابل قبول اور غلط حصوں کو بھی جوں کا توں قبول کر لیا ہے۔ سزا کی بابت ایسے دلائل بھی دیئے گئے جو دراصل نظر ثانی کی درخواست سے متعلق نہیں تھے اور اس کی حدود میں نہیں آتے تھے۔ یہ موقع کھونے کے بعد بھٹو کو بری کر دیا جائے گا۔ بختیار اب یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ سابق وزیراعظم ایسے مجرم ہیں جنہیں قانون کی نگاہوں میں دوبار قاتل قرار دیا جا چکا ہے اسلئے اب

یہ ان کے موکل کے مفاد میں تھا کہ ان کی سزا میں اس بنیاد پر تخفیف کرائی جائے کہ بھٹو محض ایک مجرم ہیں' قاتل نہیں۔

سماعت شروع ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ سب پر بد مزاجی کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ ہر ایک اس بات سے بیزار تھا کہ وہی پرانے دلائل نئے انداز میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

" آپ ہمیں بتائیں کہ آپ کس نکتہ پر بات کرنا چاہتے ہیں" انوار الحق نے بختیار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بختیار کو اس سے زیادہ حوصلہ صفدر شاہ کے الفاظ سے ملا جو اقلیتی فیصلہ کے ایک رکن تھے۔ انہوں نے بختیار سے کہا وہ بتائیں کہ وہ ایسے کون سے حالات ہیں جو سزا میں کمی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ ایسی حقیقت کہ مثلاً غلط آدمی قتل ہو گیا تھا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ پانچ آدمی ایک ایسے غیر ارادی قتل میں پھانسی پر لٹکائے جانے والے ہیں بظاہر خود صفدر شاہ بھی ختم نہ ہونے والی گزارشات و معروضات سے بیزار دکھائی دے رہے تھے اور اس میں کوئی شک نہ تھا کہ یہ ایک ہارنے والی لڑائی تھی جس میں وکیل صفائی پہلے ہی شکست کھا چکے تھے۔

اپنی درخواست پر دلائل دیتے ہوئے یحیٰی بختیار نے عرض کیا کہ یہ پہلا موقع ہے جب سپریم کورٹ متفقہ طور پر سزائے موت اور ملزم کے جرم پر رائے ظاہر نہیں کر سکی۔ چیف جسٹس نے بڑی بے صبری اور غصے کا مظاہرہ کرتے ہوئے چیخ کر بختیار سے کہا " آپ قانون کا وہ واحد نکتہ پیش کریں جس پر اس سے پہلے دلائل نہ دیئے جا چکے ہوں۔ براہ کرام اپنے دلائل کو اختصار سے اور توجہ کے ساتھ پیش کیجئے اور صحیح پوزیشن اختیار کیجئے " آخر میں انہوں نے مشورہ دیا۔

بعض اوقات بختیار خود ججوں سے اعانت کیلئے پوچھتے کہ کن پہلوؤں پر تفصیل سے بات کریں " کچھ نکات شاید پوری رڈ شپس کو متاثر کر سکتے ہیں۔ ورنہ آپ جنگل میں کھو جائیں گے " بختیار نے کہا۔

صفائی کے نقطۂ نظر سے معاملہ یہ تھا کہ اسے سزا پر عملدر آمد سے پہلے آخری تنکوں کا سہارا ملا تھا کہ وہ دلائل دے سکیں استغاثہ کیلئے یہ موقعہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا وہ صرف یہ سمجھتے تھے کہ انہیں مرتب دلائل کو سننا ہے اور بس۔ مقدمہ تو وہ ایک ووٹ کی اکثریت سے جیت ہی چکے ہیں اس کے باوجود انہوں نے وقت کو ہاتھ سے گزرنے کا موقع نہیں دیا۔ اقلیتی ججوں نے تبصرہ کرنا چاہا تو استغاثہ کی طرف سے اعتراض کیا گیا کہ اُن کے فیصلے پر نظر ثانی کی جا رہی ہے اسلئے انہیں چاہئے کہ وہ خاموش رہیں۔ تھوڑی بہت قانونی کشتی کے بعد اس لاحاصل بحث کو ترک کر دیا گیا۔ بختیار نے اس سلسلے میں یہ دلیل دی کہ اکثریتی فیصلہ کو عدالت کے فیصلہ کی حیثیت دی گئی ہے اور ساتوں ججوں نے اس پر دستخط کئے ہیں۔ اس امر پر چیف جسٹس نے بھی اصرار کیا کہ اسی لیے کسی جج پر یہ پابندی عائد نہیں کی جا سکتی کہ وہ نظر ثانی کی درخواست پر اپنی رائے نہ دے۔

بختیار اکثر دباؤ تلے آ جاتے' ہر نکتہ ہمیشہ ان کی دسترس میں نہ ہوتا۔ رحمان نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی دستاویز کو حوالہ بنائیں۔ اس پر چیف جسٹس نے ریمارک پاس کیا کہ وہ استغاثہ کے وکیل آن ریکارڈ کے مشورہ پر عمل کر رہے ہیں " ما[illegible] بختیار نے جواباً [illegible] میں کسی بھی شیطان کے اچھے مشورہ کو قبول کر

لیتا ہوں۔ اچھا مشورہ 'اچھا مشورہ ہوتا ہے"۔

"ہاں بشرطیکہ تم شیطان کو جان سکو۔

رحمان جو نہیں چاہتے تھے کہ اس مکالمہ کو ان کے حوالہ سے چلایا جائے لقمہ دیا۔

"ہاں یہ ایک طویل عرصے تک شیطانوں کی صحبت میں رہے ہیں"

بختیار اس کاٹ دار فقرہ پر چپ نہیں رہ سکتے تھے۔ رحمان کی طرف مڑے اور اپنی سادگی پر ہنستے ہوئے جواب دیا

"ہاں میں ایک طویل عرصہ سے آپ کو جانتا ہوں"

فیصلہ سنائے جانے کے بعد ایسی خوش مزاجی اور ظرافت کا اظہار بہت ہی کم ہوا۔

بختیار کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا گیا اور انہیں ناچار ماننا پڑا کہ صفائی نے اپنے موکل کو بائیکاٹ کا مشورہ دے کر کتنی سنگین غلطی کی تھی۔ اپنی صفائی میں ثبوت پیش نہ کر کے ملزم خود موت کی دہلیز پر پہنچ گیا۔

یہ وہ معاملہ تھا جس پر اکثریتی فیصلہ والے جج کچھ سننا چاہتے تھے۔ "آپ کو 20 رمئی سے اس نکتہ پر دلائل کا آغاز کرنا چاہیئے تھا" جسٹس نسیم حسن شاہ نے قدرے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے رائے دی۔

بختیار اس موضوع پر بات کرتے رہے جو ان کیلئے یقیناً تکلیف دہ تھا کہ سزا کی مقدار کے حوالہ سے عدالت کو احساس دلائیں کہ کسی ایک یا دوسری وجہ کی بناء پر وہ صفائی پیش نہیں کر سکے۔

"شکریہ" چیف جسٹس نے کہا "آپ نے درد سہا ہے ہم اس پر غور کریں گے"

بختیار کو اپنی آخری گزارشات پیش کرنے کا موقعہ دیا گیا وہ سب تھک چکے تھے۔ وہ وقت چاہتے تھے۔ بختیار نے وعدہ کیا کہ اگر زیادہ وقت دیا گیا تو وہ اپنی معروضات کو جامع بنا کر پیش کریں گے لیکن چیف جسٹس نے ہفتہ وار تعطیل کے بعد انہیں صرف ایک دن دیا۔

غلام علی میمن کی وفات

بختیار 'غلام علی میمن پر اتنا زیادہ انحصار کرتے تھے کہ وہ اکثر حقائق اور قانونی مقدمات کی پڑتال کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ انہیں میمن کے علم پر مکمل اعتماد تھا۔ میمن عدالت میں بیٹھے ہوئے اکثر بختیار کو لقمے دیتے' نکات بتاتے اور ان کی طرف قانون کی کتابیں بڑھاتے۔ ایک وکیل کی حیثیت سے ان کی برتری کو جنگ لڑنے والے دونوں فریق تسلیم کرتے تھے۔ تعطیل کے بعد بختیار کو اپنے دلائل پیش کرنے تھے۔ میمن اکثریتی فیصلہ پر ایک کاری ضرب لگانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وکیلوں میں وہ اکیلے تھے جنہوں نے پورے فیصلہ کو پڑھا تھا اور وہ اس میں موجود تضادات کو دیکھ اور ان کی نشاندہی کر سکتے تھے جو اکثریتی فیصلہ میں بول رہے تھے۔ سہ شام ڈکٹیشن دیتے وقت ان پر دل کا دورہ پڑا اور ملکِ عدم کو سدھار گئے بیٹوں نے اگلے دن اخبار میں یہ المناک خبر پڑھی تو انہیں سخت دھچکا لگا۔

اگلے دن بختیار' میمن کے بغیر پہلی بار کھڑے ہوئے تو ٹوٹے پھوٹے اور لرزیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ "میں اپنے آپ کو ایک ایسا جہاز محسوس کر رہا ہوں جس کا انجن ناکارہ ہو چکا ہے" انہوں نے آغاز کیا۔

www.bhutto.org

میں ان پر بہت ہی زیادہ انحصار کرتا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا کہ وہ مر چکے ہیں۔ اس آخری دن بختیار نے جو کچھ کہا اس میں زیادہ تر وہی باتیں تھیں جو میمن کی آخری فاتحہ میں کہی گئی تھیں۔ اس میں ان اہم تضادات کو اجاگر کیا گیا تھا جو اکثریتی فیصلہ میں موجود تھے۔ اس میں بطور خاص ایمونیشن کا ذکر کیا گیا تھا ایک طرف تو اکثریتی ججوں نے استغاثہ کی اس تھیوری کو قبول کر لیا تھا چلے ہوئے کارتوسوں میں رد و بدل کیا گیا تھا دوسری طرف انہوں نے استغاثہ کی اس متضاد کہانی کو بھی سچ مان لیا کہ یہ وہی کارتوس تھے جو اسلام آباد اور لاہور میں استعمال کئے گئے تھے تاکہ دونوں واقعات کو مربوط کیا جا سکے لیکن وہ کہتے تھے کہ کارتوس اسلام آباد میں تبدیل نہیں کئے گئے۔ یہ کام لاہور میں آئی جی کے گھر کیا گیا۔

بختیار نے چھ ایسی خامیوں کی نشاندہی بھی کی جو ریکارڈ پر موجود تھیں۔ چلے ہوئے کارتوسوں کا چار مقامات پر پایا جانا اور دو قاتلوں کا مسئلہ بھی طے نہیں کیا گیا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اکثریتی فیصلے میں اس طرح ربط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

"اسلئے اسے فطری امر قرار دیا جا سکتا ہے کہ دو حملہ آوروں نے جو چوک کے اندر تھے اپنے انداز میں ہدف کا تعاقب کیا ہو اور دو سے زیادہ مقامات سے فائرنگ کی ہو" لیکن یہ وہ بات تھی جس کا ملزموں نے اپنے بیانوں میں کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ قیاسوں اور اندازوں سے واقعہ کو مربوط کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ چلے ہوئے کارتوسوں کو قریب ہی سے اکٹھا کیا گیا تھا جس سے یہ امکان پیدا ہو سکتا ہے کہ دو آدمیوں نے ہی گولیاں چلائی ہوں لیکن یہ اندازہ بھی شہادت کے خلاف اور اس سے متضاد تھا کیونکہ جائے واردات کے نقشہ میں یہ دکھایا گیا تھا کہ چلے ہوئے کارتوس چار جگہوں سے جمع کئے گئے تھے۔

صفائی نے یہ بھی واضح کیا کہ مسعود محمود کی شہادت کو تائید میسر نہیں آئی۔ غلام حسین کی گواہی میں موجود خامیوں اور تضاد بیانیوں کی بھی نشاندہی کی گئی۔ پھر اکثریتی فیصلہ کا یہ دعویٰ کہ کیس میں بھاری اور ضخیم "ثبوت" موجود ہے لیکن انہوں نے ایک بھی ایسا ثبوت پیش نہیں کیا تھا جس سے ثابت ہو سکتا کہ تفتیش کو غلط سمت کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔ اس پر مستزاد سعید احمد خان کی داغدار گواہی ایک طرف وہ شعوری طور پر تحقیقات میں مداخلت کر رہا تھا۔ دوسری طرف اسے آزاد گواہ تسلیم کیا جا رہا تھا۔ ویلچ کے بیان کی تائید کرنے میں ناکامی ایسے بہت سے واقعات کی بناء پر اکثریتی فیصلہ میں شک کا فائدہ بہت بڑا فائدہ استغاثہ کو دیا گیا وہ اپنی اس دلیل پر قائم رہے کہ بھٹو ہر شبہ سے بالاتر مجرم ثابت نہیں ہوتے۔

اپنے دلائل ختم کرتے ہوئے انہوں نے ایک اور تنقیح پر بات کی اور اس کے تحت وہ وجوہات بیان کیں جن کی بناء پر سزا کی مقدار میں تخفیف ہو سکتی تھی۔ وہ آدمی جو ہلاک ہوا اسے قتل کرنے کا کوئی محرک نہیں تھا اپیل کنندہ موقع پر موجود نہیں تھا۔ سزا کی بنیاد مسعود محمود کی گواہی کو بنایا گیا ہے۔ جو سرکاری وعدہ معاف گواہ تھا۔ جسے سابق وزیراعظم کو موت کے گھاٹ اتروانے سے فائدہ پہنچنے کا یقین تھا۔ سپریم کورٹ کے تین جج بھٹو کو ہر الزام سے بری کر چکے ہیں۔ اکثریتی ججوں نے ہائیکورٹ کے فیصلہ میں شامل ان پیروں کو حذف کرا دیا ہے جن میں بھٹو کی مذمت کی گئی اور انہیں "نام کا مسلمان" کہا گیا تھا۔ شین گنوں اور گولیوں میں عدم مطابقت کے باعث ایف ایس ایف کا کردار بھی مشکوک ہو جاتا ہے۔ آخر میں بختیار

www.bhutto.org

نے کہا کہ قانون دو سزائیں..... موت یا عمر قید..... ایک ساتھ نہیں دیتا اگر ایسی سزائیں دی جائیں تو دلائل پیش کرنے پڑتے ہیں پھر ان اسلامی قوانین کے تحت جو حال ہی میں نافذ کئے گئے ہیں۔ شریکِ جرم کی گواہی قابلِ قبول ہی نہیں۔ ان قوانین کی رُو سے اگر کوئی گواہ جو یہ کہے کہ فلاں آدمی اُس کا دشمن ہے پھر اس کے خلاف گواہی دے اور جسے گواہی دینے سے کوئی فائدہ پہنچتا ہو' وہ سچا اور قابلِ اعتبار گواہ نہیں ہے۔ "ان معروضات کے ساتھ میں اپنا کیس ختم کرتا ہوں" یہ کہہ کر وہ بیٹھ گئے۔ بختیار کے دلائل 17 مارچ کو ختم ہوئے۔

فاضل ججوں نے اس بات پر غور کرنے میں چند دن لگائے کہ کیا نظر ثانی کی درخواست سماعت کے لئے منظور کرلی جائے یا نہیں۔ اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ سزا میں تخفیف یعنی عمر قید کی سزا ان کی صوابدید میں آتی ہے یا نہیں؟

درخواست کا فیصلہ

سپریم کورٹ نے 24 مارچ کو نظر ثانی کی درخواست پر اپنا فیصلہ صادر کیا جو چیف جسٹس انوار الحق نے پڑھ کر سنایا۔ جس میں نظر ثانی کی درخواست کو مسترد کر دیا گیا تھا۔

نظر ثانی کی درخواست پر فیصلہ جسٹس محمد اکرم نے لکھا جو 153 صفحات پر مشتمل تھا ان کے فیصلہ سے کچھ اہم اقتباسات کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"مسٹر یحییٰ بختیار نے نظر ثانی کی درخواست کے حق میں جو تفصیلی گزارشات پیش کیں ان کے بغور جائزہ کے بعد مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس میں سوائے اس کوشش کے کچھ بھی نہیں ہے کہ ان ہی باتوں کو پھر دہرایا جائے جو اس سے قبل اپیل کی سماعت کے دوران پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی جا چکی ہیں اور زیرِ بحث آچکی ہیں۔ جن خامیوں اور غلطیوں کی نشاندہی انہوں نے کی ہے' میں نے انہیں کسی اہمیت کا حامل نہیں پایا۔ وہ ان بنیادی امور اور لازمی جیجہ پر اثر انداز نہیں ہوتیں جن کے باعث اکثریتی فیصلہ میں ان کے اثباتِ جرم اور سزا کی توثیق کی گئی۔

اس بنا پر نظر ثانی کی درخواست ناکام رہی اور اسے مسترد کیا جاتا ہے'

مید کی ایک کرن باقی رکھتے ہوئے فیصلہ کے آخر میں سفارش کی گئی تھی۔

گو مسٹر یحییٰ بختیار کے دیئے ہوئے دلائل کو ہم نے قانون کی نظر میں اس قابل نہیں پایا کہ سزائے موت پر نظر ثانی کر سکیں۔ البتہ انتظامیہ کے حکام کو رحم و عفو کے جو اختیارات حاصل ہیں ان وجوہات کو زیرِ غور لاتے ہوئے وہ ان اختیارات کو بروئے کار لا سکتے ہیں"۔

درخواست کی سماعت کرنے والے بنچ میں وہ ساتوں جج شامل تھے جنہوں نے اپیل سنی تھی۔ اس درخواست کے نامنظور ہونے کے بعد سپریم کورٹ نے بھی سزائے موت دیئے جانے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر دیا اور قانونی جدوجہد ختم ہو گئی۔ فیصلے میں ایک دلچسپ تبدیلی یہ دیکھنے میں آئی اس میں اعلان کیا گیا

www.bhutto.org

تھا کہ نظر ثانی کی درخواست "متفقہ" طور پر مسترد کر دی گئی جس سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ ان تین ججوں نے بھی جنہوں نے اکثریتی فیصلہ سے اختلاف کیا تھا' اپنی رائے تبدیل کر لی ہے حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ 153 صفحات پر مشتمل فیصلے میں ایک علیحدہ نوٹ بھی شامل تھا جو جسٹس دراب پٹیل نے بایں طور پر لکھا تھا۔

"اگرچہ وکیل صفائی نے تقریباً دو ہفتے تک دلائل دیئے تاہم وہ اکثریتی ججوں کو درخواست گزار کے خلاف اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ کرنے میں ناکام رہے۔ ان حالات میں عدلیہ کے وقار اور عدالت کی روایات کے پیش نظر میرے لئے یہ مناسب نہیں کہ میں وکیل صفائی کی معروضات کے بارے میں اظہار رائے کروں چنانچہ میں درخواست کو نامنظور کرتا ہوں"۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

تیرھواں باب

سپریم کورٹ کے فیصلہ پر تنقیدی نظر

6 فروری 79ء کو چیف جسٹس انوار الحق نے جس فیصلہ کا اعلان کیا' وہ کئی لحاظ سے محلِ نظر ہے۔

1..... منقسم فیصلہ

سپریم کورٹ آف پاکستان کی تاریخ میں یہ اہم فیصلہ تھا جو متفقہ رائے سے صادر نہیں کیا گیا بلکہ منقسم نوعیت کا تھا۔ یعنی 4:3 کی نسبت سے سنایا گیا تھا۔ چار ججوں نے ہائیکورٹ کے فیصلہ کو بحال رکھنے اور تین نے اسے مسترد کرنے کے حق میں رائے دی تھی۔ چار فاضل ججوں نے استغاثہ کے کیس کے بارے میں ایسے نظریات پیش کئے جو تین فاضل ججوں کے فیصلہ کی مخالفت کرتے تھے۔ اس سے کسی کے ضمیر کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی جب جج قانون کے کسی مسئلہ پر ایک دوسرے سے متفق نہ ہوں' لیکن جب وہ ایک ایسے نکتہ پر اتفاق نہ کر رہے ہوں جس میں ایک انسانی جان کی زندگی اور موت کا مسئلہ شامل ہو اور جس کے ساتھ دوسرے انسانوں کا بھی بہت گہرا تعلق ہو تو وہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس مسئلہ میں کوئی خرابی ہے جس میں چار جج ایک فیصلہ پر پہنچیں اور تین جج دوسرا نتیجہ اخذ کریں۔ منقسم فیصلہ کی قانونی حیثیت سے قطع نظر یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ روایت یہ رہی ہے کہ ایسے فیصلہ پر عمل نہیں کیا جاتا اور انتہائی سزا کی صورت میں تو اسے بالکل روبہ عمل نہیں لایا جاتا۔

2..... طویل اور بوجھل فیصلہ

بھٹو کیس میں سپریم کورٹ نے جو فیصلہ صادر کیا' اُس کا شمار عدلیہ کے طویل ترین فیصلوں میں

www.bhutto.org

ہوتا ہے۔ پندرہ سو کے لگ بھگ صفحات پر پھیلا ہوا یہ فیصلہ غیر معمولی طور پر طویل اور بوجھل لگتا ہے۔ اس فیصلہ میں عدلیہ کے بیشمار فیصلوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ دوسرے مقدمات کے حقائق نے ان فیصلوں کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ بڑے احترام کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جسٹس حلیم کے فیصلہ کے علاوہ دیگر فیصلے بہت زیادہ عالمانہ اور اصل موضوع سے ہٹے ہوئے ہیں۔ وہ قانون کے طے شدہ مستحکم سادہ اصولوں کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ ججوں کی علمیت واضح طور پر قابل تعریف ہے اور اس میں اُنہوں نے جو محنت کی ہے وہ بھی لائق ستائش ہے لیکن لاشعوری طور پر یہ فیصلے اتنے بوجھل ہو گئے ہیں کہ عام فہمی کا کوئی مقصد پورا نہیں کرتے۔ یہ سوال پوچھنا بیجا نہ ہو گا کہ بار کے کتنے ارکان نے ان فیصلوں کو پڑھا ہے؟ ان فیصلوں میں سینکڑوں مقدمات کے جو حوالے دیئے گئے ہیں اور ان کے حقائق کو جس طرح زیر بحث لایا گیا ہے اسے دیکھ کر قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا اس قدر زیادہ مستعار دانش کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے؟ کیا ایک جج کیلئے ضروری ہے کہ وہ سرکار کے خلاف تمام اہم مقدمات اور نظائر پیش کرے؟ کسی کیس کا حوالہ غیر متعلقہ چیز نہیں ہوتی۔ تاہم اس میں غیر ضروری فراوانی فیصلہ کو ضخیم اور بوجھل بنا دیتی ہے جس سے احتراز برتنا لازم ہے۔

3.....چیف جسٹس پر عدم اعتماد کا اظہار

لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کی طرح سپریم کورٹ کے چیف جسٹس شیخ انوار الحق بھی بھٹو کی ذات اور ان کی حکومت سے ناخوش تھے۔ ترقی کے معاملہ میں ایک بار ان کے ساتھ بھی زیادتی ہو چکی تھی جب انارنی جنرل کے مشورہ پر اُن کے پروموشن کے معاملہ کو معرض التواء میں ڈال دیا گیا تھا۔ شیخ انوار الحق کے ساتھ بھٹو کی مخاصمت اور تعلقات میں کشیدگی بڑی پرانی تھی۔ اس کی بنیاد 1972ء میں اُس وقت پڑی جب اول الذکر نے بھٹو پر تنقید کرتے ہوئے فضائیہ کے چیف آف سٹاف کو اُس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی ترغیب دی تھی۔

5 ر جولائی 77ء کو بھٹو کی حکومت زوال پذیر ہو گئی اور اُن کی مخالف فوجی حکومت نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تو شیخ انوار الحق نے سکھ کا سانس لیا۔ 23 ر ستمبر 77ء کو انہیں سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا گیا تو صاف نظر آنے لگا کہ ان کی ہمدردیاں کدھر ہیں۔ پھر جب 20 ر نومبر 1977ء کو انہوں نے نصرت بھٹو کیس میں مارشل لاء کے نفاذ کو "نظریۂ ضرورت" کے تحت جائز قرار دے دیا تو اس مخاصمت میں مزید شدت پیدا ہو گئی چنانچہ ہائیکورٹ کے فیصلہ کے بعد سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی اور شیخ انوار الحق اپیل کی سماعت کرنے والے بنچ میں شامل ہو گئے تو بھٹو نے 7 ر مئی 77ء ایک درخواست دائر کی جس میں چیف جسٹس سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ بنچ کی صدارت نہ کریں اور دوسرے ججوں کا تقرر بھی نہ کریں۔ چیف جسٹس پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے بھٹو نے اپنی درخواست میں کہا تھا

1..... یہ کہ انہوں نے اعلانیہ بھٹو کی حکومت اور اُن کی پارٹی پر تنقید کی ہے اور جنرل ضیاء الحق کو

www.bhutto.org

"قومی نجات دہندہ" قرار دیا ہے۔

2..... یہ کہ وہ لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے ہیں جنہوں نے اپیل گزار کو موت کی سزا سنائی ہے۔

3..... یہ کہ وہ صدر مملکت چودھری فضل الٰہی کی عدم موجودگی میں قائمقام صدر کے فرائض انجام دے چکے ہیں اس طرح انہوں نے عارضی طور پر فوجی انتظامیہ اور عدلیہ کو یکجا کر دیا تھا۔

4..... یہ کہ چیف جسٹس ملزم سے ذاتی تعصب کی بناء پر اپیل کا غیر جانبداری سے فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔

5..... یہ کہ میری حکومت نے اٹارنی جنرل کی تائید سے انہیں بحیثیت چیف جسٹس ترقی دینے میں جان بوجھ کر تاخیر کی تھی اس لئے وہ میرے خلاف شدید ناخوشگوار جذبات رکھتے ہیں۔

6..... یہ کہ انہوں نے نصرت بھٹو کیس میں مارشل لاء کے جواز کو چیلنج کرنے والی درخواست مسترد کر دی تھی۔

7..... یہ کہ انہوں نے سپریم کورٹ میں اپنے ماتحت ججوں سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے وفاداری کا حلف اٹھوایا تھا۔ جس سے آئین کے تحفظ سے متعلق پیراحذف کر دیا گیا تھا۔

چیف جسٹس نے اپنے حکم نامہ مورخہ 10 ر مئی 78ء کے ذریعے بھٹو کی درخواست کو قطعاً مسترد کر دیا اس طرح عجیب طریقے سے بیک وقت ججوں اور ملزم کا کردار ادا کیا۔

جہاں تک بھٹو کو سپریم کورٹ میں انصاف حاضر ہونے اور جج سے خطاب کرنے کی اجازت دینے کا تعلق ہے اس سلسلہ میں بھٹو نے بے شک عدالت پر اپنے بھرپور اعتماد کا ذکر کیا تاہم چیف جسٹس کے متعلق ذاتی طور پر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بھٹو نے بعد ازاں اس سارے عمل کو چیف جسٹس کی "فنکاری" (Master - stroke) سے تعبیر کیا۔ جیسا کہ انہوں نے 3 ر مارچ 79ء کو چیف جسٹس کے نام اپنے طویل خط میں لکھا تھا اور کہا تھا کہ "مجھے سپریم کورٹ میں شخصی طور پر حاضر ہونے اور بولنے کی اجازت دے کر مقدمہ کی سماعت اور اپیل میں روا رکھی گئی جملہ زیادتیوں اور حک و اضافہ کی تلافی کر دی گئی ہے"۔ بھٹو کو اپیل میں تین ججوں نے بری کیا تھا۔ اس سے اعتماد حاصل کرتے ہوئے انہوں نے پیش گوئی کی کہ "چیف جسٹس اپنی قابلِ رحم زندگی کے آخری سانس تک شدید کرب و اضطراب اور آسیبی سایہ کے دباؤ میں رہے گا"۔

چیف جسٹس کے خلاف ایسی ہی ایک درخواست بھٹو کے وکیل عبدالحفیظ پیرزادہ نے بھی دی تھی۔ جس میں لکھا گیا کہ ان کی تقرری غیر قانونی تھی اور ستمبر 77ء میں اُس وقت ختم ہو گئی تھی جب سابقہ چیف جسٹس (یعقوب علی خان) نے مارشل لاء کی اطاعت کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا جبکہ انوار الحق نے وہ حلف نہ صرف خود اٹھا لیا بلکہ اپنے ماتحتوں سے بھی اٹھوایا۔ اس نئے حلف نامہ سے وہ پیراحذف کر دیا گیا تھا جس کا تعلق آئین کی حفاظت اور اس کے ساتھ وفاداری سے تھا۔ گویا شروع سے آخر تک اپیل گزار اور چیف جسٹس کے مابین عدم اعتماد کی کیفیت قائم رہی۔

www.bhutto.org

جسٹس صفدر شاہ کی شہادت

جسٹس صفدر شاہ نے بھٹو کو بری کرنے کا فیصلہ دیا تھا۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد اُن کا جینا دوبھر کر دیا گیا۔ وہ پاکستان سے فرار ہوئے اور کابل پہنچتے ہوئے اکتوبر 80ء میں لندن پہنچے۔ وہاں ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے ضیاء الحق اور انوار الحق کے مابین انتہائی قریبی اشتراک و تعلقات کی نشاندہی کی اور بتایا کہ لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس دونوں کا بھٹو کے مقدمہ اور بعد ازاں اپیل کے دنوں میں فوجی حکمرانوں کے ساتھ مستقل رابطہ رہا۔ مسٹر انوار الحق کو یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ ان کے چیمبرز میں ہاٹ لائن ٹیلیفون لگوا دیا گیا تھا تاکہ وہ براہِ راست ضیاء الحق سے گفتگو کر سکیں۔ انہوں نے انوار الحق کے متعدد بار قائم مقام صدر بننے کی بھی مذمت کی جس سے انتظامیہ اور عدلیہ کے اختیارات ایک ہی آدمی کے پاس چلے گئے۔

(دیکھئے بھٹو مقدمہ اور سزا وکٹوریہ شیفلڈ ص 373 اشاعت مئی 1990)

4.....بنچ سے دو ججوں کی علیحدگی

سپریم کورٹ میں بھٹو اور دیگر ملزمان کی اپیلوں کی سماعت کیلئے 27 مارچ 78ء کو پہلا فل بنچ تشکیل دیا گیا جو چیف جسٹس انوار الحق، جسٹس دراب پٹیل، قیصر خان، محمد حلیم اور صفدر شاہ پر مشتمل تھا۔ 20 مئی کو بھٹو کی درخواست پر جو انہوں 7 مئی کو دائر کی تھی نو ججوں پر مشتمل نیا بنچ قائم کیا گیا۔ جس میں مذکورہ بالا پانچ جج صاحبان کے علاوہ :۔

جسٹس وحید الدین، جسٹس محمد اکرم، جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ اور جسٹس کرم الٰہی چوہان شامل تھے۔ اس فل بنچ نے 20 مئی سے اپیل کی باقاعدہ سماعت شروع کر دی بعد میں 30 جولائی کو جسٹس قیصر خان مدت ملازمت پوری ہونے پر ریٹائرڈ ہو گئے جب انہیں ریفرنس پیش کیا جا چکا تو وکیل صفائی مسٹر بختیار نے استدعا کی کہ اپیل کے فیصلہ تک اُن کی تقرری بطور ایڈ ہاک جج کر دی جائے مگر اُن کی یہ التماس ان ریمارکس کے ساتھ مسترد کر دی گئی کہ اگر اس بارے میں پہلے استدعا کی جاتی تو عدالت غور کر سکتی تھی۔

جسٹس قیصر خان کا جو صوبہ سرحد سے تعلق رکھتے تھے، شروع سے صفائی کی طرف جھکاؤ تھا۔ اسلئے بھٹو کے حامیوں نے بنچ سے اُن کی علیحدگی کو بری طرح محسوس کیا اور اسے چیف جسٹس کی بدنیتی پر محمول کیا کیونکہ جس طرح ـــــ چند ماہ بعد (19 نومبر 78ء) جسٹس وحید الدین اور ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی میعاد پوری ہونے پر انہوں نے حکومت سے سفارش کی کہ ـــــ اپیل کے فیصلہ تک ان کی مدت ملازمت میں توسیع کر دی جائے اور اُن کی وہ سفارش منظور کرتے ہوئے حکومت نے مطلوبہ توسیع کر دی تھی۔ اسی طرح کی سفارش قیصر خان کے بارے میں بھی کی جا سکتی تھی مگر ان کے معاملہ میں چیف جسٹس نے کوئی قدم نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ وہ گھر چلے گئے۔

www.bhutto.org

صفائی کو دوسرا صدمہ اس صورت میں برداشت کرنا پڑا کہ 21 ر نومبر کو اچانک جسٹس وحید الدین بیمار ہو گئے لاہور ' کراچی اور راولپنڈی کے ڈاکٹروں پر مشتمل بورڈ نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد اُن کی بیماری کو تشویش ناک قرار دیتے ہوئے رپورٹ دی کہ وہ چھ ہفتے تک سماعت کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ تو عدالت نے تین ہفتے کے التواء کے بعد اُن کی واپسی کا مزید انتظار کرنا نامناسب سمجھا اور 23 ر دسمبر سے نو کی بجائے سات ججوں پر مشتمل بنچ اپیل کی سماعت کرنے لگا۔ بنچ سے جسٹس وحید الدین کی علیحدگی بھی بھٹو کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوئی۔ ووٹوں کا پانسہ پلٹ گیا اور چار کے مقابلہ میں صفائی کی طرف جھکاؤ رکھنے والے تین جج رہ گئے۔ باخبر حلقوں کی رائے ہے کہ اگر اپیل کی سماعت میں غیر معمولی تاخیر روا نہ رکھی جاتی اور اس کا فیصلہ جسٹس وحید الدین کی علیحدگی سے قبل ہو جاتا تو وہ یقیناً بھٹو کے حق میں ہوتا۔

5..... بھٹو کی جائز شکایات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی

سپریم کورٹ کا ماحول وکلائے صفائی کیلئے ہائیکورٹ کی فضا سے خاصا خوشگوار تھا۔ یہاں وہ تناؤ' کھنچاؤ اور بنچ اور بار کے مابین عدم اعتماد کا فقدان نہیں تھا جو ہائیکورٹ میں وہاں کے چیف جسٹس کے رویہ کے باعث ابتداء سے انتہا تک دیکھنے میں آیا۔ بایں ہمہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ بھٹو نے جیل میں مناسب سہولتیں فراہم نہ کرنے کے بارے میں جب بھی کوئی شکایت کی اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ یہاں تک کہ 3 ر مارچ 79ء کو بھٹو نے چیف جسٹس کو جو طویل مراسلہ لکھا' اس میں وہ پھٹ پڑے اور منجملہ دیگر امور کے شکایت کی کہ "میں نے جیل میں اپنے علاج کی بابت جو شکایات کی تھیں چیف جسٹس نے اُن پر کوئی توجہ نہیں دی اور مجھے مناسب طبی سہولتیں فراہم نہیں کی گئیں"۔ اس مراسلہ میں بعض دوسری شکایتیں بھی تھیں جن کا تعلق بھٹو کو جوابِ دعویٰ کے حق سے محروم رکھنے اور ان کے خلاف وائٹ پیپرز کی صورت میں پروپیگنڈہ کا طوفان اٹھانے سے تھا لیکن ان میں سے کسی بات کو لائقِ التفات نہیں سمجھا گیا۔

6..... ہائیکورٹ کے فیصلہ میں موجود خامیوں سے صرفِ نظر

ہائیکورٹ کے فیصلہ میں بہت سی خامیاں موجود تھیں مثلاً کئی معاملوں میں شک پیدا ہو جانے کی صورت میں اس کا فائدہ ملزم کو دینے کی بجائے استغاثہ کو دیا گیا۔ چار اہم گواہوں مسعود محمود' غلام حسین' سعید احمد خان اور ایم آر ویلیج کی شہادتوں نیز دستاویزی گواہیوں میں بہت سے اضافے' فرد گذاشتیں تضاد بیانیاں اور اصلاحات شامل تھیں۔ بھٹو کے سینئر وکیل مسٹر یحییٰ بختیار نے بڑی محنت اور قابلیت سے ان خامیوں کی نشاندہی کی' شہادتوں میں موجود تضادات کو واضح کیا اور ہائیکورٹ میں کارروائی کے بائیکاٹ کے باعث ملزم کو اس کی غیر حاضری میں جاری رکھی گئی سماعت سے جو نقصان پہنچا' عدالت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی مگر بنچ نے نہ تو ان کی شکایات پر توجہ دی نہ ہی واضح کردہ خامیوں کو دُور کرنے کی ضرورت سمجھی۔ چیف جسٹس نے اپنے فیصلہ میں ان خامیوں کو کسی ایک یا دوسری وجہ کی بناء پر

www.bhutto.org

نظرانداز کیے جانے کے قابل قرار دیا یوں بھٹو عدالتِ عظمیٰ میں بھی بھٹو کو وہ انصاف میسر نہیں آیا جو قانوناً ان کا حق تھا اور ہائیکورٹ کی طرح سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

7..... مقدمہ سراسر سیاسی تھا۔ قانونی نہیں

جیسا کہ حالات نے ثابت کیا بھٹو کے خلاف قتل کا مقدمہ سراسر سیاسی بنیادوں پر چلایا گیا۔ وکیل صفائی نے اس نکتہ پر بڑا زور بیان صرف کیا کہ یہ ایک گھڑا گھڑایا جعلی مقدمہ ہے جس کا مقصد اُن کے موکل کو جسمانی و سیاسی لحاظ سے ختم کرنا ہے۔ اس مقدمہ کے پیچھے ایک گہری بین الاقوامی سازش کار فرما ہے لیکن سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت کرنے والے بنچ نے ابتداء ہی سے یہ موقف اپنا لیا کہ مقدمہ سے سیاسی عوامل کا کوئی تعلق نہیں چنانچہ چیف جسٹس نے اپنے فیصلہ میں واضح طور پر لکھا کہ اس کیس میں سیاسی ملاحظات کا کوئی دخل نہیں حالانکہ یہ بات قابلِ فہم تھی کہ مقدمہ ایک ایسے شخص پر چل رہا تھا جو پیدائشی سیاستدان تھا۔ جس کا اوڑھنا بچھونا سیاست تھی۔ پھر یہ حقیقت بھی قابل غور تھی کہ اپیل گزار کی حکومت کا تختہ سیاسی بنیادوں پر الٹا گیا تھا اور اسی مخالف بلکہ دشمن کے ایماء پر مقدمہ درج کیا گیا اور استغاثہ نے ہائیکورٹ میں جو 41 گواہ پیش کئے قصوری کے علاوہ وہ سب کے سب سرکاری ملازم تھے اور صفائی کی طرف سے بار بار الزام لگایا گیا کہ انہیں ترغیب تحریص کے ذریعے بھٹو کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ کیا گیا ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا یہ مقدمہ سیاست سے پاک تھا؟ سیاست 1973ء کے آئین کو بہا کر لے گئی سیاست تسلیم کرتی تھی کہ مارشل لاء لگنے کے بعد بھی ملک کی سب سے بڑی پارٹی پی پی ہے لیکن سیاسی ضرورت کہتی تھی کہ اس پر پابندی لگادی جائے۔ سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس کی تقرری سیاسی حالات کا نتیجہ تھی۔ سیاست کے تحت ہی ججوں سے ایک نیا حلف اٹھوایا گیا جس میں آئین کے ساتھ وفا داری سے متعلق پیراگراف شامل نہیں تھا۔ جسٹس مشتاق حسین کی بطور چیف الیکشن کمشنر تقرری بھی سیاست کی آئینہ دار تھی تاکہ وہ پی پی کو انتخابات سے باہر رکھنے کی کوئی تدبیر بروئے کار لا سکیں۔ اندریں حالات یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ مقدمہ سراسر سیاسی تھا' قانونی نہیں تھا۔

8..... بعض تبصرے

ہائیکورٹ میں مقدمہ اور سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت کے دوران صحافیوں کے علاوہ بعض غیر ملکی ماہرینِ قانون بھی کارروائی دیکھنے پاکستان آئے تھے۔ انہوں نے بھٹو کیس کے فیصلہ پر جو تبصرے کئے وہ قانونی لحاظ سے بڑے اہم ہیں ان میں سے بعض تبصرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

(ا)..... موسیو اینٹسینی جاڈل

اپیلیٹ کورٹ آف پیرس کے ایڈووکیٹ موسیو اینٹسینی جوڈل جن کا تعلق تھا انسانی حقوق کی بین الاقوامی فیڈریشن سے تھا اپیل کی سماعت کے شروع میں چند ہفتوں کیلئے راولپنڈی آئے۔ بعد میں انہوں نے اس مقدمہ کے بارے میں ایک طویل رپورٹ قلمبند کی جس کا نچوڑ یہ تھا۔

www.bhutto.org

"مجھ پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وہ فیصلہ جو پہلے ججوں نے کیا' اُس میں انسانی حقوق کے اُن اصولوں کی شدید خلاف ورزی کی گئی جن میں ملزم کو یہ حق دیا گیا ہے کہ اس پر مقدمہ منصفانہ طریقے سے چلایا جائے" ۔ اپنی رپورٹ میں اُنہوں نے لکھا کہ انہوں نے بہت سے غیر ملکی صحافیوں کے انٹرویو کئے جنہوں نے بتایا کہ مقدمہ کی کارروائی کے دوران مسٹر بھٹو اور اُن کے وکلاء کی بابت انتہائی مخاصمانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ "یہ وہ حقیقت ہے جو ایک مقدمہ کی معروضی اور غیر جانبدارانہ سماعت کے سراسر منافی ہے۔ ایک دوسرے فرانسیسی وکیل موسیو رابرٹ باؤنیٹر نے' جو اگست میں چند دن کے لئے کارروائی سننے آئے تھے لکھا "تاریخ ان ججوں کا فیصلہ کرے گی" ۔

(ii) ..... لارڈ ٹریور روپر

بھٹو کے آکسفورڈ کے زمانہ کے استاد اور ممتاز برطانوی قانون دان پروفیسر (بعد میں لارڈ) ٹریور روپر بھی پاکستان آئے۔ انہوں نے سماعت دیکھنے اور بعض شہرت یافتہ انگریز وکلائے فوجداری سے کیس کے بارے میں مشورہ کے بعد "نیویارک ٹائمز" میں ایک مضمون لکھا جس میں مقدمہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔

"جب متعلقہ حقائق کو پرکھا جاتا ہے تو بھٹو کا مقدمہ سرے سے مقدمہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک قتل تھا۔ بھٹو کے خلاف جو عدالتی کارروائی ہوئی اُس کا مختصر سا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں یہ کہنے کی اجازت مل جاتی ہے کہ مسٹر بھٹو پر منصفانہ انداز میں مقدمہ نہیں چلایا گیا" ۔

(iii) ..... ریمزے کلارک

صدر جانسن کے اٹارنی جنرل ریمزے کلارک اس وقت آئے جب یحییٰ بختیار کے دلائل جاری تھے۔ وہ اُن معدودے چند امریکیوں میں سے ایک تھے جنہوں نے تسلیم کیا کہ بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے میں سی آئی اے کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے وطن واپس پہنچ کر بھٹو کی حمایت میں ایک مضمون لکھا جو مشہور جریدہ "دی نیشن" میں شائع ہوا۔ جس کا لب لباب یہ تھا "بھٹو کے خلاف جو شہادت پیش کی گئی اگر اس پر یقین بھی کر لیا جائے تب بھی یہ بھٹو کو مجرم قرار دینے کے فیصلہ کی تائید نہیں کرتی۔" پاکستانی پریس نے اِس مضمون کے بہت سے پہلوؤں کی تردید کی۔

(iv) ..... جسٹس فخرالدین ابراہیم

فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے سابق جج مسٹر فخرالدین ابراہیم نے کہا کہ سپریم کورٹ کا اکثریتی فیصلہ' جس کی بنیاد پر مسٹر بھٹو کو پھانسی دی گئی' پاکستانی عدلیہ کی تاریخ کا ہمیشہ افسوس ناک باب رہے گا۔ اُنہوں نے کہا میں صاحبِ علم و بصیرت ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا تاہم میں اس اکثریتی فیصلہ کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ جس کے تحت سزائے موت بحال رکھی گئی۔

www.bhutto.org

چار ججوں کی اکثریت بھٹو کو سزائے موت کیسے سنا سکتی تھی جبکہ اُن کے تین ساتھی جج بھٹو کو بیگناہ قرار دے چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ امکان کتنا ہی بعید از قیاس ہو انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔ اکثریت کو یہ سوچتے ہوئے بھی کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں' درست ہے' سزا سنانے کے مقصد کیلئے اپنے تین بھائیوں کی رائے پر توجہ دینی چاہئے تھی"۔

(جنگ 25 رجون 1984ء)

(۷) دیوبند کے مفتی اعظم کا فتویٰ

ایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی اور برصغیر پاک و ہند کے عظیم دینی' مذہبی و روحانی مرکز دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم اور محکمہ قضا کے سربراہ مفتی احمد علی سعید نے فتویٰ دیا ہے کہ جناب بھٹو کو دی گئی سزائے موت اسلامی احکام کے خلاف ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ احمد رضا قصوری اور اُن کے والد ایک کار میں جا رہے تھے۔ اس پر خودکار ہتھیاروں سے فائرنگ کی گئی۔ قاتل مسٹر قصوری کو مارنا چاہتے تھے۔ وہ تو بچ گئے لیکن اُن کے والد مارے گئے۔ یہ کسی نے دعویٰ نہیں کیا کہ بھٹو نے گولی چلائی وہ تو سرے سے موقع پر موجود ہی نہیں تھے بلکہ یہ کہا گیا کہ قاتل بھٹو کے آلۂ کار تھے۔ اسلامی قانون کے مطابق یہ قتل خطا ہے اسلئے کہ قصوری کے والد کو ہلاک کرنا مقصود نہیں تھا۔ ایسے قتل میں قاتل پر نہ تو قصاص واجب ہوتا ہے نہ ہی قید و بند کی صعوبتیں صرف کفارہ لازم آتا ہے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ بھٹو نے قتل کا حکم دیا تھا۔ اس کا شرعی ثبوت بھی فراہم کر دیا جائے پھر بھی اسلامی و شرعی قوانین کی رو سے قصاص واجب نہیں ہوتا اور اسے پھانسی نہیں دی جا سکتی"۔

(روزنامہ مساوات لاہور 3 اپریل 79ء)

(۸) ..... جسٹس دراب پٹیل

جسٹس دراب پٹیل نے "بھٹو کا ورثہ" کے زیر عنوان کراچی میں منعقدہ دو روزہ سیمینار کے آخری دن 3 اپریل 89ء کے سیشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آئین کی حفاظت کا حق صرف عدلیہ کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے صحیح محافظ عوام ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "پورے جنوبی ایشیا کی تاریخ میں مجھے اب تک کوئی ایسا مقدمہ نہیں ملا جس میں جرم میں معاونت کرنے والے کو سزائے موت دی گئی ہو۔ ہمارے ہاں عدلیہ کی ایک مسلمہ روایت رہی ہے کہ جب ہائیکورٹ کے ایک جج نے کسی ملزم کو مجرم قرار دیا تو حکومت وقت نے اپنے معافی کے اختیارات سے کام لیا' جبکہ شہید بھٹو کے مقدمہ میں تین ججوں کی طرف سے بری قرار دیئے جانے کے باوجود انہیں پھانسی دے دی گئی۔"

(جنگ 4 اپریل 89ء)

www.bhutto.org

(vii) راجہ رتنم

سری لنکا کے سابق چیف جسٹس اور رکن پارلیمنٹ ٹی ڈبلیو راجہ رتنم نے بھٹو کے مقدمہ کا تجزیہ "A Judiciary In Crisis" (عدلیہ کا بحران) نامی کتاب میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ جس کا اُردو ترجمہ لاہور کے معروف اشاعتی ادارہ "کلاسیک" نے شائع کیا ہے۔ جج موصوف فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"اس سے قطع نظر کہ ایک منقسم فیصلہ کی قانونی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ یہ حقیقت قابلِ غور ہے کہ چار فاضل ججوں نے استغاثہ کے کیس کے بارے میں ایسے نظریات پیش کئے جو تین دوسرے فاضل ججوں کے فیصلہ کی مخالفت کرتے تھے۔ اس سے کسی کے ضمیر کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی جب جج قانون کے کسی مسئلہ پر ایک دوسرے سے متفق نہ ہوں لیکن جب وہ ایک ایسے نکتہ پر اتفاق نہ کر رہے ہوں، جس میں ایک انسان کی زندگی اور موت کا مسئلہ در پیش ہو اور جس کے ساتھ دوسرے بہت سے انسانوں کا بھی بہت گہرا تعلق ہو، تو وہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس مسئلہ میں کوئی خرابی ہے جس میں چار جج ایک فیصلہ پر پہنچیں اور تین اُس کے برعکس نتیجہ اخذ کریں۔ سری لنکا جیسے چھوٹے اور پسماندہ ملک میں بھی یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ منقسم فیصلہ پر عملدرآمد نہیں کیا جاتا"۔

(عدلیہ کا بحران ص 212 اُردو ترجمہ ستار طاہر اشاعت نومبر 89ء)

(viii) ..... صبغت اللہ قادری

پاکستان نژاد برطانوی ماہر قانون صبغت اللہ قادری نے کہا ہے کہ کوئی باضمیر اور ایماندار قانون دان بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے فیصلہ کی تائید نہیں کر سکتا۔ لندن سے پاکستان جاتے ہوئے دوبئی میں قیام کے دوران نمائندہ جنگ سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بھٹو کیس میں جو شہادتیں پیش کی گئیں وہ وعدہ معاف گواہ تھے۔ پاکستان کو قانون برطانیہ سے ورثہ میں ملا ہے اور برطانیہ سمیت دولتِ مشترکہ کے تمام ممالک میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ صرف وعدہ معاف گواہوں کی شہادت پر عمل کرنا خطرناک ہے۔ جب تک کہ دباؤ کے بغیر اصلی اور ٹھوس گواہی اس کی تائید و تصدیق نہ کرے اور اس کیس میں ایسی کوئی گواہی نہیں تھی۔ لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے بھٹو کی بابت جو کومنٹس، دیئے، تعصب اور عناد پر مبنی تھے۔ لاہور ہائیکورٹ کا فیصلہ ذاتی اور سیاسی تھا۔ قانونی ہرگز نہیں تھا۔

انہوں نے مزید کہا کہ اس کیس کے دوران اُن ججوں کو ریٹائر کر دیا گیا جو صفائی کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ بھٹو کے مقدمہ کی جب بھی از سر نو تحقیقات ہوگی، کمیشن انہیں قانونی بنیادوں پر بے گناہ قرار دے گا۔"

(روزنامہ جنگ لاہور 31 دسمبر 1989ء)

www.bhutto.org

www.bhutto.org

چودھواں باب

جاں بخشی کی درخواستیں اور رحم کی اپیلیں

24 ر مارچ کو نظر ثانی کی درخواست مسترد ہوتے ہی رحم کی اپیل دائر کرنے کے لئے سات دن کی کربناک مدت شروع ہو گئی۔ بھٹو کو نظر ثانی کی درخواست نامنظور ہونے کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے کہا "بہت اچھا" انہوں نے فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مزید کہا "میں ہمیشہ سے توقع رکھتا تھا کہ میں کسی انقلابی انداز کی موت مروں گا' انصاف کیلئے لڑتے ہوئے" وہ اب بھی اپنے اس یقین پر قائم تھے کہ وہ عوام کے کاز کیلئے لڑتے ہوئے مر رہے ہیں۔

29 ر مارچ کو عبدالحفیظ پیرزادہ نے جیل میں مسٹر بھٹو سے ملاقات کی جو ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ پیرزادہ نے بھٹو کو رحم کی اپیل دائر کرنے کے حق میں قائل کرنا چاہا مگر انہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ رحم کی اپیل نہیں کریں گے۔

درخواستوں کا تانتا بندھ گیا

نظر ثانی کی درخواست کے استرداد کے ساتھ ہی دنیا بھر کے کونے کونے سے بھٹو کی جان بخشی کیلئے اپیلوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایسی درخواستوں کا سلسلہ دراصل ہائیکورٹ کا فیصلہ صادر ہوتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ امریکہ کے صدر کارٹر نے کہا کہ وہ اسے سخت ناپسندیدہ عمل قرار دیں گے اگر سزا پر عمل کیا گیا۔ چین نے دو اپیلیں بھیجیں۔ برزنیف نے سوویت روس کی ترجمانی کرتے ہوئے رحم کی اپیل کی۔ برطانوی وزیر اعظم جیمز کیلاہن نے کہا "مجھے یقین ہے کہ جان بخشی کے نتائج بہت اچھے ہوں گے اور جنرل ضیاء جو ایک دانا انسان ہیں وہ قانون کے سخت اطلاق پر عمل کرنے کی بجائے پاکستان کے مفادات کا پورا خیال

www.bhutto.org

رکھیں گے کیونکہ گھاس ہمیشہ میدانِ جنگ میں اُگتی ہے پھانسی گھاٹ پر کبھی گھاس نہیں اُگتی۔" اس کے علاوہ پوپ جان پال، فرانس کے صدر جسکاں دیستاں، شاہ سپین، صدر ٹیٹو، صدر سوہارتو، مغربی جرمنی، ڈنمارک، ناروے، رومانیہ، یونان، آسٹریلیا، اور سویڈن کے وزرائے اعظم شامل تھے۔ بھارتی وزیر خارجہ باجپائی نے کہا "سیاسی حریف کو پھانسی دینا ناپسندیدہ فعل ہے۔"

اسلامی ممالک میں سے ضیاء پر سعودی عرب کا سب سے زیادہ اثر تھا۔ خادم حرمین شریفین شاہ خالد نے بھی دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس کے چیئرمین بھٹو کی جان بخشی کیلئے کہا لیکن باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ وہ محض رسمی کارروائی تھی۔ اگر شاہ خالد واقعتاً ضیاء پر دباؤ ڈالتے تو ضیاء کیلئے ان کی بات کو ٹالنا ناممکن ہو جاتا۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر کرٹ والڈہائم نے تار کے ذریعے مسٹر بھٹو کے حق میں رحم کی اپیل کی، ایسا ہی ایک مراسلہ واشنگٹن سے سینیٹر جارج میک گورن کی جانب سے موصول ہوا، دوست ممالک میں لیبیا کے صدر کرنل قذافی، متحدہ عرب امارات کے شیخ زید بن سلطان النہیان ترکی کے وزیر اعظم بلند ایجوت اور انڈونیشیا کے نائب صدر ڈاکٹر آدم ملک نے بھی اپنے مراسلوں میں ایسی ہی اپیلیں کیں۔ ترکی کے وزیر اعظم جنہوں نے بھٹو کو جلاوطنی میں پناہ دینے کی پیشکش کی تھی، وہ بذاتِ خود رحم کی درخواست پیش کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ شرق اوسط سے کئی ملکوں کے وفود بھی آئے تاکہ سابق وزیر اعظم کی جان بخشی کے لئے اپیل کر سکیں۔ صدر قذافی کا ذاتی نمائندہ عبدالمعطی العبیدی اُن کا پیغام لیکر پاکستان پہنچا، اس نے راولپنڈی میں جنرل ضیاء الحق سے ایک گھنٹے تک ملاقات کی اور بھٹو کی سزائے موت کے موضوع پر بات چیت کی۔ صدر ضیاء الحق نے قذافی کا پیغام وصول کر کے اپنے موقف کی وضاحت کی کہ پاکستان میں عدلیہ آزاد ہے۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور ہر شخص کے ساتھ انصاف ہوگا۔

ایران کی دھمکی

مئی 78ء کے وسط میں بی بی سی نے اپنے ایک نشریہ میں بتایا کہ ایران نے دھمکی دی ہے کہ اگر پاکستان میں مسٹر بھٹو کی سزائے موت پر عملدر آمد کیا گیا تو ایران پاکستان کی مالی امداد بند کر دے گا۔ بی بی سی کے مطابق یہ دھمکی ایران کے وزیر اعظم مسٹر جمشید آموز گار نے تہران میں مغربی ممالک کے نامہ نگاروں سے باتیں کرتے ہوئے دی۔ یاد رہے کہ ایران پاکستان کو تیس کروڑ ڈالر سالانہ کی امداد دیتا ہے جو اس کیلئے بہت اہم ہے۔

بعد میں ایران کی طرف سے وضاحت کی گئی کہ اُس نے ایسی کوئی دھمکی نہیں دی۔ شہنشاہ ایران نے ایک بیان میں کہا کہ وہ کسی کو مجبور نہیں کر سکتے۔ صرف اپیل کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ قطر، بحرین اور کویت کے امیر، بھارت کے صدر، ویت نام کے وزیر اعظم، چین

الاقوامی جیورسٹ کمیشن کے صدر اور مسز بندرانائیکے کی جانب سے ضیاء الحق سے اپیل کی گئی کہ وہ مسٹر بھٹو کی جان بخش دیں۔ مجموعی طور پر 54 سربراہانِ مملکت اور بہت سی تنظیموں کی طرف سے سزا میں تخفیف اور جان بخشی کی اپیل کی گئی۔

صدر فضل الٰہی کا خط

بھٹو کی جان بخشی کے سلسلے میں سابق صدر فضل الٰہی بھی حرکت میں آئے وہ 11 فروری 79ء کو راولپنڈی پہنچے اور جنرل ضیاء سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن دوسری طرف سے جواب ملا کہ صدر مملکت بہت مصروف ہیں اسلئے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ مجبوراً انہوں نے ضیاء کے نام ایک پُرجوش خط لکھا۔ جس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ :۔

"بھٹو کو موت کی سزا دی گئی تو پاکستان کی آزادی استحکام اور خود مختاری کو نقصان پہنچے گا۔ برصغیر کے علاقے میں اس اقدام سے عدم استحکام میں اضافہ ہو گا۔ آج تباہی کے آثار واضح طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ مسٹر بھٹو کو پھانسی دی گئی تو ردِ عمل میں بہت بڑا دھماکہ ہو سکتا ہے۔ آج جو ردِ عمل دبا ہوا ہے وہ کھل کر سامنے آجائے گا اور اس کے نتیجے میں فسادات شروع ہو جائیں گے۔ اس سے پیدا ہونے والا بحران ملک کے دشمنوں کی خواہشات کی تکمیل کر دے گا۔ سابق صدر نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ وہ جج جنہوں نے بھٹو کو سزا دینے کے فیصلہ کو بحال رکھا وہ سب سے بڑے صوبہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن ججوں نے بری کرنے کا فیصلہ دیا اُن کا تعلق چھوٹے صوبوں سے ہے اور یہ انتہائی "بدقسمتی کا اتفاق" ہے سپریم کورٹ کے فیصلہ میں جو عجائبات ہیں وہ اتنے حیران کن اور نمایاں ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"۔

پیرزادہ کی ضیاء الحق سے ملاقات

4 مارچ کو بھٹو کے وکیل عبدالحفیظ پیرزادہ نے صدر ضیاء سے ملاقات کی جو دو گھنٹے تک جاری رہی۔ یہ ملاقات مسٹر پیرزادہ کی درخواست پر ہوئی تھی۔ باخبر ذرائع کے مطابق پیپلز پارٹی کے رہنما نے صدر مملکت سے بھٹو کی جان بخشی کی اپیل کی۔ اس کے جواب میں انہوں نے واضح کیا کہ کسی کو بھی عدالتی فیصلہ میں تبدیلی کا اختیار نہیں۔

رحم کی اپیلوں پر ضیاء کا ردعمل

پاکستانی حکام نے باہر سے کی جانے والی جاں بخشی کی اپیلوں پر ناگواری کا اظہار کیا۔ جنرل ضیاء نے انہیں بڑے سرسری انداز میں "ٹریڈ یونین سرگرمی" قرار دے کر مسترد کر دیا۔ انہوں نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ "تمام سیاستدان اپنے ساتھی سیاستدان کی جان بچانے کیلئے اپیلیں کر رہے ہیں بہت کم غیر

www.bhutto.org

سیاستدانوں نے جان بخشی کیلئے کہا ہے۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں کسی کی جان دوسروں پر سبقت نہیں رکھتی ۔ بالاتری صرف قانون کو حاصل ہے "۔ ضیاء کے رویہ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جاں بخشی کی درخواستوں کو کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ دو سال سے کم عرصہ میں انہیں چار سو کے قریب رحم کی درخواستیں موصول ہوئیں جو سب کی سب نامنظور کر دی گئیں۔ ماسوائے شبنم ڈکیتی کیس کے مجرموں کی درخواست کے جسے نامعلوم وجوہ کی بناء پر شرفِ قبولیت بخشا گیا جنرل ضیاء کے ذہن میں اپنے ساتھی جرنیل کی یہ بات اچھی طرح بیٹھ گئی تھی کہ "بھٹو کو پھانسی دینا خطرناک ہو گا لیکن اسے زندہ رکھنا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہو گا"۔

سوتیلی بہن کی طرف سے رحم کی اپیل

31 مارچ کو جو کہ رحم کی اپیل دائر کرنے کا آخری دن تھا' بھٹو کی سوتیلی بہن شہر بانو امتیاز (مسز منور الاسلام) حیدر آباد سے راولپنڈی پہنچیں ۔ وہ 68 برس کی عمر میں بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں اور بھٹو 51 برس کی عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔ یہ دونوں سر شاہنواز بھٹو کی اولاد تھے۔ وہ رات کے پونے گیارہ بجے ایوانِ صدر پہنچیں اور اپنے ہاتھ سے رحم کی درخواست ضیاء الحق کو پیش کی۔ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے انہوں نے درخواست کسی سے لکھوائی تھی جو انگریزی میں تھی۔ انہوں نے اپنی درخواست میں لکھا تھا۔

"اس کی بزرگی اور برتری اپنا اظہار کرتی ہے اور ایسی بزرگی اور برتری کبھی نہیں ہوتی جس سے رشک اور حسد نہ کیا جائے۔ جنرل صاحب کیا یہ درست ہے کیا یہ اخلاقی لحاظ سے مناسب و جائز ہے۔ آپ کیلئے' فوج کیلئے کہ ایسے آدمی کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے۔

آپ نے وعدہ کیا ہے آپ نے خود کو اسلامی اصولوں کیلئے وقف کر رکھا ہے۔ رحم اور شفقت اسلامی نظام کی روح ہیں میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اسلام کی عظمت و برتری کے اظہار کیلئے اس کی سزا بدل دیں گے جو میرا اکلوتا زندہ بھائی ہے" لیکن صاف عیاں تھا کہ اس مرحلے پر کسی طرح بھی سابق وزیر اعظم کی جان نہیں بچائی جا سکتی تھی۔ اب اس ڈرامے کا اختتام ہونے والا تھا جو 18 مارچ کو پہلی بار سزائے موت کے اعلان سے شروع ہوا تھا۔

www.bhutto.org

پندرھواں باب

سزا پر عملدرآمد

گورنر پنجاب لیفٹننٹ جنرل سوار خان نے یکم اپریل کو بھٹو اور دیگر چاروں مجرموں کی رحم کی اپیلیں مسترد کر دیں اور حسب ضابطہ صدر مملکت کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دیا۔ صدر پاکستان نے بھی کیس میں مداخلت نہ کرتے ہوئے سزا کی توثیق کر دی۔ 30ر مارچ کو پانچوں مجرموں کو موت کا پروانہ ("Black Warrant") سنٹرل جیل راولپنڈی کو موصول ہو چکا تھا چونکہ نظر ثانی کی اپیل کو خارج ہوئے سات دن پورے نہیں ہوئے تھے اسلئے موت کا پروانہ حکومت پنجاب نے واپس منگوالیا۔ پہلے حکومت نے مسٹر بھٹو سمیت پانچوں مجرموں کو 2ر اپریل کی صبح 5 بجے پھانسی دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ کسی وجہ سے اس فیصلہ پر نظر ثانی کی گئی اور طے پایا کہ پہلے اکیلے مسٹر بھٹو کو پھانسی دی جائے۔ باقی چار مجرموں کو ابھی یہ سزا نہ دی جائے۔ اس فیصلہ کے مطابق پانچوں مجرموں کی مشترکہ پھانسی کا دوسرا پروانہ بھی واپس کرنا پڑا۔ تاکہ اکیلے بھٹو کے لئے موت کا پروانہ جاری کیا جائے۔ چنانچہ اکیلے مسٹر بھٹو کی موت کا پروانہ 2ر اپریل کو ایک بجے بعد دوپہر موصول ہوا اور انہیں ۳ اپریل کی رات دو بجے پھانسی دینے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو جو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند تھیں ملاقات کیلئے بلانے کا حکم دے دیا گیا۔ بینظیر بھٹو نے کہلا بھیجا کہ ان کی طبیعت ناساز ہے اسلئے وہ بعد دوپہر ملاقات کو نہیں آسکتیں اسی دوران ہوم سیکرٹری پنجاب ڈی ایم ایل اے کے دفتر سے ہوتے ہوئے جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں آئے اور انہیں بتایا کہ قانون کے مطابق چونکہ صدر پاکستان کے دستخطوں کو 48 گھنٹے نہیں گزرے اسلئے 3ر اپریل کی رات 2 بجے پھانسی نہیں دی جاسکے گی۔ حکومت پنجاب کے اٹھائے ہوئے اس نکتہ کے باعث

www.bhutto.org

مسٹر بھٹو کی پھانسی ایک دن کیلئے ملتوی کر دی گئی۔ اُدھر بیگم نصرت بھٹو اور بینظیر بھٹو کو مطلع کر دیا گیا کہ اگر اُن کی طبیعت ناساز ہے تو بے شک نہ آئیں۔

بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کی آخری ملاقات

نئے فیصلہ کے مطابق 2 اپریل کی شام کو حکام نے طے کر لیا کہ مسٹر بھٹو کو 3 اور 4 اپریل کی درمیانی شب دو بجے پھانسی دے دی جائے گی۔ جیل کے قوانین کے مطابق پھانسی کا وقت صبح سویرے ہوتا ہے لیکن بھٹو کے معاملہ میں نامعلوم وجوہ کی بناء پر پھانسی کے لئے رات کے دو بجے کا وقت مقرر کیا گیا۔ حسب پروگرام بھٹو خواتین کو 3 اپریل کو صبح سویرے ملاقات کے لئے آنے کی اطلاع کر دی گئی۔ ان کو لانے والی گاڑی سوا گیارہ بجے جیل پہنچ گئی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ چودھری یار محمد نے انہیں آگاہ کیا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ ملاقات ساڑھے گیارہ بجے شروع ہوئی اور دو بجے تک جاری رہی۔ اسی دوران بھٹو نے یار محمد سے پوچھا' کیا یہ آخری ملاقات ہے؟ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ملاقات کے دوران نصرت بھٹو چُپ چُپ رہیں جبکہ بے نظیر سارا وقت روتی رہیں۔ باپ بیٹی کے مابین آہنی سلاخیں حائل تھیں اس لئے بے نظیر آخری بار اپنے پاپا کے ماتھے کو بوسہ نہیں دے سکیں۔ انہوں نے جیل حکام کو مطلع کیا کہ سزا پر عمل در آمد کی صورت میں بھٹو اپنے آبائی قبرستان واقع نوڈیرو (لاڑکانہ) میں دفن ہونا چاہیں گے۔ نصرت بھٹو نے یہ درخواست بھی کی کہ انہیں میّت کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ ان کی آخری رسومات میں شرکت کر سکیں لیکن اس کی اجازت نہیں ملی۔

نصرت بھٹو کی ضیاء سے ملاقات کی خواہش

کرنل رفیع الدین کی روایت کے مطابق آخری ملاقات کے بعد نصرت بھٹو نے ان سے کہا کہ وہ صدر ضیاء الحق سے رحم کی ذاتی اپیل کرنا چاہتی ہیں۔ ممکن ہو تو ملاقات کا اہتمام کیا جائے۔ رفیع نے ان کی خواہش ایس ایم ایل اے بریگیڈیئر (بعدہٗ میجر جنرل) خواجہ راحت لطیف تک پہنچائی۔ انہوں نے یہی بات ڈی ایم ایل اے میجر جنرل صغیر حسین سید سے کہی۔ ان کے ذریعے نصرت بھٹو کی خواہش سے صدر ضیاء کو مطلع کیا گیا۔ مگر وہ ملاقات کے لئے وقت دینے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

دوسرے رشتہ داروں کی ملاقات نہیں کرائی گئی

آخری دنوں میں بھٹو کے کچھ رشتہ دار مثلاً ان کی پہلی بیوی شیریں امیر بیگم' ان کی بہن بیگم منور الاسلام اور ان کے شوہر' نبی بخش بھٹو' پیر بخش بھٹو' ممتاز علی بھٹو اور مسٹر پرویز علی بھٹو راولپنڈی پہنچ گئے تھے اور 3 اپریل کو وہاں موجود تھے لیکن نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے بعد کسی کو ان سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی۔ حکومت پھانسی کی خبر کو پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی اور اگر ان رشتہ داروں کی ملاقات کرائی جاتی تو وہ جیل سے باہر نکل کر یہ خبر منتشر کر دیتے۔

بھٹو کو پھانسی کی باضابطہ اطلاع

3 ر اپریل کو شام 6 بج کر 5 منٹ پر سپرنٹنڈنٹ سکیورٹی بٹالین کمانڈر (کرنل رفیع الدین) مجسٹریٹ درجہ اوّل مسٹر بشیر احمد خان اور جیل کے ڈاکٹر صغیر حسین شاہ پر مشتمل پارٹی بھٹو کے سیل میں گئی اور انہیں پھانسی کے بارے میں باضابطہ طور پر مطلع کیا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے حسب ذیل حکم پڑھ کر سنایا۔

"آپ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو لاہور ہائیکورٹ نے 18 ر مارچ 1978ء کو نواب محمد احمد خان کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ آپ کی اپیل سپریم کورٹ پاکستان نے 16 ر فروری 1979ء کو نامنظور کر دی اور نظر ثانی کی درخواست بھی 24 ر مارچ 79ء کو مسترد کر دی گئی۔ صدر پاکستان نے اس کیس میں مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لئے پھانسی دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔"

جیل میں آخری بھوک ہڑتال

24 ر مارچ 79ء کو نظر ثانی کی درخواست کے مسترد ہوتے ہی جیل حکام نے اس طرح آنکھیں پھیر لیں اور جلدی جلدی ساری رعایتیں واپس لے لیں گویا بھٹو کو جلد ہی پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ نوار کی چارپائی اُن کے سیل سے نکال لی گئی تو بھٹو نے اپنا گدا فرش پر بچھا لیا۔ جب وہ غسلخانہ میں گئے تو لکڑی کا ڈبہ جو کموڈ کا کام دیتا تھا وہ بھی اٹھا لیا گیا۔ غرض اُنہیں ہر طرح سے تنگ کیا جانے لگا' ان حالات میں ایک بے بس انسان کی طرح اُنہوں نے 24 ر مارچ سے بھوک ہڑتال کر دی جو یکم اپریل کی شام تک جاری رہی۔ اس 9 روزہ بھوک ہڑتال نے اُنہیں بہت ہی کمزور اور نحیف و نزار کر دیا۔

آخری گفتگو

پھانسی کی خبر سے مطلع کئے جانے کے بعد مجسٹریٹ درجہ اول مسٹر بشیر احمد خان نے اپنا تعارف کرایا اور بھٹو سے کہا اگر وہ چاہیں تو اپنی وصیت لکھ سکتے ہیں۔ جس کیلئے کاغذ' قلم وغیرہ مہیا کر دیا جائے گا۔ جیل حکام کے چلے جانے کے بعد بھٹو نے اپنے مشقتی عبدالرحمٰن کو بلایا اور شیو کیلئے گرم پانی لانے کو کہا۔ شیو کے دوران انہوں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خواجہ غلام رسول کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے کہا:

"ڈپٹی صاحب آپ کو ایسا لیڈر کہاں سے ملے گا۔ مگر آپ کو ضرورت ہی کیا ہے۔ ضرورت تو غریبوں کو تھی میں موچی دروازہ میں موچیوں کے سامنے تقریریں کیا کرتا تھا کیونکہ میں خود موچی ہوں۔ تم لوگ غریبوں کا لیڈر چھین رہے ہو' میں انقلابی آدمی ہوں' غریبوں کا حامی' یار مجھے مارنا ہی تھا تو دو سال خراب کیوں کیا' میری عزت کیوں نہیں کی جو ساری دنیا میں ہے۔ مجھے کسی ریسٹ ہاؤس یا کوٹھی میں رکھتے اور عزت سے مار دیتے۔ آج تم اسلامی کانفرنس کے چیئرمین کو' جسے ساری دنیا کے مسلمانوں نے منتخب

www.bhutto.org

کیا' شیو کرنے کی اجازت بھی نہیں دے رہے میرے ساتھ لگ کر کھڑے ہو تا کہ خود کو بلیڈ سے ضرب نہ لگالوں' دوسرے مجرموں سے جھوٹی بکواس کرا کے مجھے پھانسی کے پھندے پر چڑھا کر انہیں چھوڑنا چاہتے ہو۔ "

اس کے بعد بھٹو نے باہر والے سنتری کو بلایا اور ڈپٹی سے کہا "میرے مرنے کے بعد یہ گھڑی اس سپاہی کو دے دینا" (وہ 27 پنجاب رجمنٹ کا حوالدار مہدی خان تھا)

شام آٹھ بجے مشقتی نے کافی کا ایک کپ بنا کر دیا تو بھٹو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے "رحمٰن مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا' پھانسی تو لگ ہی جانا ہے آج تیرے ساتھ یہ میری آخری رات ہے میں صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہوں۔"

آخری وصیت لکھ کر جلا ڈالی

شیو سے فارغ ہونے کے بعد بھٹو نے کاغذ اور قلم سنبھالا اور اپنی وصیت لکھنے بیٹھ گئے۔ آٹھ بج کر 15 منٹ سے 9 بج کر 40 منٹ تک لکھتے رہے۔ دوبارہ دس بج کر 10 منٹ سے گیارہ بج کر 5 منٹ تک لکھنے میں مصروف رہے۔ اس کے بعد لکھے ہوئے تمام کاغذات جلا ڈالے۔ گیارہ بج کر 25 منٹ پر لیٹ گئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ لیٹے ہوئے انہوں نے دو تین بار صنم صنم پکارا۔

بارہ بجنے میں ایک منٹ باقی تھا کہ جیل سپرنٹنڈنٹ جیل کے ڈاکٹر اور مجسٹریٹ کو لیکر بھٹو کے سیل کے پاس پہنچے کرنل رفیع نے جیل کے ڈاکٹر سے کہا کہ بھٹو صاحب کو چیک کریں۔ انہوں نے سٹیتھو سکوپ لگا کر چیک کیا اور بتایا کہ مسٹر بھٹو بالکل ٹھیک ہیں۔ رات ایک بج کر 10 منٹ پر وہ خود اٹھ بیٹھے۔ مسٹر مجید احمد قریشی (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ) نے انہیں بتایا کہ نہانے کیلئے گرم پانی موجود ہے۔ مگر انہوں نے نہانے سے انکار کر دیا۔

آخری عمل

ہدایات کے مطابق انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات چودھری نظیر اختر 3 اپریل کی صبح سے جیل میں حاضر تھے۔ تارا مسیح جلاد کو 2 اپریل سے طلب کر کے ایک کمرہ میں مقفل کر دیا گیا تھا۔ لمبی بھوک ہڑتال کی وجہ سے بھٹو کی جسمانی حالت دیکھ کر ایک سٹریچر کا بندوبست بھی کر لیا گیا تھا تا کہ اگر وہ پھانسی گھاٹ تک چل کر نہ جا سکیں تو اُن کو سٹریچر کے ذریعے وہاں لیجایا جا سکے۔ چند مشعلوں کا انتظام بھی کر لیا گیا تھا کیونکہ رات خاصی اندھیری تھی اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایک بج کر 35 منٹ پر مندرجہ ذیل افسران سیکورٹی وارڈ میں جمع ہو گئے۔

1..... سپرنٹنڈنٹ جیل چودھری یار محمد دُریانہ
2..... کمانڈر سیکورٹی فورس کرنل رفیع الدین
3..... مجسٹریٹ درجہ اول بشیر احمد خان

www.bhutto.org

4..... ڈاکٹر جیل، صغیر حسین شاہ اور

5..... ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خواجہ غلام رسول

انسپکٹر جنرل سیدھے پھانسی گھاٹ کی طرف چلے گئے۔ سیکورٹی وارڈ، پھانسی گھاٹ اور ان کے درمیانی راستہ پر فوجی گارڈ متعین کر دی گئی تھی۔

مذکورہ بالا پارٹی بھٹو کے سیل کے اندر گئی وہ گدے پر لیٹے ہوئے تھے اور جاگ رہے تھے۔ مجسٹریٹ نے پوچھا کیا وہ کوئی وصیت چھوڑنا چاہتے ہیں؟ بھٹو پہلے تو خاموش رہے اُن کا رنگ بالکل پھیکا اور زرد پڑ چکا تھا۔ جسمانی طور پر انتہائی لاغر اور کمزور لگ رہے تھے، ان کی آواز خفیف، بے حد کمزور اور سنائی نہ دینے والی تھی۔ انہوں نے کوشش کر کے کہا۔

"میں نے وصیت لکھنے کی کوشش کی لیکن میرے خیالات اتنے درہم برہم تھے کہ میں نہیں لکھ سکا، میں نے جو کچھ لکھا تھا اسے پھاڑ کر جلا دیا۔"

وہ بے حد پُر اضطرار اور دلسوز کیفیت تھی۔ اتنے میں مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے ہیڈ وارڈ کو حکم دیا کہ وہ اپنے آدمی اندر لائے جو مسٹر بھٹو کو اٹھالیں۔ چار وارڈر اندر داخل ہوئے دو نے اُن کے بازو اور دو نے پاؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر انہیں سیل سے باہر نکالا۔ وہ کہہ رہے تھے "مجھے چھوڑ دو" دالان میں لا کر انہیں سٹریچر پر ڈال دیا گیا۔ اُن کے دونوں ہاتھوں میں سامنے کی طرف ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اتنے میں مشقتی عبدالرحمٰن چائے کی پیالی لیکر سامنے آیا شاید بھٹو نے آخری بار چائے پینے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن اُن کی یہ آخری اور معمولی سی خواہش بھی پوری نہیں ہونے دی گئی۔

وارڈروں نے چاروں کونوں سے سٹریچر کو اٹھالیا۔ سیل سے پھانسی گھاٹ کا فاصلہ 250 گز کے قریب ہے۔ بھٹو اس عرصہ میں بالکل خاموش اور بے حس و حرکت پڑے رہے۔ پھانسی کی جگہ وارڈروں نے سٹریچر کو زمین پر رکھا اور دو نے اُنہیں پھانسی کے تختہ پر کھڑا ہونے میں مدد دی۔ ان کے ہاتھوں سے ہتھکڑی کھول کر ان کے بازو اور ہاتھ پشت کی طرف لے جائے گئے اور پھر سے ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اسی دوران تارا مسیح نے اُن کے سر اور چہرے پر ماسک چڑھا دیا۔ اس کے بعد گلے میں رسی ڈال کر گرہ لگا دی، ابھی پھانسی کا لیور نہیں کھینچا گیا تھا کہ انہوں نے تقریباً چیخنے کے انداز میں کہا "Finish it" یہ آخری الفاظ تھے جو بھٹو نے کہے۔ ٹھیک دو بج کر چار منٹ پر جلاد نے لیور دبایا اور وہ ایک جھٹکے سے موت کے کنویں میں گر پڑے۔ ان کی لاش کچھ دیر لٹکتی رہی۔ چند منٹ بعد تارا مسیح نے کنویں میں اتر کر اُن کے مردہ جسم کو ہلا کر دیکھا تاکہ تشنج کی وجہ سے جسم ٹیڑھا ہو جائے۔ قانون کے مطابق نعش کو آدھ گھنٹہ تک لٹکنے دیا گیا اور پھر ڈاکٹر کے اس سرٹیفکیٹ کے بعد کہ موت واقع ہو چکی ہے، اتار لیا گیا۔

تجہیز و تکفین

مسٹر بھٹو کی لاش کو دو بج کر 35 منٹ پر پھانسی کے پھندے سے جدا کیا گیا۔ اُن کی قیمتی انگوٹھی اور

www.bhutto.org

گھڑی اتار کر سپرنٹنڈنٹ نے اپنی تحویل میں لے لیں اور بعد میں نصرت بھٹو کے حوالے کر دی گئیں۔ جیل میں ہی مولوی محمد حیات نے نعش کو غسل دیا ایک انٹیلی جنس ایجنسی کے فوٹو گرافر نے بھٹو کے جسم کے درمیانی حصے کے نزدیکی فوٹو لئے۔ حکام اپنا یہ شک دور کرنا چاہتے تھے کہ اُن کے ختنے ہوئے ہیں یا نہیں۔ عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ مسٹر بھٹو کے اسلامی طریقہ سے باقاعدہ ختنے ہوئے تھے۔ لاش کو لکڑی کے ایک تابوت میں پھولوں کے ساتھ بند کر دیا گیا۔ اُن کا تابوت جیل سے تین بج کر پانچ منٹ پر مخصوص گاڑیوں کے ذریعے پی اے ایف ایئر بیس کیلئے روانہ ہوا۔ وہاں ایک وی آئی پی سی - 130 طیارہ پہلے سے تیار کھڑا تھا۔ یہ جہاز جیکب آباد کیلئے محو پرواز تھا کہ وادی سون سکیسر کے اوپر سے گزرتے ہوئے میانوالی کے قریب اس میں فنی خرابی پیدا ہو گئی جہاز کو واپس راولپنڈی لایا گیا۔ میت کو دوسرے سی - 130 طیارہ میں رکھ کر جیکب آباد پہنچایا گیا۔ یہ جہاز صبح 7 بجے وہاں پہنچا۔ وہاں سے بیلی کاپٹر میں میت کو نوڈیرو لایا گیا۔ بھٹو کے قریبی رشتہ داروں کو میت کی آمد کے بارے میں مطلع کر دیا گیا تھا اور آبائی قبرستان میں ان کی قبر فوجی جوانوں نے پہلے ہی تیار کر رکھی تھی۔ لاش کو نواب نبی بخش بھٹو کی حویلی میں آخری دیدار کیلئے رکھ دیا گیا۔ دس بج کر 15 منٹ پر گڑھی خدا بخش کی جامع مسجد کے امام محمود احمد بھٹو نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جس میں معدودے چند رشتہ داروں نے شرکت کی۔ آخری دیدار کرنے والوں میں بھٹو کی پہلی بیوی شیریں امیر بیگم بھی شامل تھیں۔ نماز جنازہ کے بعد دس بج کر 30 منٹ پر اُنہیں فوجی پہرہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا یوں پاکستان کی تاریخ کا ایک باب اختتام کو پہنچ گیا۔

بھٹو کی پھانسی کی خبر سب سے پہلے آل انڈیا ریڈیو نے صبح سات بج کے بلیٹن میں نشر کی جبکہ پاکستان کے ذرائع ابلاغ سے یہ خبر لاش کی تدفین کے بعد دن کے گیارہ بجے نشر کی گئی۔

پھانسی کی سزا سے متعلق خبر نے دنیا کو ششدر اور غم زدہ کر دیا کسی کو بھی یقین نہیں آتا تھا کہ نظر ثانی کی درخواست نامنظور ہونے کے بعد فوجی حکام ایسی بے مثال اور غیر شائستہ عجلت کا مظاہرہ کریں گے رحم کی اپیل مسترد ہونے کے بعد سزا پر عملدرآمد کا وقت کم سے کم بائیس دن ہوتا ہے لیکن بھٹو کو صرف سات دنوں کے بعد ہی پھانسی دیدی گئی۔

گارڈین نے اپنے اداریہ میں بہت سے لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا

"بھٹو کیلئے موت انصاف کے حفاظتی اہتمام کے ساتھ نہیں آئی بلکہ ایک چور کی طرح رات کو آئی' بے شرمی' خوف اور تشویش کے عالم میں یہ کارنامہ انجام دیا گیا بھٹو کی پھانسی پر عالمی ردِعمل ناراضی اور برہمی کا تھا۔

الیونگ نیوز نے رائے ظاہر کی :۔

"بھٹو کو پھانسی دے کر جنرل ضیاء اور ان کے ساتھیوں نے نہ صرف ایک بدترین جرم کا ارتکاب کیا ہے جو بھٹو نے ہرگز نہیں کیا تھا بلکہ اُنہوں نے یقینی طور پر فوجی حکومت کے مقدر کی اس طرح پیش گوئی کی کہ اگر کبھی ایسا دن آیا کہ ضیاء کا تختہ الٹا گیا اور اُنہیں ایسے الزامات کا سامنا کرنا پڑا تو اُن میں بھٹو کا قتل بھی شامل ہو گا۔ جنرل ضیاء کو دو باتوں کے بارے میں یقین کر لینا چاہئے' ایک یہ کہ اُسے مجرم قرار دیا جائے گا' دوسرے یہ کہ اگر وہ اپیل کرے گا تو اپنا وقت ضائع کرے گا۔"

www.bhutto.org

سولھواں باب

پھانسی دینا ناگزیر کیوں ہو گیا

محسن کشی کی بدترین مثال

3 اور 4 اپریل کی درمیانی شب کو جس شخص کو تختہ دار پر کھینچا گیا اس کے متعلق ضیاء الحق سے بہتر کون جانتا تھا کہ :-

☆ ..... وہ شخص ان کا سب سے بڑا محسن و مربی تھا۔ اس نے سات سینئر جرنیلوں پر سبقت دے کر ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف کے اہم منصب پر فائز کیا تھا اور ضیاء الحق نے صادق حسین قریشی کی قیام گاہ پر قرآن پاک پر حلف اٹھا کر اُسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔

☆ ..... ضیاء الحق نے اُس شخص کو اصرار کر کے اپنی آرمرڈ کور کا کرنل انچیف بننے پر آمادہ کیا تھا حالانکہ ملٹری سیکرٹری نے اس تجویز کی اس بناء پر مخالفت کی تھی کہ سیاسی شخصیات کو فوج کے ایسے اعزازی مناصب دینا مناسب نہیں لیکن ضیاء نے اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل ٹکا خان کو اپنا ہمنوا بنا کر اپنی تجویز منظور کرالی۔ پھر اپنی ہی کور کے کرنل انچیف کو پھانسی پر لٹکانے کا عمل ان پر کس قدر شاق گزرا ہو گا۔

☆ ..... بھٹو اسلامی سربراہ کانفرنس کے چیئرمین تھے اس اعزاز کیلئے ان کا نام پاسبان حرم شاہ فیصل شہید نے تجویز کیا تھا اور کروڑوں مسلمانوں کے نمائندوں نے اس کی تائید کی تھی۔ یوں وہ شخص پورے عالم اسلام کا محبوب لیڈر بن گیا تھا۔

☆ ..... اس شخص کی سزا یابی کے متعلق سپریم کورٹ کا فیصلہ منقسم نوعیت کا تھا۔ چار ججوں نے سے قصوروار ٹھہرایا تھا تو اُن کے ہم پلہ تین ججوں نے اُسے بریت کا مستحق قرار دیا تھا۔ پھر نظر ثانی کی درخواست

www.bhutto.org

کے فیصلہ میں تمام ججوں نے متفقہ سفارش کی تھی کہ انتظامیہ کو اپنے رحم اور عفو کے اختیارات بروئے کار لاتے ہوئے سزا میں تخفیف کر دینی چاہئے۔ ویسے بھی منقسم فیصلہ پر عملدر آمد کی کوئی نظیر پہلے موجود نہیں تھی۔

☆..... جب یہ معاملہ ملٹری کمان کونسل میں زیر غور آیا تو کئی سینئر جرنیلوں نے پھانسی کی مخالفت کرتے ہوئے تجویز کیا تھا کہ سزا پر عملدر آمد مؤخر کر دیا جائے۔ انتخابات کے بعد آنے والی حکومت اس سے جس طرح چاہے نمٹے گی۔

☆..... وہ شخص خود قاتل نہیں تھا۔ وہ تو وقوعہ کے وقت جائے واردات پر موجود بھی نہیں تھا۔ عام حالات میں یہ بات عفو اور درگزر کیلئے بڑی اہم بنیاد سمجھی جاتی ہے لیکن اُس کے معاملہ میں اسے یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔

☆..... اس شخص کی بہن نے رحم کی اپیل دائر کر کے ان الفاظ میں اُس کی زندگی کی بھیک مانگی تھی کہ وہ میرا واحد زندہ بھائی ہے اسلئے اُس کی سزا معاف کر دی جائے۔

اتنی ساری ٹھوس وجوہات کے باوجود ضیاء الحق نے اُس شخص کو تختۂ دار پر چڑھانے سے گریز نہیں کیا۔ عام آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر وہ کون سے اسباب تھے جن کی بناء پر ضیاء الحق نے یہ انتہائی قدم اٹھایا۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ گرے ہوئے اور قابو میں آئے ہوئے دشمن کو معاف کر دینے کیلئے جس بہادری فراخدلی اور دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے ضیاء اس سے بالکل تہی دامن تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی شہادت ریکارڈ پر موجود ہے کہ وہ انتہائی بزدل اور ڈرپوک تھے۔ ایک بزدل انسان ہی موقع ملنے پر اپنے محسن کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے۔ ان کی جگہ کوئی بہادر اور عالی ظرف حکمران ہوتا تو بھٹو کی جان بچ سکتی تھی۔

پھانسی کے اسباب

بھٹو کی پھانسی کے اسباب و وجوہات پر غور کرتے وقت یہ حقیقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ فوجی حکام بہت عرصہ پہلے طے کر چکے تھے کہ بھٹو کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس سلسلہ میں سندھ کے مرحوم وزیر اعلیٰ جام صادق علی کا یہ انٹرویو ریکارڈ پر موجود ہے کہ مارشل لاء حکام نے جولائی 1977ء میں ہی اُن پر واضح کر دیا تھا کہ بھٹو کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اسلئے اگر وہ جان کی امان چاہتے ہیں تو بھٹو کے خلاف گواہی دیں مگر جام صادق جُل دے کر بیرون ملک چلے گئے اور ضیاء کے آخری سانس تک واپس وطن نہیں آئے۔

اس سلسلے کی دوسری شہادت راولپنڈی جیل کے سپیشل سیکورٹی سپرنٹنڈنٹ کرنل رفیع الدین نے اپنی کتاب "بھٹو کے آخری 323 دن" (ص 89 اشاعت دوم دسمبر 91ء) میں فراہم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

www.bhutto.org

اپیل کی منظوری کے باوجود بھٹو کو رہا نہ کیا جاتا

" 5 فروری 1979ء کو صبح دس بجے مجھے ایس ایم ایل اے کے ساتھ ذی ایم ایل اے کے دفتر بلایا گیا جہاں مجھے بتایا گیا کہ کل مورخہ 6 فروری 79ء کو شاید سپریم کورٹ بھٹو صاحب کی اپیل منظور کرنے کے بعد حکم جاری کرے کہ ان کو آزاد کر دیا جائے مگر ایسے حکم کے باوجود ان کو جیل سے باہر نہیں جانے دیا جائے گا۔ وہ مارشل لاء کے تحت کئی مقدمات میں مطلوب ہیں جن کے تحت اُن پر الگ مقدمہ چلایا جائے گا۔ مجھے صاف بتادیا گیا کہ اگر سپریم کورٹ بھٹو صاحب کیلئے آزادی کا حکم صادر کر دے کہ انہیں جیل سے نکال دیا جائے تب بھی ان کو جیل سے باہر ہرگز نہیں جانے دیا جائے گا۔ مجھے اس وقت صاف پتہ چل گیا تھا کہ حکام بھٹو صاحب کو کسی بھی حالت میں آزاد نہیں ہونے دیں گے اور اُنہیں ہر حالت میں پھانسی دیں گے صرف مارشل لاء جیسے نظام میں ایسا حکم صادر کیا جاسکتا ہے کہ اگر ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کسی مقدمہ کا فیصلہ سنائے تو اُس کو بھی نہ مانا جائے۔ مجھے دیگر ذرائع سے پتہ چلا کہ ایک خاص ملٹری کورٹ بھی مقرر کر دی گئی تھی کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ حسبِ منشاء نہ ہوا تو وہ کورٹ بھٹو صاحب کے مقدموں کی سماعت کرے گی"۔

اے کاش!

ضیاء الحق بھٹو کو موت کے گھاٹ اتارنے کیلئے کسی فوجی ٹریبونل یا سماعت کی سمری ملٹری کورٹ کا سہارا لے لیتے۔ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کو بیچ میں نہ لاتے تو ہماری عدلیہ کی نیک نامی پر دھبہ نہ لگتا۔ اعلیٰ عدالتوں کا تقدس پامال ہونے سے بچ جاتا عدلیہ کے ادارہ پر لوگوں کا جو یقین تھا اس کو ٹھیس نہ لگتی اور بھٹو کیس کے حوالہ سے اعلیٰ عدالتوں کے بارے میں جو طرح طرح کی باتیں سننے میں آئی ہیں ان کی گنجائش نہ رہتی۔

پھندا ایک تھا اور گردنیں دو

بھٹو کی سزائے موت کے سلسلہ میں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ مارشل لاء حکام کو بہت جلد احساس ہو گیا تھا کہ اقتدار سے محرومی کے باوجود بھٹو کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ضیاء نے بخوبی جان لیا تھا کہ بھٹو پر جیل کا دروازہ کھلا تو وہ ایران کے خمینی سے دس گنا زیادہ طاقت کے ساتھ میدان میں آئیں گے۔ بیچارہ ضیاء تو شاہِ ایران بھی نہیں تھا کہ بھٹو کی جلاوطنی کا خطرہ مول لیتا حالات کے اس دباؤ کو شدید کرنے میں ایک طرف بھٹو کی ہر دلعزیزی نے جرنیلوں کو خوفزدہ کیا دوسری طرف ایران کے انقلاب نے یہ احساس دلایا کہ اگر آیت اللہ خمینی 15 سال جلاوطن رہنے کے باوجود ہزاروں میل کے فاصلے سے صرف اپنی مقناطیسی شخصیت کے ذریعے شاہ ایران جیسے مضبوط اور طاقتور حکمران کا تختہ الٹ سکتے ہیں تو بھٹو کیا نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاء نے ابتداء میں بعض عرب سربراہوں کی اس پیشکش پر غور کرنے کا وعدہ کر لیا تھا کہ بھٹو کو کسی عرب ملک کی جیل میں ڈال دیا جائے لیکن خمینی کی واپسی اور ایران کے انقلاب کو دیکھ کر

www.bhutto.org

وہ اس وعدہ سے منحرف ہو گئے۔ دراصل بھٹو کی زندگی ضیاء کیلئے موت تھی۔ موت کا پھندا آئین کے آرٹیکل نمبر6 کی خلاف ورزی کی صورت میں موت کا خطرہ بن کر ضیاء کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اور یہ بات سر عام کہی جانے لگی تھی کہ پھندا ایک ہے اور گردنیں دو۔ دیکھئے کس کی گردن فٹ آتی ہے۔ ضیاء کے ہاتھ میں مارشل لاء کا ڈنڈا تھا۔ اس کے بل پر اس نے پھانسی کا پھندا اپنے سیاسی حریف کے گلے میں ڈال دیا اور انہیں بے بس و بے اختیار حریف کو ختم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

بھٹو کی فاش غلطیاں

اپنے عہد اقتدار خصوصاً آخری دنوں میں بھٹو سے بعض فاش غلطیاں سرزد ہوئیں۔ ان میں سرفہرست اعلیٰ اور با اثر طبقوں سے ان کا بگاڑ تھا۔ یہ با اثر طبقے بھٹو کی پھانسی پر اثر انداز ہو سکتے تھے مگر انہی کو بھٹو نے اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ ان میں بیوروکریٹ بھی تھے' جج بھی' سرمایہ دار بھی' سیاستدان بھی اور فوجی جرنیل بھی' جنہیں وہ "موٹے اور پلپلے جرنیل" کہہ کر ان کا منہ چڑایا کرتے تھے۔ اُن کے آخری دور میں ہر شعبۂ زندگی کے ممتاز افراد اُن سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ اُن کی پارٹی کے ارکان ان کے وفادار تھے لیکن پارٹی کا المیہ یہ تھا کہ وہ 67ء میں معرض وجود میں آئی اور بہت جلد یعنی 1971ء میں اقتدار کی منزل سے ہمکنار ہو گئی۔ اسلئے اس میں تجربہ کار اور منجھے ہوئے افراد کی کمی بری طرح کھٹکتی تھی۔ دوسری جماعتوں کے جو لوگ پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے ان کی اکثریت موقع پرستوں اور طالع آزماؤں پر مشتمل تھی جو پارٹی کے چیئرمین کو گرفتار بلا دیکھتے ہی ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ فوج کے پالیسی ساز اداروں میں متحرک و با اثر افراد بھٹو کے جانی دشمن بن گئے تھے جن حلقوں میں بھٹو کو مقبولیت حاصل تھی یعنی عوامی حلقے ان سے فوج کا کوئی سروکار نہیں تھا اور فوج کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

آخر میں بیوروکریسی نے بھٹو کو اپنے جال میں بری طرح پھنسا لیا تھا۔ وہ اس عالم میں بھی عوام کیلئے "انقلابی اصلاحات" کا دم بھرتے تھے۔ اس مقصد کیلئے اُنہوں نے تمام یا بیشتر اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کر لئے تھے۔ جو بیوروکریسی کیلئے کھلا چیلنج تھا۔ وزیروں' مشیروں کے غلط مشورے بھی انہیں لے ڈوبے۔ یہ وزیر اور مشیر ہی تھے جنہوں نے بھٹو سے دوبارہ الیکشن کرانے کی بجائے ریفرنڈم کا اعلان کرایا۔ وہ بھی بھٹو کی اپنی ذات کے مسئلہ پر صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی سیٹیں محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

نواب محمد احمد خان کے قتل کا مقدمہ بھٹو کے دور عروج میں ان کے خلاف درج ہوا۔ انہوں نے اس معاملہ کو سرد خانہ میں ڈال کر دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ شفیع الرحمٰن ٹریبونل نے اپنی رپورٹ میں صرف اس بات پر زور دیا تھا کہ حکومت کی ایک ایجنسی ایف ایس ایف اس میں ملوث ہے۔ اُس وقت مسعود محمود ایف ایس ایف کا ڈائریکٹر جنرل تھا اور احمد رضا قصوری کے ساتھ اس کی رنجش و عداوت کی وجہ موجود تھی۔ اگر اس رپورٹ کو داخل دفتر کرنے کی بجائے اس کی روشنی میں قدم اٹھایا جاتا تو مسعود محمود تک

www.bhutto.org

ہاتھ پہنچنا دشوار نہ ہوتا۔ بھٹو کے عہد اقتدار میں ہی ایئر مارشل اصغر خان کی ٹرین میں بم رکھا گیا جو لاہور ریلوے سٹیشن پر پھٹا۔ یہی وہ واقعہ تھا جس نے قصوری کیس میں ایف ایس ایف کے ملوث ہونے کا پردہ چاک کیا کیونکہ بم رکھتے ہوئے جو ملزم پکڑا گیا وہ ایف ایس ایف کا ملازم تھا اور اس نے بتایا تھا کہ بم رکھنے کی ہدایت "اوپر سے" دی گئی تھی۔ اس ملزم کو ریکارڈ پر لا کر چھوڑنا کسی لحاظ سے قرین دانش نہیں تھا۔ بھٹو کی معزولی پر کیس کو زندہ کیا گیا تو ریلوے پولیس نے اُس ملازم کو دھر لیا جس نے تفتیش کے دوران انکشاف کیا کہ نواب محمد احمد خان کے قتل میں بھی ایف ایس ایف ملوث تھی۔ اُسی کی نشاندہی پر دوسرے ملزم پکڑے گئے ان لوگوں کو قصوری سے یا اس کے باپ سے کیا عداوت تھی؟ ظاہر ہے اُن کے سربراہ مسعود محمود نے کوئی ہدایت دی ہوگی۔ اگر معاملہ کی پوری تحقیقات بروقت کر لی جاتی تو اصل ملزم بے نقاب ہو جاتا اور اُسے بھٹو کو ملوث کرنے کا موقع نہ ملتا۔

قانونی نکات

بعض قانونی نکات ایسے ہیں جو ہر سوچنے سمجھنے والے شخص کو پریشان کر دیتے ہیں مثال کے طور پر

ا۔ ہائیکورٹ میں بائیکاٹ کرنے کی بجائے کیس کو قانونی بنیادوں پر کیوں نہیں لڑا گیا؟

۲۔ مقدمہ کیلئے فوجداری قانون کے کسی ماہر وکیل کا انتخاب کیوں نہیں کیا گیا جیسا کہ استغاثہ نے ایم انور بار ایٹ لاء اور اعجاز حسین بٹالوی جیسے ماہر مستند وکلاء کی خدمات حاصل کیں۔ یحییٰ بختیار بلاشبہ ایک ماہر قانون دان تھے لیکن فوجداری معاملات میں اُن کی نظر اتنی زیادہ گہری نہیں تھی جیسا کہ ان کے حریف اس میدان میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ بوجوہ عدلیہ کے حلقوں میں مقبول نہیں تھے۔

3 اگر کیس کو سیاسی رنگ دینا ہی مقصود تھا تو بعد کے مراحل میں اس تسلسل کو جاری کیوں نہ رکھا گیا؟

4 بھٹو کی زبان سے سپریم کورٹ پر اعتماد کا اظہار کیوں کرایا گیا؟

5 سپریم کورٹ میں بھٹو کی اپیل گیارہ ماہ تک چلتی رہی اس دوران دو جج جو واضح طور پر صفائی کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے بنچ سے الگ ہو گئے۔ اگر وہ بنچ پر رہتے تو شاید فیصلہ میں عددی اکثریت کسی اور طرف ہوتی۔

6 نظر ثانی کی درخواست پر عدالت کی طرف سے کہا گیا "اس درخواست میں جو سوال اٹھائے گئے ہیں وہ اپیل کی سماعت کے دوران نہیں اٹھائے گئے تھے اسلئے اب اُنہیں اٹھانا بعد از وقت ہے"۔

مہینوں پر محیط سماعت کے دوران وکلائے صفائی نے سزا میں کمی کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا تو پھر نظر ثانی کی درخواست میں وہ اس مسئلہ کو کیسے اٹھا سکتے تھے۔

7 ہائیلوٹ کا فیصلہ جسٹس آفتاب حسین نے لکھا اور باقی چار ججوں نے اتفاق کیا لیکن جسٹس مشتاق حسین کو ہدف بنانے اور انہیں بدنام کرنے کے لئے اسے جسٹس مشتاق حسین کا فیصلہ ظاہر و مشتہر کیا گیا۔

www.bhutto.org

8۔۔۔ شروع میں محمد حیات جونیجو کو بھٹو کے وکلاء کی ٹیم میں شامل کیا گیا وہ فوجداری کے معروف وکیل تھے اور قانونی نکات پر عبور رکھتے تھے لیکن جب سیاسی فائدہ اٹھانے کیلئے یہ حکمت عملی وضع کی گئی کہ عدالت کو سیاسی پلیٹ فارم میں تبدیل کر دیا جائے اور یہ الزام لگایا جائے کہ یہ مقدمہ مارشل لاء اور عدلیہ کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے۔ اور بھٹو کو بے گناہ اس میں ملوث کیا گیا ہے جس کا مقصد 18/ اکتوبر 77ء کے انتخابات جیتنے کیلئے عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھا۔ تو جونیجو مقدمہ کو سیاسی رنگ دینے کے خلاف تھے وہ اس سے الگ ہو گئے۔ قتل کا مقدمہ لڑنا ایک آرٹ ہے اور بھٹو کے وکلاء اس آرٹ سے ناواقف نہیں تو بے بہرہ ضرور تھے۔ وہ سیاسی انداز میں مقدمہ لڑتے رہے جو کہ ایک سنگین غلطی تھی۔

سیاسی محاذ پر

سیاسی محاذ پر پیپلز پارٹی کی کمزوری اس طرح عیاں ہوئی کہ قیادت دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ فوجی حکمرانوں کے ساتھ بات چیت کے ذریعے بھٹو کی جان بچانے کے حق میں تھا جبکہ دوسرا گروپ محاذ آرائی پر یقین رکھتا تھا۔ اس عرصہ میں بھٹو کے قریب ترین ساتھیوں ممتاز علی بھٹو (کزن) اور عبدالحفیظ پیرزادہ کے علاوہ بہت سے لیڈر قید کر لے گئے۔ قائدین کے بغیر کارکنوں کی حیثیت بے ہنگم ہجوم کی سی رہ گئی۔ انہوں نے جلسوں، جلوسوں، توڑ پھوڑ اور منفی ہتھکنڈے اختیار کر کے اپنا آپ منوانا چاہا لیکن جب وسیع پیمانے پر اُن کی پکڑ دھکڑ اور قید و بند کے ساتھ ساتھ کوڑے مارنے اور بیدزنی کا سلسلہ شروع ہوا تو اُن کیلئے میدان سے فرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ایک مرحلہ پر خود سوزی کی تحریک واقعی عروج پر پہنچ گئی اور کارکن بھٹو کی رہائی کیلئے کٹ مرنے کو تیار ہو گئے تو قائدین نے انہیں یقین دلایا کہ وہ تحریک بند کر دیں تو قائدِ عوام کی رہائی جلد عمل میں آ سکتی ہے وہ اس بات پر یقین کر کے گھروں میں بیٹھ گئے۔

سحر طراز اور طلسماتی شخصیت کے مالک اور ذہین و فطین بھٹو کی تابانی اس وقت عروج پر پہنچ گئی تھی جب وہ ایک تنگ و تاریک اور متعفّن کال کوٹھڑی میں اپنی موت یا کسی معجزہ کے منتظر تھے، جو انہیں اس کوٹھڑی کی کرب ناک تنہائیوں سے نکال کر عوام کے سمندر میں لے جائے۔ حقیقتاً اگر بھٹو اس کوٹھڑی سے باہر آجانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ صرف پاکستان نہیں پورے جنوبی ایشیا کا سب سے درخشاں ستارہ بن جاتے، کیونکہ موت کی کوٹھڑی میں جو سبق حاصل کئے، وہاں جو تجربات ملے وہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں ملے تھے۔ نئے دکھوں، غموں اور تجربات و مشاہدات کی بدولت بھٹو کی بے پناہ سیاسی تجزیاتی صلاحیت آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی تھی۔ وہ پہلی بار اس قابل ہوئے تھے کہ فوجی انقلابوں کا دوٹوک تجزیہ کر سکیں۔ عوام کی جمہوری روح کو پہچان سکیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس خطے کے عوام کے دکھ درد کا ادراک کر سکیں۔ بھلا فوجی جنتا نئے تجربوں سے سرشار اور عوام کے پہلے سے زیادہ مقبول رہنما کو زندہ کیسے گوارہ کر سکتی تھی۔

www.bhutto.org

عبدالحفیظ پیرزادہ کا تجزیہ

بھٹو کے زوال اور پھانسی گھاٹ تک پہنچانے والے حالات و عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے سابق وفاقی وزیر اور بھٹو کے قریبی ساتھی عبدالحفیظ پیرزادہ نے ایک انٹرویو میں کہا۔

"جہاں تک بھٹو کیس کا تعلق ہے یہ بات سب پر واضح ہو چکی تھی کہ حکومت بھٹو کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتی اور انہیں پھانسی مل کر رہے گی۔ اب یہ کہنا کہ یہ نہیں ہوا وہ نہیں ہوا سراسر غلط ہے یحییٰ بختیار کو جو انگلینڈ کے زمانہ طالب علمی سے ان کے دوست تھے خود بھٹو نے اپنا وکیل مقرر کیا۔ انہوں نے اپنی عقل و فہم اور علم و تجربہ کے مطابق مقدمہ لڑا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے مقدمہ صحیح لڑا دوسروں کی رائے ہے کہ انہوں نے غلط مقدمہ لڑا۔ ایسی بات ہوتی تو بھٹو انہیں روک سکتے تھے اپنی وکالت سے ہٹا سکتے تھے ان کا مقدمہ سراسر سیاسی تھا۔ قانونی نہیں تھا۔ میں پارٹی کے اُس گروپ میں شامل تھا جو احتجاجی تحریک چلانے کی بجائے مذاکرات کے ذریعے ان کی جان بچانے پر یقین رکھتا تھا لیکن بیگم نصرت بھٹو نے ہمیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ فوجی جنتا انہیں ختم کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ ایسی صورت میں مثبت یا منفی کسی بھی اقدام کی کامیابی کے امکانات بالکل معدوم تھے"۔

راؤ عبدالرشید کی رائے

پنجاب کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس اور پیپلز پارٹی کے مقتدر رہنما راؤ عبدالرشید نے بھٹو کی پھانسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بیان میں کہا۔

"جو لوگ یحییٰ بختیار پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے کیس کو بڑا طول دے دیا' میرے خیال میں بالکل غلط ہے۔ کسی واقعہ کے بعد ہوشیار ہو جانا ہر آدمی یہ کر سکتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے جب یحییٰ بختیار کیس لڑ رہے تھے اس وقت ہر شخص کی یہی رائے تھی اور بھٹو بھی یہی چاہتے تھے کہ کیس میں جتنی دیر ہو سکے' کی جائے تاکہ حکومت پر بیرونی دباؤ اور اندرونی پریشر بڑھے اور حکومت کیلئے انہیں پھانسی پر لٹکانا محال ہو جائے۔ اب جب ایک واقعہ ہو گیا ہے تو ہر آدمی ہوشیار بنتا ہے اور رائے زنی کرتا ہے کہ یہ ہو گیا اور وہ ہو گیا۔ حالانکہ انہوں نے وہ کیس بڑی محنت اور نیک نیتی سے لڑا۔ بختیار کے علاوہ اور بھی تین چار وکیل تھے۔ وہ بھٹو صاحب سے ملتے تھے۔ بیگم صاحبہ سے روزانہ ملاقات کرتے تھے۔ بیگم صاحبہ کو جب بھی موقع ملتا وہ کارروائی سننے عدالت جاتی تھیں۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ یحییٰ بختیار کو ہدایات دے سکتے تھے کہ آپ کیس میں جلدی کریں۔ یا انہیں بدل دیتے۔ وہ بالکل مطمئن تھے اور بختیار طے کردہ پالیسی کے مطابق کیس لڑ رہے تھے۔ اصل میں تو مارشل لاء حکام تہیہ کئے بیٹھے تھے کہ بھٹو کو پھانسی دینی ہے۔ انہوں نے تو یہاں تک انتظام کر لیا تھا کہ اگر سپریم کورٹ سزائے موت کی توثیق نہیں کرتی تو پھر وہ ملٹری کورٹ سے سزا دلوا کے انہیں گولی مروا دیں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں پہلے سے ٹارگٹ دیا ہوا تھا کہ بھٹو کو کسی

www.bhutto.org

صورت میں زندہ نہیں چھوڑنا۔ "

بھٹو کا اصلی جرم

بعض تجزیہ نگاروں کی رائے میں جملہ عوامل و محرکات سے بڑھ کر بھٹو کا سرفہرست جرم اینی ری پراسسنگ پلانٹ کے معاملہ پر اُن کا ڈٹ جانا تھا جس کی وجہ سے امریکہ ان کا دشمن بن گیا۔ ایٹمی پلانٹ کا معاہدہ مارچ 76ء میں ہوا تھا اور ہنری کسنجر نے 10 راگست 76ء کو دورۂ لاہور کے دوران اُن پر واضح کر دیا تھا کہ اگر پلانٹ کے حصول سے باز نہ آئے تو " مسٹر پرائم منسٹر ہم تمہارا حشر کر دیں گے اور تمہیں ایک خوفناک مثال بنا دیں گے " ۔ قومی اتحاد کی تحریک اس واقعہ کے کئی مہینے بعد 1977ء کے انتخابات میں شکست کے بعد چلی تھی۔ اب یہ حقیقت عیاں ہو چکی ہے کہ اس تحریک کی پُشت پر کون تھا؟ اور یہ بھٹو کی معزولی کے ساتھ ہی نائب غلہ کیوں ہو گئی؟ بھٹو کے جرائم کی فہرست میں سب سے پہلے نمبر پر ایٹمی پلانٹ ہی آتا ہے جسے بظاہر اس فہرست میں شامل ہی نہیں کیا گیا۔ اگر بھٹو اپنے مؤقف پر نہ اڑتے تو ان کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن بھٹو نے دوستوں اور دشمنوں کی وارننگ کے باوجود پلانٹ سے دستبردار ہونا قبول نہیں کیا اور نتیجہ سامنے آگیا

اصل سوال یہ ہے کہ ایٹمی پلانٹ کے حوالہ سے امریکہ بھٹو کا جانی دشمن کیوں بنا؟

اصل بات یہ ہے کہ لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس کے بعد بھٹو نے عالمِ اسلام کو متحد کرنے کیلئے دن رات کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی اسلئے کہ اسلامی دنیا میں امریکہ اور مغربی طاقتوں کیلئے تیل پیدا کرنے والے ممالک بھی شامل تھے جو اپنے اتحاد سے مغرب کی صنعتی دنیا کو اس کے اسلحہ کے کارخانوں اور طیاروں کو اُس کی طاقت کے بھرم کو ایک دن میں تس نہس کر سکتے ہیں اور 1973ء کی جنگِ رمضان کے موقع پر شاہ فیصل شہید کی تجویز پر اُنہوں نے اس کا عملی مظاہرہ کر کے دکھا دیا تھا۔ دوسرے ان مسلم ممالک میں وہ عرب ریاستیں بھی شامل ہیں جو اسرائیل کو اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتی ہیں اور امریکہ کے نزدیک اُس کی سلامتی پہلے نمبر پر آتی ہے۔ اوپیک کے ساتھ ساتھ تیسری دنیا (انڈونیشیا' ملائیشیا' بنگلہ دیش وغیرہ) کے ممالک بھی اسلامی کانفرنس کے سرگرم رکن ہیں۔ یہ سب مل کر ترقی یافتہ مغرب کو ایک ہی ضرب میں مفلوج و ناکارہ بنا سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں مسلم دنیا کے کسی ملک کے پاس ایٹم بم کا ہونا اسرائیل کی تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ اسرائیل جس کی فوجی قوت کے افسانے زبان زدِ عام ہیں صرف ایک ایٹم بم کے بعد اپنا وجود بھی برقرار نہیں رکھ سکتا اور یہی وہ سنگین و خطرناک جرم ہے جسے امریکہ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ اسی واسطے امریکہ کے یہودی وزیر خارجہ پاکستان آکر بھٹو کو دھمکایا " ہم تمہارا حشر کر دیں گے "

ان حشر کرنے والوں کو اگر ضیاء الحق جیسے آلۂ کار ہاتھ نہ لگتے تو خود ان کا حشر ہو جاتا۔ اس بات کو عرب سربراہ بھی خوب جانتے تھے اسلئے بعض عرب سربراہ بھٹو کی جان بچانے کیلئے پروٹوکول کو بالائے طاق

www.bhutto.org

رکھ کر آگے بڑھے اس بات کی گواہی صرف مولوی مشتاق حسین ہی نہیں دیتے احمد رضا قصوری ہی نہیں دیتے اس کی گواہی تاریخ کا وہ نوشتہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ مسئلہ تھا جس کی بناء پر بھٹو نے موت کو گلے لگا لیا لیکن پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کے منصوبہ سے ہٹنا گوارہ نہیں کیا۔

سماجی بہبود کے سابق وفاقی وزیر جناب محمود علی کی یہ شہادت ریکارڈ پر موجود ہے کہ جن دنوں بھٹو کے خلاف تحریک زوروں پر تھی اور بھٹو نے 30 راپریل 77ء کو صدر کے علاقہ میں امریکی وزیر خارجہ کا خط لہراتے ہوئے کہا تھا کہ "سفید ہاتھی میری جان کے درپے ہے"۔ امریکہ نے انہی دنوں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب بھٹو کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ بھٹو اپنی کتاب "اگر مجھے قتل کیا گیا" میں لکھتے ہیں۔

"آج میں جن حالات سے گزر رہا ہوں۔ مجھے ان کا سامنا نہ کرنا پڑتا اگر اندرونی غدار دشمن سے سازباز نہ کر لیتے۔"

اس کا مطلب ہے کہ جس طاقت سے بھٹو ایٹمی پلانٹ لینے سے روکا تھا۔ اسے بالآخر بھٹو کا تختہ الٹنے کے لئے اندرونی غدار مل گئے۔ جنہیں ساتھ ملا کر اس طاقت نے پہلے بھٹو کو اقتدار سے محروم کیا اور آخر کار انہیں پھانسی کے تختے پر چڑھوا کر دم لیا۔ کیونکہ بھٹو زندہ رہتا تو اس طاقت کے لئے کھلا چیلنج بنا رہتا۔

بھٹو زندہ رہے گا

سقراط نے زہر کا جام پیا اور مر کر زندہ ہو گیا۔ حضرت مسیحؑ کیلئے صلیب تھی' وہ مصلوب ہو کر لازوال ہو گئے سیدنا امام حسینؓ نے کربلا میں شہادت پائی اور دین پناہ بن گئے۔ یہ بڑے لوگ تھے لیکن موت' غیر طبعی موت' عام آدمیوں کو بھی نہیں مار سکتی۔ تاریخ میں ایسے کتنے ہی نام ملتے ہیں جو نہ دیوتا تھے نہ پیغمبر اور نہ مقدس' بس عام آدمی تھے لیکن اپنی روشنی طبع اور سچائی کے ہاتھوں مارے گئے اور زندہ رہے۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جنہوں نے آخری لمحوں تک اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا۔ رحم کی بھیک نہیں مانگی' بظاہر انہیں جلا دیا گیا' زندہ دفن کر دیا گیا' سولی پر لٹکا دیا گیا لیکن وہ زندہ رہے۔ اُن کے نام جریدہ عالم پر اس طرح ثبت ہوئے کہ دوام ہو گئے۔

بھٹو مر گیا' اسے پھانسی دیدی گئی لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا

بھٹو نے ایک بار کہا تھا

"میں تاریخ کے ہاتھوں مرنے کی بجائے فوج کے ہاتھوں مرنے کو ترجیح دوں گا"۔

بھٹو کو تارا مسیح کے ہاتھوں موت نہیں آئی وہ زندہ ہے رکھے نے دعا کی تھی

"اے خدا تو نے زندگی اپنی مرضی کے مطابق دی تھی' اب موت میری خواہش کے مطابق عطا فرما! میں تجھ سے اور کچھ نہیں مانگتا' خداوندا"۔

اس دنیا میں جہاں انسان کو نہ پیدائش پر قدرت حاصل ہے نہ موت پر' کتنے انسان ہیں جنہیں ایسی

www.bhutto.org

دعا کرنے کی توفیق ملتی ہے اور کتنے خوش قسمت ہیں جنہیں اُن کی مرضی کی موت نصیب ہوتی ہے۔ وہ جس نے فوج کے ہاتھوں مرنا پسند کیا' جسے تاریخ کے ہاتھوں مرنا پسند نہیں تھا اسے اپنی مرضی کی موت مل گئی کیونکہ تاریخ اس کی موت کے پروانہ پر دستخط کرتی تو اس کا نام ونشان مٹ جاتا۔ تاریخ نے اسے زندہ رکھا ہے۔ اپنی حیات نو اور ابدی زندگی کیلئے اس نے خود تاریخ لکھی اور بنائی ہے اس نے آخری دم تک اقرارِ جرم نہ کیا۔ رحم کی اپیل نہیں کی' جب تک زندہ رہا' اسی بات پر مصر رہا کہ وہ بے گناہ ہے عدالتوں نے اسے مجرم گردانا یہاں تک اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک استعارے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ بھٹو دو دنیاؤں کے سنگم پر کھڑا ہے ایک دنیا جو اس کے ساتھ مر گئی دوسری دنیا وہ ہے جس نے اس کی موت سے جنم لیا ہے۔ یوں وہ ایک رزمیہ کا کردار بن گیا ہے ایک لیجنڈ بن گیا ہے ایک ایسی روایت بن گیا جسے کبھی موت نہیں آ سکتی۔ اسے بھلا دینا کسی کیلئے ممکن نہیں ہے۔ زندہ بھٹو کو مردہ نہ سمجھئے' وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا' مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا بھٹو کا مقدر ہے۔

ہم اس باب کو مولانا کوثر نیازی کے ان اشعار پر ختم کرتے ہیں جو انہوں نے بھٹو کی المناک موت کے موقع پر کہے تھے۔

راز دنیا پہ کھلا ہے یہ ترے قتل کے بعد
لوگ مر کے بھی رہا کرتے ہیں زندہ کیسے
کون کتنا ہے ترے قتل کی سازش میں شریک
اک نہ اک روز نقاب اٹھے گا ہر چہرے سے
شہر تو محوِ مناجات و دعا تھا پوچھو
حاکمِ شہر نے وہ رات گزاری کیسے؟
جیسے دراصل ہوا کرتے ہیں کوثر حالات
بسا اوقات نظر آتے نہیں ہیں ویسے

www.bhutto.org

کتابیات

یہ کتاب لکھتے وقت اردو' انگریزی کے بے شمار اخبارات ورسائل کی ورق گردانی کے علاوہ حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مترجم	اشاعت.	پبلشر
1-	پی ایل ڈی1978 (لاہور ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ادارہ پی ایل ڈی	1978	ادارہ پی ایل ڈی (ناصر روڈ) لا
2-	(پی ایل ڈی1979) سپریم کورٹ کا فیصلہ	ایضاً	1979	ایضاً
3-	اردو ترجمہ۔خون کا بدلہ خون	مترجم مجاہد لاہوری	1989	قومی پبلشرز لاہور
4-	بھٹو کیس مقدمہ اور سزا	وکٹوریہ شیفلڈ	1991	دی کلاسیک لاہور
	اردو ترجمہ	ستار طاہر		
6-	GENERALS IN POLITICS	ایئر مارشل اصغر خان	1984ء	
	اردو ترجمہ جرنیل سیاست		1985	قومی پبلشرز لاہور
7-	IF I AM ASSASSINATED?	زیڈ اے بھٹو		
	اردو ترجمہ اگر مجھے قتل کیا گیا"	مجاہد لاہوری		
8-	A JUDGE MAY SPEAK	جسٹس میر خدا بخش مری	1992ء	فیروز سنز دی مال لاہور
	اردو ترجمہ مارشل لاء آئین اور عدالتیں	نذیر حق		
9-	WAITING FOR ALLAH	کرسٹینا لیمب	1992	دی کلاسیک لاہور
		پرویز حمید		
10-	PAKISTAN DIVIDED	ڈاکٹر صفدر محمود	1985	فیروز سنز لاہور
	اردو ترجمہ۔۔۔پاکستان کیوں ٹوٹا؟			

www.bhutto.org

11-	The Betrays of Another Kind.	لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی	1989	
12-	"بھٹو ضیاء اور میں"	ایضاً	1991	جنگ پبلشرز لاہور
13-	The story of My Struggle.	میجر جنرل جمیل حسین ملک	1991	ایضاً
14-	سیاست اور فوج	بریگیڈیئر عبدالرحمن صدیقی	1992	
15-	بھٹو کے آخری 323 دن	کرنل رفیع الدین	1991 دوم	جنگ پبلشرز لاہور
16-	پاکستان' جرنیل اور سیاست	علی حسن (حیدر آباد)	1991	وین گارڈ بکس دی مال لاہور
17-	سپریم کورٹ میں بھٹو کا آخری بیان	ترجمہ ستار طاہر	1987	دی کلاسیک لاہور
18-	مارشل لاء کا وائٹ پیپر	مرتبہ ستار طاہر	1987	ایضاً
19-	زندہ بھٹو مردہ بھٹو	ایضاً	1986ء	ایضاً
20-	ذوالفقار علی بھٹو	زیڈ اے بھٹی	1990	کارواں پریس لاہور
21-	ذوالفقار علی بھٹو	مولانا کوثر نیازی	90 سوم	جنگ پبلشرز لاہور
22-	ذوالفقار علی بھٹو	سلمان تاثیر	1988	
23-	اور لائن کٹ گئی	مولانا کوثر نیازی	1989	جنگ پبلشرز لاہور
24-	اور الیکشن نہ ہو سکے	پروفیسر غفور احمد	1990	ایضاً
25-	پھر مارشل لاء آگیا	ایضاً	1990	ایضاً
26-	جنرل ضیاء کے گیارہ سال	اظہر سہیل		فیروز سنز لاہور
27-	سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک	اظہر سہیل	1988	جنگ پبلشرز لاہور
28-	جنرل محمد ضیاء الحق	ضیاء الاسلام انصاری	1990	ایضاً
29-	سیاستدان (انٹرویوز)	محمد آصف بھلی	1988	ماورا پبلشرز لاہور
30-	سیاسی لوگ (انٹرویوز)	علی سفیان آفاقی	1990	مقبول اکیڈمی لاہور
31-	جو میں نے دیکھا	منیر احمد منیر	1988	آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور
	(راؤ عبدالرشید سے تفصیلی انٹرویو)			
32-	بھٹو ایوان اقتدار سے تختہ دار تک	ادیب جاودانی	1991	سورن پبلی کیشنز لاہور
33-	بھٹو سے بے نظیر تک (سیاسی تجزیے)	عبداللہ ملک	1988	مکتبہ فکر و دانش مزنگ روڈ لاہور
34-	بھٹو سے بھٹو تک	نفیس صدیقی	1990	جنگ پبلشرز لاہور
35-	ذوالفقار علی بھٹو سے بے نظیر بھٹو تک	خالد یزدانی		ماورا پبلشرز 3 بہاولپور روڈ لاہور
36-	پاکستان' تاریخ و سیاست	ڈاکٹر صفدر محمود	1992ء	جنگ پبلشرز لاہور

www.bhutto.org